ناول

محسن علی

پیش کش:۔ ادارہء شعر و حکمت حیدرآباد

ناول

محسن علی

پیش کش:۔ ادارۂ شعر و حکمت حیدرآباد

بار اول: نومبر ۱۹۹۵ء
کمپوٹر کتابت: اردو کمپوٹر سنٹر، حیدرآباد
طباعت. ایس ایس گرافک

========== ○ ملنے کے پتے ○ ==========

مکتبہ شعر و حکمت

پنجہ گٹہ حیدرآباد - 6 - 3 - 659/2

اردو اکیڈیمی ۔ آندھرا پردیش

اے سی گارڈ ۔ حیدرآباد ۔

"فکشن اوکس"

محسن علی ۔ 8 - 2 - 603/12

Road No. 10. Banjara Hills

Hyderabad ✆ : 398589

قیمت ۔/۲۰۰ روپے

ایک چھوٹی سی بات

مجھے اپنے اس ناول کے تعلق سے کچھ کہنا نہیں ہے۔ سوائے اس ایک بات کے کہ اس ناول میں جتنے کردار ہیں ان میں صرف تین کردار ایسے ہیں جو فرضی یا خیالی نہیں ہیں اور جنکا ذکر ان کے اصلی ناموں کے ساتھ آیا ہے۔ (۱) مشہور انقلابی شاعر و رہنما مخدوم محی الدین۔ (۲) نظام کالج حیدرآباد کے معروف پروفیسر آغا حیدر حسن اور (۳) اسی کالج کے ایک ہنگامہ بدوش طالب علم اور دانشور رفیع۔ اور ان تینوں کرداروں کا ذکر اس ناول میں مختصر مختصر ملتا ہے۔

البتہ وہ سارے واقعات و حالات جو میری فکر اور میرے خیالات و تصورات کو ایک فکشن کی شکل میں ڈھالتے ہیں وہ میرے مزاج کے سرد و گرم سے ہو کر اسطرح گذرے ہیں۔ جیسے تپتی ریت سے آب رواں۔

یہ کسی چھوٹی یا بڑی شخصیت کی سوانح نہیں ہے۔ یہ ایک عام زندگی کی راہوں میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات ہیں، جن کو میں نے اس ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

....

محسن

انتساب

ہراس بڑے آدمی کے نام جو بڑا نظر نہیں آتا

All greats are not known,

میں پارک کے ایک کنج میں چھپا بیٹھا تھا اور میری نظریں پارک کے بیچ بنے ہوئے آسمان تک چلے جانے والے کلاک ٹاور پر تھیں ۔ دن کا وقت تھا، ۱۲ بجنے میں ابھی تین منٹ باقی تھے اور ٹاور کی اس بڑی گھڑی کی ٹِک ٹِک میرے دل کی دھڑکن بنی ہوئی تھی ۔ ٹھیک بارہ بجے تک مجھے وہاں ٹھہرے رہنا تھا اور جب تک کلاک کی بارہ ضربیں پوری طرح نہ گونج جائیں، میں اس کنج سے نکل نہیں سکتا تھا۔

لیکن بارھویں ضرب پر میں وہاں سے نکل کر بھاگ سکتا تھا۔

پتہ نہیں وہ تین منٹ میرے لیے کیوں جان لیوا بنے ہوئے تھے ۔ اس وقت کچھ اسقدر سیاہ اور گہرے بادل چھائے ہوئے تھے لگتا تھا گھڑی بھر میں ہر طرف اندھیرا چھا جائے گا ۔ میرے دل میں یکبارگی یہی خواہش جاگی کہ واقعی ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرا چھا جائے اور میں اس کنج میں تین منٹ کے لیے ہی سہی محفوظ ہو جاؤں اور گھڑی کی بارھویں ضرب پر بہ آسانی اس کنج سے نکل کر بھاگ سکوں اور راہ میں مجھے کوئی نہ دیکھے ۔

گھڑی سے نظر ہٹا کر میں اب اس راستے کی طرف دیکھنے لگا جدھر سے میرا دوست قیوم آنے والا تھا۔ آج وہ اپنے باپ کی تجوری سے ایک سو روپیہ چرا کر میرے پاس آنے والا تھا تا کہ آج شام کی ٹرین سے ہم بمبئی فرار ہو سکیں ۔ میرے اور قیوم کے ساتھ ہمارا تیسرا ساتھی جبار بھی تھا، جو ہمارے لیے بستر اور کچھ ضروری کپڑے لیکر اسٹیشن پر آنے والا تھا۔

کلاک کی بڑی سوئی ایک جست میں چھوٹی سوئی کو ہڑپ کرنے کو تھی میں بھی

کنج کی اذیت سے تنگ آکر باہر جست لگانے ہی والا تھا کہ کلاک کے گھنٹے بجنے لگے،
ایک ..... دو ..... تین ..... بارھویں ضرب کا انتظار کیے بنا میں کنج سے باہر نکل آیا
اس لیے بھی کہ کلاک کی بڑی سوئی چھوٹی سوئی پر سوار ہو چکی تھی۔ وہاں اب ایک ہی
سوئی نظر آرہی تھی، میں نے بھی تنہائی محسوس کی کیونکہ قیوم اپنے بتائے ہوئے وقت پر
پہونچ نہیں سکا تھا۔ اور اب مجھے تنہا ہی ایک بڑا مرحلہ طئے کرنا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ
سیاہ اور گہرے بادل جو کلاک ٹاور کے میناروں تک آچکے تھے یکلخت نیچے اور نیچے کی
طرف آجائیں اور مجھے اپنی ملائم و دبیز سیاہی میں پناہ دیدیں اور میں ان بادلوں کے
سائے میں چھپتے چھپاتے ان کی خوشگوار ٹھنڈک سے محظوظ ہوتے ہوئے کسی ایسی جگہ
پہونچ جاؤں جہاں میرے اعصاب پر چھایا ہوا خوف ایک پرسکون اور اطمینان بخش
احساس میں تبدیل ہو جائے۔ جی چاہتا تھا اگر بادل اور نیچے نہیں آسکتے تو کم از کم برس
طرح برس پڑیں اور میں اس موسلا دھار بارش میں تیزی سے پارک سے نکل کر سڑک
پر چلا جاؤں اور کسی سمت بھاگنے لگ جاؤں۔ پارک ایک ایسے مقام پر تھا جہاں چار
راستے ملتے تھے۔ میں ابھی طئے نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کس راستے جانا چاہیے کہ سامنے
میری نظر قیوم پر پڑ گئی۔ میری کچھ ہمت بندھی، ایک خوشی سی محسوس ہوئی، لگا یکلخت
جیسے سارے بادل چھٹ گئے ہیں اور چاروں طرف روشنی ہو گئی ہے۔ وہ روشنی بالکل
بجلی کی چمک جیسی تھی کہ گھڑی بھر کے لیے کوند کر غائب ہو گئی۔ کچھ فاصلے ہی سے
قیوم نے مجھے خبردار کر دیا "کسی جھاڑی کے پیچھے چھپ جا، تیرے دونوں بھائی تیری
تلاش میں ادھر آرہے ہیں۔"

میری آنکھوں میں یکلخت اندھیرا چھا گیا۔ قریب کوئی جھاڑی نظر نہیں آئی اور
بجائے کسی محفوظ جگہ کے، میری نظر ٹھیک میرے بھائی کی نظر سے ٹکرائی۔ میری نظر
چندھیا گئی، لگا زمیں تا فلک ایک بجلی کوند گئی ہے اور ہم سب اس پارک میں جل کر
بھسم ہو گئے ہیں۔ اس وقت تک میرے دونوں بازو میرے دونوں بھائیوں کی
مضبوط گرفت میں آچکے تھے۔ میری آنکھوں سے اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ دور دھندلکے
میں مجھے ایک سایہ بہت تیزی سے غائب ہوتا ہوا نظر آیا تھا، وہ شاید قیوم تھا۔

مجھے اِدھر پوری طرح حراست میں لے لیا گیا تھا، لیکن میرے قدم جیسے زمین

میں دھنس چکے تھے اور مجھے وہاں سے ہٹانے کے لیے ایک زبردست دھکے کی ضرورت تھی ۔ ٹھیک اس وقت " شڑاپ " سے ایک بید میری ٹانگوں پر پڑی اور میں سیدھے ہو کر تیز تیز چلنے لگا۔

راستے میں مجھے یہ خیال تو آیا ہی نہیں کہ گھر پہونچنے پر تین دن سے غائب رہنے کی کیا سزا ملنے والی ہے اور اس آوارگی کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے ۔ مجھے تو صرف یہی خیال ستا رہا تھا کہ اب قیوم اور جبار دونوں ہی بمبئی پہونچ جائیں گے اور وہاں جاکر وہ مجھے بھول جائیں گے اور ہو سکتا ہے کچھ دنوں بعد وہ دونوں مجھے فلموں کے رنگین اور دلکش پوسٹروں میں گھوڑوں پر بیٹھے، نقاب لگائے، ہاتھ میں پستول لیئے نظر آئیں گے اور ان کی گود میں ایک حسین وجوان ایکٹریس ان سے چپکی ہوئی بیٹھی ہوگی اور ساری دنیا میں ان کا نام روشن ہو جائے گا ۔ ان کی شہرت کا خیال آتے ہی میں جیسے بے حد کمزور ہو گیا، پیروں میں چلنے کی سکت باقی نہیں رہی اور جسم میں خون سرد ہونے لگا ۔ میری ٹانگوں پر ایک اور چابک پڑا ۔ خون میں پھر حرارت دوڑ گئی ۔ مجھے لگا گھوڑا تو میں ہوں اور قیوم ہیرو مجھ پر سوار ہے ۔ میں پھر پھرتی سے چلنے لگا یا، اس لیے بھی کہ جس جگہ اب ہمارا قافلہ پہونچ چکا تھا وہ ایک بڑا بازار تھا، وہاں ٹریفک زیادہ تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر شخص مجھے دیکھ رہا ہے اور دوسروں سے پوچھ رہا ہے ۔ " کیا جرم کیا ہے اس لڑکے نے ؟ اس عمر میں ایسے ایسے کام، کسی کی جیب کاٹ لی ہوگی ، یا دن دھاڑے کسی کے گھر میں گھس کر کچھ چرا لیا ہوگا ۔"

ہمیشہ کی طرح لوگ اصلیت سے ناواقف تھے ۔ میں اپنے جرم کا احساس کیے بنا اب ملنے والی سزا کا تصور کرنے لگا ۔ خوب پٹائی ہوگی ۔ پھر امی سینے سے لگا کر روئیں گی اور مجھے پھر اسکول کی منحوس، بدمزہ، مسلسل ہول پیدا کرنے والی فضا میں اور گھر کی ٹھنڈی بے رونق دیواروں میں محبوس کر دیا جائے گا ۔ میں ان راستوں پر چلتے چلتے تھک جاؤں گا جو کسی منزل تک نہیں لے جاتے ۔ اسکول سے نکل کر میں کسی دفتر کا کلرک بن جاؤں گا یا پھر کسی اسکول کا معمولی ٹیچر ۔ پھر اس کے بعد شاید میں خود گندے کپڑوں میں ملبوس اپنے ہی بچوں کو پڑھانے لگوں گا ۔ میں نے سوچا، بس یہی وہ لمحہ ہے جو مجھے ان راستوں سے، ان بھول بھلیوں سے فرار ہونے کا موقع دے سکتا ہے ۔

"فرار" کس قدر دلچسپ اور دلکش لفظ ہے، زندگی کی ساری مسرتیں، ساری خوشیاں، ساری لذتیں جیسے اس ایک لفظ سے عبارت ہیں"۔

"میں کس قدر ذہین ہوں"۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری نظر میرے دونوں بھائیوں پر پڑی جو بے حد مستعدی سے اپنا فرض انجام دے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ غصہ تھا اور کچھ اپنی فتحیابی کی تمکنت۔ لیکن مجھے دونوں پر ترس آگیا کہ یہ فرض شناس، شریف الطبع لڑکے اپنے مستقبل کی تاریکی سے کس قدر بے خبر ہیں۔ دونوں ہی اسکول میں اپنے اساتذہ کے مطیع و فرمانبردار طالب علم اور گھر میں اپنے والدین کے سعادت مند بیٹے سمجھے جاتے تھے۔ پھر مجھے اپنے بابا پر ترس آیا جو یقیناً اپنے سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے کے روشن مستقبل کو اپنے نیک اور سچے اصولوں کی نذر کر دیں گے۔ پھر مجھے اپنی امی پر ترس آیا جو اپنے بیٹے کے قصور کو نظرانداز کر کے اسے اپنے سینے سے لگائیں گی، روئیں گی اور کہیں گی۔ "تو راستے سے بھٹک گیا ہے۔ شریف بچے ایسا نہیں کرتے۔ یہ تو آوارہ اور لفنگے بچوں کے اطوار ہیں اور مجھے سمجھا بجھا کر دودھ بالائی کھلائیں گی اور میرے ہاتھوں میں پھر وہی میلی کچیلی کتابیں تھما دیں گی۔

اسکول کی کتابیں، جن کا تصور کرتے ہی، ایک ہوک سی دل میں اٹھتی تھی، اک درد جگر میں ہوتا تھا، وہ میلی کچیلی چھیتڑوں جیسی کتابیں، کتنی بے رنگ، بدوضع بالکل ہی خشک، بالکل ٹھس جن کو ہاتھ لگاؤ تو خون میں خنکی آجائے، کبھی نہ بدلنے والا ایک مستطیل! ۔ دنیا بھر کی ترقی کر لی انسان نے لیکن نہیں کر سکا تو ایک کتاب کی شکل نہیں بدل سکا۔ صدیوں پرانی کتاب بھی دیکھیے تو وہی ایک مستطیل ہاتھ میں آئے گا۔ کاش اس کی وضع قطع ہی بدلی ہوتی۔ کوئی کتاب مثلث نما ہوتی تو کوئی مخمس یا مسدس نما۔ لیکن جیسے صدیوں سے کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں میں کوئی نیا پن نہیں آیا اسی طرح ان کی شکل میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ کتاب کو تو بالکل ایک نوجوان اور شوخ لڑکی کی طرح حسین اور طرار ہونا چاہیے۔ دلکش خطوط، تر و تازہ چہرہ دلفریب لباس اور خیالات ایک دم رومان انگیز کاش ایسی کتابیں پڑھنے کو ملتیں۔ لیکن میرے ہاتھوں میں تھمائے ہوئے وہ بھدے مستطیل، جن کے رنگ اڑے اڑے، پھیکے پھیکے تھے۔ ان پر بے رونق سیاہیوں میں لکھے ہوئے بڑے بڑے حروف۔ "اردو

کی ساتویں ۔سائنس ، تاریخ و جغرافیہ ۔نفرت انگیز حساب ، زہر آلود انگلش ریڈر ۔ یہ کتابوں کے نام کیسے گھناؤنے کیڑوں کی شکل میں میری جلد کو چپکے ہوئے لگتے ، جیسے یہ کیڑے خون چوس رہے ہوں ۔ خصوصاً بدیسی زبان میں لکھا ہوا وہ نام English Reader تو تیز ڈنک والا بچھو نظر آتا ۔ ڈنک مارتے ہی زہر سارے بدن میں پھیل جائے ۔ مجھے اپنا سارا وجود ان گھناؤنے کیڑوں اور زہریلے بچھوؤں میں گھرا ہوا لگتا ۔یہی زہریلے کیڑے ہماری تہذیب کے نام ہیں ، جو ہم پر ٹھونس دی جاتی ہے" ۔اس قسم کے خیالات نے میری آنکھوں میں ایک روشنی پیدا کر دی ۔ان ہی خیالات کی روشنی میں میں اپنے گھر پہونچا ۔ گھر کی سیلن زدہ دیواروں میں مجھے بند کر دیا گیا ۔ پھر پڑوسیوں نے میری چیخیں سنیں اور میرے گھر آکر وہ سب مجھے اس طرح دیکھنے لگے ، جیسے ابھی ابھی جنگل سے ایک عجیب و غریب جانور کو لاکر پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے اور اس پنجرے میں دانہ پانی پہونچایا جارہا ہے ۔ پھر دو دن کے اندر اندر مجھے میرے گاؤں منتقل کر دیا گیا ۔ سزا کے طور پر ۔

باب (۲)

گاؤں میں مجھے گھومنے پھرنے کی پوری آزادی تھی ۔ گاؤں میں ان دِنوں موسم کی مسیں بھیگ رہی تھیں ۔ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ، نرم و نازک فصلیں سن بلوغ سے کچھ آگے نکل گئی تھیں ۔ ہوائیں کسی البیلی کی بہکی بہکی سانسیں لگتی تھیں ، گرمی پہونچانے والی ٹھنڈی ہوائیں ۔اسکول کی کلاس کی میلی گدلی ، حبس زدہ فضا سے اس طرح ان ٹھنڈی ہواؤں میں آجانے سے مجھے خیال آیا تھا شاید انقلاب اسی کو کہتے ہیں اور آزادی اسی کا نام ہے ۔

میں کودتا پھاندتا ہرے بھرے کھیتوں میں گھومنے لگا ۔ فصلیں اپنی اٹھتی جوانی سے لدی لدائی جھومتی تھیں ۔ گنگناتی تھیں ۔ کھیتوں کے قریب بہتے ہوئے شفاف جھرنوں کا پانی میرے جذبات کے سیل کی طرح اپنے کناروں کی شاداب ، شاداب نکہتوں سے چھیڑ کرتا بہتا رہتا ۔ جوار کی کچی کچی جوان فصل ، اس کی تر و تازہ پتیوں کی

تیز دھار، بدن کو کاٹتی ہوئی اور ہلکے ہلکے کھروچے لگاتی ہوئی۔ جوان فصل کے ترو تازہ خوشے جن کو مسلنے سے دودھ نکل آئے۔ یہ دودھ بھرے خوشے ابھی ابھی پتیوں سے ڈھک گئے ہیں، ابھی ابھی عریاں ہوگئے ہیں۔ یہ نیم عریانی!! میرے دل کی بے نام تمنائیں یکلخت ایسے ابھر آتیں جیسے کسی پودے کی تیز دھار والی پتیاں تن جائیں اور دل کے ہر گوشے کو آری کی طرح کاٹنے لگ جائیں۔ تمناؤں کی اس کچی فصل کو چھیڑتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں، بہکنے لگتیں، گنگنانے لگتیں تو میں بھی گنگنانے لگتا۔ گانے لگتا، اپنی آواز میں ایک انجانا سا درد گھول کر، اپنی تنہائی کا ایک لوچ ملا کر گانے لگتا۔ کتنی اونچی تان ہوتی تھی، دور کے پہاڑوں کی چوٹیوں کو پھلانگ کر دوسری طرف اتر جانے والی تان۔ سارے گاؤں کی فضاء میں ترنگ پیدا کر دینے والی تان، کبھی ٹوٹتی ہی نہیں تھی اور جب ٹوٹتی تو ایک گھر کی کچی دیواروں پر، جس میں ایک دوسری تان محبوس تھی۔ سمی۔ رسیلی، نشیلی اور جوان۔

سمی نے اپنے گھر کے پچھلے دروازے میں کھڑے ہوئے مجھے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ ایک دم سرخ تھی۔ ادھ کھلے دروازے کو تھامے ہوئے اس کے ہاتھ کی انگلیاں، جھانکتا ہوا چہرہ اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، بس اس کے وجود کے ان ہی تین حصوں سے میں واقف تھا۔ اس طرح اس کو مسکراتی ہوئی دیکھ کر میرے دل میں یہی خواہش جاگتی تھی کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لوں۔ ویسے میں نے اس کی سرخ انگلیوں کے ساتھ اس کی گوری گوری صحت مند متناسب باہیں دیکھ لی تھیں۔ اس کے چہرے کے ساتھ، ایک گدرایا ہوا بدن دیکھ لیا تھا اور اس طرح اپنے تصور میں میں نے ایک حسین و جمیل مجسمہ تراش لیا تھا۔

لیکن میں اس کو اس طرح مسکراتی ہوئی دیکھ کر ڈر جاتا تھا اس لیے کہ وہ مجھ سے بہت بڑی لگتی تھی۔ اس کے باپ سے ڈر لگتا تھا جو اپنے عربی گھوڑے پر سوار ہو کر روز طوفانی رفتار سے جنگلوں کی طرف چلا جایا کرتا تھا۔ اس کا باپ فارسٹ کنٹریکٹر تھا۔ اس کی دو تین بیویاں تھیں اور چھ سات بچے۔ کچھ ہی دن پہلے شہر سے آکر یہ گھرانہ گاؤں میں بس گیا تھا، میرے گھر سے قریب۔

ایک دن اسی طرح دروازے میں کھڑے ہوئے سمی نے مجھے اپنی طرف بلالیا

مجھے ایسا لگا تھا جیسے سارا ماحول یکلخت معمول سے زیادہ روشن ہو گیا ہے، ہر طرف تیز روشنی پھیل گئی ہے اور گاؤں کے سارے لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں، میری ہی طرف گھورے جا رہے ہیں۔

مجھے اشارہ کر کے سِمی دروازے کے پیچھے چھپ گئی۔ مجھے لگا ساری روشنی مدھم پڑ گئی ہے اور ہلکا سا اندھیرا چھا گیا ہے۔ اور اب مجھے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ میں نے سمی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دروازے کے اندر دو سیاہ چمک دار آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ میرے کانوں میں ایک رسیلی آواز آئی۔

"آج شام تمہاری بھابی اور بہنیں ہمارے ہاں ملنے آ رہی ہیں۔ تم ان کے ساتھ ضرور آنا۔ ہاں؟" میری زبان سے بجائے "ہاں" کے صرف "آں" نکلا۔ اور میں نے سر ہلا دیا۔ ادھر دروازہ بند ہو گیا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ اپنی گھبراہٹ میں میں، سمی کی بات کا ٹھیک سا جواب بھی نہ دے سکا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سمی مجھے اجڈ گنوار سمجھ رہی ہو گی، اسے کیا معلوم ہو گا کہ میں بھی ضلع کے اسکول میں --- پڑھتا ہوں اور اچھی اچھی فلمیں دیکھتا ہوں۔ فلمی ہیروؤں کی طرح عشق و محبت کر سکتا ہوں، نقاب لگا کر اس کے گھر میں کود سکتا ہوں اور کوئی مقابلے کو آئے تو اس کو اپنی تلوار کی انی پر اڑا سکتا ہوں۔ اور اپنی ہیروئین کو اس کے گھر سے اڑا لے جا سکتا ہوں .... لیکن اس کے سرخ و سفید چہرے سے پھوٹنے والی کرنوں میں گھرا ہوا میرا وجود مجھے بڑا حقیر سا لگا تھا۔ مجھے اس احساس نے جکڑ لیا تھا کہ عمر میں میں اس سے چھوٹا ہوں۔ میرے دل میں چھپی ہوئی فرار کی خواہش پھر ایک بار جاگی اور میرا دماغ سمی سے بے تعلق ہونے لگا۔ میں سینما کے پردے پر ہونے والے ہنگامہ خیز اور جوش دلانے والے واقعات کے تصور میں کھو گیا۔

قیوم مجھے برا نہیں لگتا تھا، اس سے مجھے بڑی قربت محسوس ہوتی تھی، جیسے وہ ایک نرم و ملائم دل کا لڑکا ہے، دوسروں کا ہمدرد۔ فوراً کسی خطرناک اقدام کی طرف لپکتا نہیں تھا۔ لگتا تھا وہ بڑا ہو گا تو ایک شریف انسان بنے گا۔ لیکن جبار سے مجھے ایک اجنبیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک خطرناک اور جیوٹ لڑکا معلوم ہوتا تھا، ہم دونوں سے زیادہ ہوشیار۔ اس عمر میں بھی وہ مجھے جہاندیدہ لگتا تھا۔ بڑی ہی ننگی باتیں

کرتا تھا۔ کہتا تھا۔ "سالے یہ فلمی ہیرو سب ڈھیلے ہوتے ہیں، ایک ہی لونڈیا کے پیچھے پڑجاتے ہیں اور اپنی جان کی بازی لگادیتے ہیں۔ اپن کو تو ایک ساتھ تین تین چار چار چھوکریاں اپنے گھر بلاکر سینے سے لپٹاتی ہیں اور مجھ سے زیادہ میرے ہاتھوں کو سنبھالی رہتی ہیں۔"

شرافت آدمی کو کس قدر ڈرپوک بنادیتی ہے۔ بچپن میں جو خوف ہمارے ذہنوں میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں وہ ہم کو شریف بنادیتے ہیں۔ مجھے اور قیوم کو جبار کی باتوں سے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا تھا، ہم اس سے ڈر جاتے تھے اور اس کی کسی زیادتی کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال نہیں سکتے تھے۔ جبار کی آنکھیں بڑی چمکدار تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں ہمیشہ بے چین، بے چین سی رہتی تھیں جیسے وہ ہمیشہ کوئی خطرہ محسوس کرتا ہو۔ اور اپنے گرد و پیش سے باخبر رہنا چاہتا ہو یا پھر مسلسل کسی نئی چیز کی تلاش میں رہتا ہو۔ وہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۵۔۱۶ سال کی ہوگی۔ پتہ نہیں سگریٹ پینے میں وہ کس قدر مشاق تھا، سگریٹ کا جلتا حصہ وہ اپنی زبان پر رکھ لیتا۔ اس کی ایسی ہی حرکتوں کی نقل کرنے میں، میں اور قیوم اپنی زبان جلالیتے۔ جبار کا خالی خولی سینہ ہمیشہ کچھ اس طرح تنا ہوا ہوتا جیسے اس کی ہمت و شجاعت اور اس کے باغیانہ جذبات، اس کی کمان جیسی تنی ہوئی ہڈیوں کو توڑ کر باہر نکل پڑنے کو بے تاب ہیں اور کسی طرح اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں مقید رہنے کو تیار نہیں ہیں۔

جبار نے مجھے اور قیوم کو باتوں باتوں میں بمبئی کی رنگین گلیوں کی سیر کرادی تھی۔ ہمارے جذبات میں ایک فحش اور لذیذ زندگی کا چسکا پیدا کر دیا تھا۔ آسودگی سے بھرپور ایک روشن مستقبل کے خواب کو وہ حقیقت بناکر پیش کر چکا تھا اور اس کی قیادت میں ہم دونوں نے اپنے ماحول کے اندھیروں سے بغاوت کردی تھی اور اس نے ان اندھیروں سے فرار ہونے کا ایک سیدھا صاف راستہ ہم کو بتادیا تھا۔

آج ِ سمی بھی مجھے کچھ ان ہی اندھیروں میں ملفوف ایک شکل نظر آئی تھی اور میں نے پھر نئی روشنیوں کی طرف اپنا رخ موڑ لیا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ قیوم کی شرافت اور اس کا محتاط مزاج اس کو ضرور فلم کا ہیرو بنادے گا اور جبار فلموں کا مشہور

وظالم ولن بن جائے گا۔ اس اندیشے نے یقین کی صورت اختیار کر لی تھی اور میں نے گاؤں سے فرار ہونے کی ٹھان لی تھی۔

ابھی شام کا جھٹپٹا تھا۔ میرے ذہن میں صرف بھیانک آوازیں گونج رہی تھیں گاؤں سے اسٹیشن جانے والی بس کے بدلتے ہوئے گیئر کی کرخت آواز، بس کے ہارن کی بھونڈی آواز۔ بس کے بڑے بڑے پہیوں سے رگڑ کھا کر نکلنے والی بریک کی آواز، جیسے کوئی چیخ اٹھا ہے، اس کے بعد دندناتی ہوئی ٹرین کی مسلسل گھڑگھڑاہٹ۔ آسمانی خلاؤں میں گونج جانے والی انجن کی کوک۔ میرے ذہن میں ایک ایسی تیز رفتار ٹرین دوڑ رہی تھی جیسے اسے کسی اسٹیشن پر رکنا نہیں ہے۔ میں ٹرین کی رفتار کم کر دینا چاہتا تھا، میں اس بے ہنگم شور کو خاموش کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے کوئی اور نہ سن سکے میں نے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس پی لیے۔ کچھ دیر بعد لگا دھیرے دھیرے ٹرین کہیں رک گئی ہے۔

"آنے والی رات کے اندھیرے میرے مستقبل کی روشنیوں کے ضامن ہیں یہی اندھیرے مجھے پناہ دیں گے۔ اور دور تک میرے سامنے روشنی کی ایک لکیر کھینچ دیں گے۔ میں اس لکیر پر چل پڑوں گا۔ اکیلا تنہا۔ روشنی کا مسافر! ہو سکتا ہے آج صرف آدھی رات تاریک رہے اور اس کے بعد اجالا ہی اجالا ہو جائے۔ آج میں بھی مہاتما بدھ کی طرح روشنی کے لیے، نِروان کے لئے ان اندھیروں میں کھو جاؤں گا۔ اور جب لوٹوں گا تو دنیا بھر کے لیے روشنی لے کر۔ سچائی لے کر۔ یہ اندھیرے کتنے مُشفق ہیں ان میں کتنا سکون ملتا ہے۔ دل کی دھڑکن کتنی لذیذ ہو جاتی ہے۔"

باب (۳)

میرے سامنے ایک چھوٹا سا چراغ جل رہا تھا۔ میں سِمی کے گھر میں تھا۔ سِمی میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اور مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کی جوانی ایک لچکدار جگمگاتی تلوار تھی۔ دو دھاری تلوار، جو چیز بھی اسے چھو جائے وہ دو حصوں میں کٹ کر رہ جائے۔ میری نظریں جھک گئیں۔ جی چاہتا تھا

اس تلوار سے میرا سر قلم ہو جائے۔ اب وہ مجھ سے کچھ اس قدر قریب ہو گئی اور کچھ ایسی آنکھوں سے دیکھا کہ مجھے صرف اتنا محسوس ہوا کہ کسی نے تیز تلوار کی انی میرے سینے پر رکھ دی ہو۔ ساتھ ہی سمی ہنس پڑی اور ادھر تلوار کی انی بنا کسی آواز کے میرے سینے کے اندر اتر گئی۔ سارے جسم میں مجھے ایک درد سا محسوس ہوا۔ میں اس کے مہکتے بازوؤں میں گر جانا چاہتا تھا۔ سمی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے قریب بٹھالیا۔ اس کے پاس ہی اس کی دو چھوٹی بہنیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ چراغ روشن تھا۔ ان کے سامنے چھوٹی چھوٹی کتابیں کھلی ہوئی تھیں۔ چراغ کی جھلملاتی لو میں مجھے کتابوں کے حروف متحرک نظر آئے، جیسے بہت سارے چیونٹے رینگ رہے ہوں۔ تینوں بہنیں مجھے ایک ساتھ گھور رہی تھیں۔ سمی نے مجھ سے کہا۔

" یہ عائشہ ہے، اسے ہم عشی کہتے ہیں۔ اور یہ چھوٹی شانی ہے، جس کا اصلی نام شہناز ہے۔ اس چراغ کی روشنی میں، میں نے ان تینوں کو بہت ہی غور سے دیکھا۔ مجھے سائنس کی کتاب میں پڑھی ہوئی ایک دقیق سی اصطلاح یاد آگئی۔ " انعکاسِ نور " مجھے محسوس ہو رہا تھا چراغ کی روشنی ان تینوں گلابی چہروں سے منعکس ہو کر میرے وجود کو روشن کر رہی تھی۔ ایسے روشن چہروں کو سامنے بٹھا کر سائنس پڑھائی جائے تو سائنس کے نظریات کس آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔ وہ تینوں مجھے اچھی لگیں۔ ان کے چہروں سے پھوٹتی ہوئی شفق کی لالی جیسی روشنی میں مجھے تین پھول نظر آئے۔ ایک ترو تازہ، جیسے ابھی ابھی کھلا ہے۔ ایک ادھ کھلا، جیسے کھلنے کے لئے انگڑائی لے رہا ہو اور ایک بند کلی جو پھول بننے کو بے تاب ہے، بس نسیم سحر کا ایک ہلکا سا جھونکا آئے اور وہ کلی مسکرا پڑے۔ جی چاہتا تھا ان تینوں پھولوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر مسل دوں ان تینوں سے ایک ساتھ لپٹ جاؤں تو وہ باری باری میرے کانوں میں کہہ دیں۔ " تم میرے ہو "۔ " تم میرے ہو "۔ " تم میرے ہو "۔ اور میں زور سے ہنس پڑوں تاکہ تینوں پھول جیسے چہرے شرم کے مارے زیادہ سرخ ہو جائیں۔ ہائے آوارگی کی راہ میں کتنے چراغ روشن ہوتے ہیں، جھلملاتے ہوئے، مسافروں کے منتظر، منزلوں کی طرف اشارے کرتے ہوئے۔

سمی نے مجھ سے پوچھ لیا۔ " کیوں جی، اسکول چھوڑ کر تم کیوں آگئے؟ "

اس کے سوال پر میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی بے چین آنکھوں میں شرارت کی ہلکی سی چمک نظر آئی۔ لیکن مجھے اس خیال نے ڈس لیا کہ سمی کو میرے اسکول کی آوارگی کا سارا حال معلوم ہو چکا ہے اور وہ مجھے چھیڑ رہی ہے۔ میں نے بات ٹالنے کی کوشش میں صرف اتنا جواب دیا کہ "میری صحت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے مجھے کچھ دنوں کے لئے گاؤں بھیج دیا گیا ہے۔" اس کی آنکھوں کی چمک یکبارگی غائب ہو گئی۔ اس نے کچھ ایسے لہجے میں بات کی جیسے وہ میری بات سن کر کچھ بے چین سی ہو گئی ہو۔ "اب تو بالکل اچھے ہو نا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں"

تب میری دلجوئی کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "ہم کو معلوم ہوا ہے تم بہت اچھا پڑھتے ہو اسکول بھر میں اول آتے ہو۔ تم تو پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ ہے نا؟"

اس کے اس سوال پر مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی راستے پر تنہا تنہا تیز بھاگے جا رہا تھا کہ اچانک دھائیں سے کسی چٹان سے ٹکرا کر اوندھے منہ گر گیا ہوں اور میں اب اٹھ نہیں پاتا ہوں۔ مجھے کچھ سوجھتا نہیں ہے۔ بڑی ہی نحیف آواز میں میں نے جواب دیا۔ "یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"مجھے سب کچھ معلوم ہے۔" یہ کہتے ہوئے سمی ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کے جواب میں مجھے بھی ایک پھیکی ہنسی ہنسنی پڑی۔ سمی نے پھر مجھے سہارا دیا۔ "تمہاری بہنیں کہتی ہیں تم بہت شریر ہو۔ ہے نا سچ؟" سمی کے لہجے کا بزرگانہ انداز مجھ میں احساس کمتری کو اکسا رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس طرح باتیں کرتے کرتے وہ مجھے ایک بچے کی طرح لپٹا لے گی اور کہے گی۔ "اچھے بچے ایسا نہیں کرتے۔"

میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا، لیکن سمی کی قربت کا احساس مجھے جکڑے ہوئے تھا۔ اس کی نظروں سے پھوٹتی ہوئی کرنیں میرے دماغ کے تاریک گوشوں کو روشن کر رہی تھیں۔ دل و دماغ میں ایک ہلکی سی امید بار بار بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔ اس بجلی کی چمک میں سمی کے سیاہ لباس سے جھانکتے ہوئے اس کے بدن کے روشن خطوط مجھ سے کہہ رہے تھے۔ "ہم کتنے تیکھے ہیں! ہم کتنے رسیلے ہیں! کتنے انوکھے ہیں! کبھی تم نے ایسا ہی خواب دیکھا تھا نا؟"

"عشی" ۔دوسرے کمرے سے آواز آئی۔

سمی نے فوراً عشی سے کہا۔"جاؤ، بڑی امی بلارہی ہیں۔" عشی اٹھ کر چلی گئی۔ عشی کے جاتے ہی میری نظر شانی پرپڑی اور ساتھ ہی سمی نے بھی شاید اسے بغور دیکھا۔شانی اپنی دونوں کہنیوں کے سہارے، اپنی ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلیوں میں سنبھالے ہم دونوں کو گھور کر دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں شاید کوئی خواب سا بن رہا تھا۔چراغ کی لو جھلملارہی تھی۔میں نے دیکھاکمرے کی دیوار پر ہمارے سائے بڑے ہی بھدے لگ رہے تھے اور سائے مسلسل حرکت کر رہے تھے۔میرا سر سمی کے سر کو لگا ہوا تھااور میرا بقیہ سایہ سمی کے سائے میں مدغم ہو چکا تھا۔لگتا تھا ایک ہی سائے کے دو سر ہیں۔ہم دونوں کے بھدے سایوں کے سامنے شانی کا سایہ بالکل مینڈک جیسا لگ رہا تھا۔جیسے پھدک کر وہ ہم پر آرہے گی۔

جب مجھے کوئی اور بات نہیں سوجھی تو میں نے ہنستے ہوئے سمی سے کہا۔"اپنے سایوں کو تو دیکھو کیسے بھدے لگ رہے ہیں۔" ہم تینوں نے پلٹ کر سایوں کی طرف دیکھاتو میرا سر سمی کے شانوں پر رکھا نظر آیا۔ہمارے سامنے شانی کا مینڈک جیسا سایہ بلی کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جیسے ہش کہتے ہی وہ بھاگ جائے گی۔سمی نے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگی۔ہم تینوں ہنسنے لگے۔سمی نے شانی کی کلائی پکڑ کر بڑے ہی پیار سے کہا۔

"شانی پیاری، تھوڑا پانی لادونا۔پیاس ہو رہی ہے۔" بالکل بلی کی طرح اچک کر شانی بھاگی اور اس کے جاتے ہی میں نے سمی کی طرف دیکھا۔سمی کی پیشانی اور اس کے ہونٹوں پر نمی پھوٹ پڑی۔میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔چراغ کی لو بھی شاید بھڑک اٹھی تھی کہ میں نے دیکھا سمی نے اس بھڑکتی لو کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔یکلخت سارے کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔مجھے کسی نے اندھیروں میں ڈھکیل دیا۔ایسا محسوس ہوا جیسے ریشم جیسے ملائم اندھیرے مجھے لپٹ رہے ہیں۔اندھیرے کی ملائم تہیں میرے بدن میں ایک انجانی لذت بھری حرارت پیدا کر رہی ہیں۔میرا وجود اندھیرے کی ہلکی ہلکی موجوں میں بہہ رہا ہے اور اس بہاؤ میں سمی نے مجھے جکڑ لیا ہے۔ میری سانسوں میں ایک مہک سی پیدا ہو گئی ہے۔کوئی نرم و گرم سینہ مجھے اپنے اندر

دھنسا رہا ہے اور میرے ہونٹوں پر دو نرم اور گرم دبیز و گداز ہونٹ رکھے ہیں۔ میرا سارا بدن صرف دل کی دھڑکن بن گیا ہے اور کوئی ایسا شور سنائی دے رہا ہے جیسے رات کی گہرائی میں طوفانی موجیں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں اور اس شور میں دنیا کی اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اور اگر کچھ سنائی دے رہا ہے تو ایک سرگوشی۔ " تم میرے ہو۔ تم میرے ہو۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا میرے ہونٹ پھر دو جوان ہونٹوں میں دھنس گئے۔ سمی نے میرے سارے وجود کو اپنی جوان باہوں میں سمیٹ کر اپنے گداز سینے میں محفوظ کر لیا تھا اور گھڑی بھر کے اندر میرا وجود بھی مجھے بھرپور لگا تھا۔ میرے بازو مضبوط ہو گئے اور سینہ تن گیا تھا اور میں سمی کے سارے بدن کو اپنے قابو میں کر چکا تھا۔ وہی ایک امید۔ ایک آرزو، جو کچھ دیر پہلے میرے دل و دماغ کے تاریک گوشوں کو روشن کر رہی تھی، ایک کڑکتی بجلی کی طرح میرے سارے بدن میں سما چکی تھی۔

کمرے میں چھائے اندھیرے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شانی کی آواز آئی "ارے، اندھیرا ہو گیا۔؟"

سمی نے اپنی سانسوں کی لگام کھینچ کر جواب دیا "چراغ بجھ گیا ہے، تم ذرا ورانڈے میں رکھا ہوا لیمپ لا لو۔"

شانی کے لیمپ لانے تک سمی نے اندھیرے کے دبیے ہوئے اعتماد کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر اپنے سینے سے لگا لیے اور کہا۔ "روز آیا کرو، تم تو کھیلنے کے بہانے آسکتے ہو۔" مجھے محسوس ہوا میرے خالی ہاتھوں میں پانی کے دو قطرے ٹپک پڑے ہیں اور یکبارگی اس اندھیرے میں چمک کر میرے ہاتھوں میں بند ہو گئے ہیں۔ اندھیرے کے موتی۔

شانی لیمپ سنبھالے دھیرے دھیرے آ رہی تھی۔ سمی نے اپنا چہرہ اندھیرے کی طرف پھیر لیا۔ دوسری طرف سے روشنی آ رہی تھی۔ شانی نے لیمپ لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ ہی عشی بھی کمرے میں آ گئی۔

اب سمی کا چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے بوقت نیم شب گلاب کھل گیا ہو۔ اس کے ہونٹ شبنم میں بھیگے بھیگے لگتے تھے۔ آنکھوں میں رات کا جاگا ہوا انداز آ چکا تھا۔ اس

کے بکھرے بال جوان راتوں کی مستیوں کا اظہار کر رہے تھے۔ جب شانی نے سمی کو پانی کا گلاس لاکر دیا تو اس نے سنبھل کر پانی پی لیا اور اپنی دونوں بہنوں کی طرف دیکھ کر اس طرح مسکرادی جیسے اب ان دونوں کی خواہش کے مطابق وہ مجھے اور ستانا چاہتی ہو۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تو تم پڑھ لکھ کر کیا بنو گے؟"

میں نے شانی اور عشی کے چہروں پر نظر ڈالی۔ دونوں کے چہروں پر میرا جواب سننے کا اشتیاق تھا۔ میرے دِل میں جو ایک موہوم سا خوف تھا وہ دور ہو چکا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ایک بہت بڑا آدمی بنوں گا۔"

وہ تینوں ہنس پڑیں۔ تب میں نے سمی سے پوچھا۔ "اور تم کیا کرو گی؟"

سمی نے گردن کے ایک جھٹکے سے اپنے بالوں کی دو تین لٹوں کو جو چہرے پر آگئی تھیں، پیچھے اچھالتے ہوئے کہا۔ "میں اب کہاں تمہاری طرح اسکول میں پڑھتی ہوں۔ ہم تو شہر کا اسکول چھوڑ کر یہاں گاؤں آگئے ہیں۔ یہاں کیا خاک پڑھیں گے ہم؟"

میں نے کہا۔ "پھر بھی تم پڑھ لکھ لو تو کیا بنو گی؟"

اس نے اپنی دونوں بہنوں کو ہنسنے پر مجبور کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو فلم ایکٹریس بنوں گی۔ دنیا کی مشہور ایکٹریس۔" یہ کہہ کر وہ اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ ہنسنے لگی۔ سمی کو ایکٹریس کے روپ میں دیکھ کر مجھے ایسا لگا، جیسے سمی مجھ سے بہت دور ہو گئی ہے اور سمی کو سوائے میرے سب جانتے ہیں۔ پہچانتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی، میری نظریں جھک گئیں۔ نظروں کے سامنے میرے دونوں ہاتھ کھل گئے۔ وہی ہاتھ جن میں ابھی کچھ دیر پہلے چمک دار موتی جیسے دو آنسو جذب ہو گئے تھے۔ اندھیرے کے موتی گم ہو گئے تھے۔ میرے دل میں ان موتیوں کی چمک دیکھنے کی خواہش شدت سے امڈ آئی۔ میں نے سمی کی آنکھوں کی طرف دیکھا، وہ اب بھی مسکرا رہی تھیں۔ میں نے عشی اور شانی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

"کل پھر آنا۔ ہم سب کھیلینگے۔"

یہ کھیل کتنا دلچسپ ہے، کتنا تکلیف دہ ہے۔ اس کھیل کا تو جیسے کوئی آغاز ہی نہیں اور آغاز ہے تو شاید کوئی انجام نہیں۔ کیسا تسلی بخش اور سکون پرور کھیل ہے۔ کیسا پرشور اور طوفان انگیز کھیل ہے۔ راحت جاں۔ سکون قلب۔ سوہان روح اور عذاب جاں۔

میں کل ضرور آؤں گا۔" میں بھی مسکرا رہا تھا۔

باب (۴)

سمی کے گھر سے لوٹنے کے بعد ابھی تک میں سویا نہیں ہوں۔ میں اپنے ذہن کے کسی ڈھکے چھپے گوشے میں ایک گدگدی سی محسوس کر رہا ہوں۔ ایک ہلکی ہلچل سی محسوس کر رہا ہوں۔ وہی گدگدی، وہی ہلچل دھیرے دھیرے میرے سینے کی طرف بڑھ رہی ہے جیسے میرے سینے میں آہستہ آہستہ نیا خون ابلنے لگا ہے۔ نیا خون بوند بوند ایک بہاؤ کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ سینے میں ایک سیلاب سا محسوس ہو رہا ہے۔ نئی امنگوں اور نئی آرزوؤں کا سیلاب۔ طوفان کی طرح سر اٹھاتے ہوئے جذبات کا سیلاب۔ شاید زندگی کا رخ اسی طرح بدلتا ہے۔ ایسے ہی سیلاب کی زد میں آکر زندگی کسی نئے راستے پر لگ جاتی ہے۔ آدھی رات سے گزر کر میں کچھ اور آگے بڑھ آیا ہوں۔ میری نظروں میں وہی اندھیرے ہیں جن میں میں مہاتما بدھ کی طرح روشنی کی تلاش میں نکل جانا چاہتا ہوں۔ ان اندھیروں میں میری نظر کے سامنے ایک دوسرا راستہ بن گیا ہے۔ دھندلا سا۔ مجھے کدھر جانا چاہیے، زندگی کے اندھیروں میں یہ دوراہا شاید ہر مسافر کو نظر آتا ہے۔ اور ہر ثابت قدم مسافر اپنے عزم و اعتماد کی روشنی میں اپنی راہ لے لیتا ہے۔ ٹھہرتا نہیں، اس لیے کہ سفر طویل ہے اور وقت کم۔ لیکن میں وقت کی کمی سے بے خبر ہوں۔ میری فطرت کو ہر پابندی سے بیر ہے۔ اس وقت بھی مجھے ہر راہ راہ فرار نظر آرہی ہے، سوائے اس راہ کے جس پر مجھے سمی کھڑی نظر آرہی ہے اور وہ مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ مسکرا مسکرا کر کہہ رہی ہے۔ ادھر آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے ہیں۔ ان ہواؤں میں سمی کا لباس اس طرح اڑ رہا ہے کہ اس کے بدن کی رنگت جھلمل جھلمل کرتی نظر آ رہی ہے۔ جیسے رات کے اندھیروں میں سحر کا اجالا جھانکنے لگا ہے۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ مجھے آج نیند نہیں آئے گی۔ دماغ میں ایک ہیجان سا ہے جس کو میں برداشت نہیں کر پا رہا ہوں۔ میری بے چینیوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں کہیں سکون کی تلاش کروں اور صبح ہونے سے پہلے کہیں محفوظ ہو جاؤں۔

بستر سے اٹھ کر میں نے ایک سگریٹ جلایا۔ رات بھر جاگتے رہنے کے بعد سگریٹ کا دھنواں کس قدر کڑوا کسیلا لگتا ہے۔ سگریٹ کے دھویں کا نیلگوں غبار میرے خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ میرے خیالات بھی دھویں کی طرح ہوا کی زد پر بہک رہے تھے۔ اس نیلگوں دھوئیں میں مجھے ایک کالی کلوٹی شکل نظر آئی، مسکراتی ہوئی۔ بلوغت کی معصومیت لیے ہوئے۔ پر سکون سی۔ سگریٹ کے دھویں سے اس شکل کا بڑا تعلق تھا۔

میں نے جب کم عمری ہی میں سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی تو پہلی بار میرے ہم عمر ساتھی وقار نے میری تنبیہ کی تھی "تم اس عمر میں سگریٹ پیتے ہو، شرم نہیں آتی تم کو؟ تمہارا سینہ جل جائے گا۔ ہونٹ کالے پڑ جائیں گے۔ گال پچک جائیں گے۔ وہ سب کچھ سن کر مجھے زور کی ہنسی آئی تھی۔ ایک ۱۵۔۱۶ سالہ لڑکا کالا کلوٹا جو اپنے ماں باپ کا بے حد مطیع و فرمانبردار بیٹا سمجھا جاتا تھا، مجھے نصیحت کر رہا تھا۔

وقار کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہر طرح محفوظ ہے۔ لیکن مجھے اس سے ایک ہمدردی سی محسوس ہوتی تھی۔ اسکول سے گھر تک کا راستہ وہ بنا ادھر ادھر دیکھے ایک معینہ وقت میں طئے کر لیتا تھا جیسے ساری زندگی کا راستہ وہ اسی طرح طئے کرے گا اور کبھی یہ نہیں دیکھے گا کہ اس راستے سے اور دوسری بہت ساری راہیں بھی پھوٹتی ہیں۔ زندگی کو نئی نئی منزلوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس سے اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ ا، ب سے ی، تک جو تختی ہے اس سے آگے کوئی علم نہیں ہے تو وہ زندگی بھر ان ہی حروف کو پڑھتا رہ جاتا۔

اس کی اس نصیحت آمیز گفتگو کو جو رٹے رٹائے الفاظ سے بھری ہوتی تھی، سن

کر مجھے ایک ناگوار احساس یہ ہوتا تھا کہ ایسی باتوں سے اور ان پر یقین کر لینے سے اس کا بڑھتا ہوا قد ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ اس ۱۵ سالہ لڑکے کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا تھا کہ وہ اسکول سے سیدھے گھر جا کر اپنی ماں کی گود میں لیٹ جائے گا اور ہمک ہمک کر کہے گا۔

"سنا ماں۔ ہمارے اسکول کے لڑکے بڑے بدمعاش ہیں۔ ٹیچروں کو گالیاں دیتے ہیں۔ اسکول سے بھاگ جاتے ہیں۔ باہر ہوٹلوں میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں، پان کھاتے ہیں، سگریٹ پیتے ہیں۔ راستے پر لڑ پڑتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں۔" لیکن یہ سب کچھ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ضرور ایک گھٹی ہوئی خواہش کی تلخی بھی شامل ہوتی ہوگی کہ کاش وہ خود بھی یہ سب کچھ کر سکے۔ اس کی اس گھٹن اور محرومی کا خیال مجھے یقین دلا دیتا کہ میں اس سے برتر ہوں۔ شاید اسی وجہ سے میں نے کبھی اس کی کسی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ بلکہ الٹے اس کو میں نے ہمیشہ ورغلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ سگریٹ پیئے، اسکول سے بھاگ آئے اور ہمارے ساتھ کھیلے۔ کیا رکھا ہے پڑھنے لکھنے میں۔؟ یہ پڑھنا لکھنا آگے چل کر آدمی کو غلام بنا دیتا ہے ڈرپوک اور بزدل بنا دیتا ہے۔ "چلو، ہوٹل میں جائیں گے۔ چائے پیئں گے۔ میٹنی شو دیکھیں گے۔ میں پیسے دوں گا۔" اس سے ایسی باتیں کرتے ہوئے مجھے بڑا فخر سا محسوس ہوتا تھا۔ لگتا تھا میں بھی آزاد خیالی میں، اور دلیری میں جبار سے کم نہیں ہوں۔

وقار میری ان باتوں کو بہت غور سے سنتا تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ دیر کے لئے ایک چمک سی پیدا ہو جاتی تھی۔ اور ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا خوف بھی طاری ہو جاتا تھا۔ اس خوف کی دھندلاہٹ میں اس کی آنکھوں کی چمک بجھ جاتی تھی۔ لیکن .... اس کے اس محتاط رویئے میں کبھی مجھے ایک کشش سی محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی مجھے یہی خیال آتا کہ اس کے ذہن میں وہ انتشار نہیں، جو میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ اس کے ذہن میں بالکل ایک خاموش گلی کا سا سکون ہے جو شاہراہ سے مڑ کر گھر کی طرف چلی جاتی ہے۔ میں اپنے آپ کو صرف شاہراہ کی روشنیوں میں، ہنگاموں میں مصروف و مشغول دیکھنا چاہتا تھا۔ وقار اس پرسکون گلی کی موڑ پر کھڑا شاہراہ کی چہل پہل کو دیکھتا اور چپکے سے اپنی گلی کی تاریکی میں کھو جاتا تھا۔

لیکن آج میں کتنے شدید ہیجان اور انتشار کی زد میں آچکا ہوں ۔ کل شام سمی کے ساتھ گزرے ہوئے طوفان انگیز لمحات کے تصور نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا ہے اب رات ختم ہونے کو آرہی ہے اور میں چاہتا ہوں گھڑی بھر کی نیند، گھڑی بھر کا سکون ۔

ایک ساتھ میں نے سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لیے ۔ دھوئیں کے غبار میں مجھے پھر وقار کا پر سکون چہرہ نظر آیا ۔ اس کے چہرے پر اب بھی ہلکی سی مسکراہٹ ہے لگتا ہے وہ بڑے ہی سہانے خواب دیکھ رہا ہو ۔ اس کے دماغ کی رگوں میں خون کی روانی بڑی ہی دھیمی دھیمی ہے ۔ پر سکون ہے ۔ وقار کا چہرہ اس وقت بہت ہی اچھا لگا ۔ معصوم، بھولا بھالا ۔ کالے گلاب کی طرح نکھرا ستھرا، شفاف ۔ میرے سامنے پھیلے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کے اس پار ان کثیف نیلاہٹوں کی دوسری طرف میں پہونچ جانا چاہتا تھا ۔ میں نے دھوئیں کی اونچی ہوتی ہوئی وہ دیوار ڈھادی، جو پتھر کی دیوار سے بھی زیادہ مضبوط لگتی تھی ۔ میں وقار کے بہت ہی قریب بیٹھا اسے جگا رہا تھا اس کا بازو ہلاتے ہوئے میں نے اس سے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا ۔

" وِقار ۔ "

وہ چونک گیا ۔ مجھے اپنے قریب پاکر یکلخت اٹھ بیٹھا ۔ مجھے غور سے دیکھنے لگا ۔ پھر اس کے ہونٹوں پر کچی نیند کی سی کسیلی مسکراہٹ آگئی ۔ اس نے اونگھتے لہجے میں پوچھا ۔

" کیا ہے ؟ اتنی صبح کیوں آگیا مرنے کو ؟ "

اس کی اس ہلکی سے خفگی پر مجھے ایک گدگدی سی محسوس ہوئی ۔ میں اس کا بازو پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لانا چاہتا تھا ۔ اس سے کہنا چاہتا تھا ۔ " تو کتنا ٹھس اور ٹھنڈا آدمی ہے ۔ باہر چل، کتنی خوشگوار ہوا ہے ۔ پھول اور کلیاں شبنم میں بھیگ گئی ہیں ۔ شبنم کے قطرے سورج کی کرنوں کا انتظار کر رہے ہیں کہ روشنی ملتے ہی موتی بن جائیں ..... " یہ ساری شاعری دھری کی دھری رہ گئی ۔ وہ پھر سونے کی کوشش کرنے لگا ۔ میں نے اس سے کہا ۔

" میں تجھے ایک بڑے ہی مزے کی بات بتانے آیا ہوں سنیے گا تو تیرا منہ کھلے کا

کھلارہ جائے گا۔ ذرا سن تو لے۔"

"تو ذرا اپنا منہ دھو کر آ۔ بعد میں تیری بات سنوں گا۔" اس نے کہا۔

میں نے ذرا چڑ کر کہا۔ "ارے بے خبر، اس عمر میں اس طرح سونے والے زندگی بھر سوتے رہتے ہیں۔ یہ تو وہ عمر ہے جب کہ دل والے رات رات بھر جاگ کر ان جوانیوں کا انتظار کرتے ہیں جو آفتاب کی طرح طلوع ہو کر ساری دنیا کو روشن کر دیتی ہیں۔ لعنت ہے تیری زندگی پر ......" میری بات پر وہ کچھ اور چڑ گیا اور سکڑ کر پھر سو گیا، جیسے اس کو مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔

میں وہ ساری باتیں کس سے کر سکتا تھا۔ مجھے کسی ایسے ساتھی کی قربت کی شدید ترین ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو میرے دل کا راز جان لے۔ میری بات سن لے اور جواب میں مجھے اس طرح دیکھے جیسے رشک و حسد سے اس کا سارا بدن جل رہا ہو۔ میری نظر کے سامنے وقار تھا، صرف وقار۔ اس کو میں جلانا چاہتا تھا جیسے اس سے مجھے کوئی انتقام لینا ہو۔ کس بات کا انتقام؟ یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں پہلی بار وقار کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں میں نے اس کو کیا لکھا۔ لیکن میرے، خط کا ہر لفظ مجھے صرف "سمی" لگتا تھا۔ جیسے میں نے اس ایک لفظ کو کئی بار لکھ کر اپنی ذہنی کیفیت کو پوری طرح اس خط میں منتقل کر دیا ہے۔ اور اب میرا ذہن بالکل ایک بے داغ کاغذ کی طرح صاف ہو گیا ہے۔ اس خط کو تہہ کر کے میں نے اپنی جیب میں محفوظ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی پوسٹ کر دوں گا۔

صبح ہو گئی۔ گھر کے سارے لوگ جاگ گئے۔ صبح کے اجالے اور گھر والوں کی نظروں سے مجھے ایک خوف سا ہونے لگا جیسے سب کے سب صرف میری طرف دیکھ رہے ہیں، جیسے کل رات میں نے کوئی چوری کی ہے اور چوری کا مال میری جیب میں رکھا ہوا ہے، بس ابھی ابھی مجھے آکر کوئی پکڑ لے گا اور جیب کی تلاشی شروع کر دے گا پھر تھوڑی ہی دیر میں گھر کا ہر فرد حیران حیران، ششدر ششدر سہمے سہمے کہے گا۔ "سمی۔ "سمی!!" دماغ خراب ہو گیا ہے اس بدمعاش کا۔ اب یہاں یہ گل کھلا رہا ہے۔ یہ تو سارے خاندان کی بدنامی کی بات ہے، نکالو اس کو یہاں سے۔" خط زمین پر پڑا جل رہا ہے، اور اس کی آگ میرے گھر سے سمی کے گھر تک پھیل گئی ہے ....

میں نے گھر سے قدم نکالا اور دوڑتا ہوا جا کر خط پوسٹ کر آیا۔

"ہا" کتنی گہری اور طویل سانس ہے جیسے کہیں رکا ہوا خون ایکدم میری نس نس میں بہنے لگ گیا ہے۔

کیسی تازگی ہے فضا میں۔! کیسی چستی ہے بدن میں! نظر کہیں ٹھہرائے نہیں ٹھہرتی۔ہنسی تو روکے نہیں رکتی۔یہ کیسی ترنگ ہے۔جی چاہتا ہے گاتا گنگناتا ہوا کھیتوں میں دور دور تک چلا جاؤں۔

باب (۵)

شام کا یہ روپ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔گدرائی جوانی کی تازگی و شادابی لیے ہوئے۔سجی سجی، سنوری سنوری، سولہ سنگھار کیے ہوئے۔رخسار کی شگفتگی سے پھوٹتی ہوئی سرخیاں۔پتلی پتلی تنی ہوئی بھوئیں۔بار بار جھپکتی آنکھوں میں سرخ ڈورے۔ان پر کاجل کی مہین سی لکیریں۔دمکتے ماتھے پر اڑتی ہوئی مسرور لٹیں۔سرسراتے ہوئے سرمئی ملبوس میں دبی دبی لالیاں، ان لالیوں میں پھنسی ہوئی بے تاب عریانیاں۔ظاہر ظاہر، غائب غائب، ماتھے پر جگ بھر کو روشن کرنے والا کم کم۔چال میں عشوہ۔خوں رنگ ہونٹوں پر مسکراہٹ، جیسے ساری دھرتی پر سرخ سرخ پھول کھل گئے ہیں۔پھولوں سے لدی اس دھرتی پر وہ شام آہستہ خرام میری طرف بڑھ رہی تھی۔گھڑی دو گھڑی میں میں اس کے لہراتے ہوئے آنچل کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لوں گا۔اس کو اپنی آغوش میں سمیٹ لوں گا۔وہ کسمسائیگی تو اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لوں گا۔زندگی کی کوئی شام مجھ سے اتنی قریب نہیں آئی تھی۔لگتا تھا وہ آج اپنی بہکی بہکی سانسوں میں مجھ پر وقت کا سب سے بڑا راز فاش کر دے گی۔میں اس راز کے افشا ہونے کا منتظر ایک کھیت کے کنارے کھڑا ہوا تھا جہاں نوجوان فصل اپنی مستی میں جھوم رہی تھی۔جوار کی تازہ فصل دور تک کھیت میں پھیلی لہلہاتی ہوئی، سرسراتی ہوئی، سرگوشیاں کرتی ہوئی۔میں نے ان سرگوشیوں پر غور کیا۔میرے کان کھڑے ہو گئے۔مجھے ایک ہلکا خوف سا محسوس ہوا، جیسے وہیں کہیں مجھ سے قریب کوئی کسی

سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کوئی کراہ رہا ہے۔ میں نے اس طرف نظر ڈالی۔ پودوں میں کچھ ایسی حرکت ہو رہی تھی جیسے انہیں دھیرے دھیرے کوئی ہلا رہا ہے۔

دبے پاؤں میں اس طرف بڑھنے لگا۔ کھڑی فصل کو چیرتا ہوا جب میں کھیت کے اندر تھوڑی دور پہونچا تو پہلے مجھے ایک مرد کا سر نظر آیا۔ اس کے ساتھ اس کی ننگی پیٹھ۔ پھر ننگا متحرک بدن۔ کھیت کی مٹی میں دھنسے ہوئے اس کے گھٹنے۔ ان گھٹنوں میں پھنسا ہوا ایک جوان عورت کا عریاں بدن، آہستہ آہستہ کھیت کی مٹی میں دھنستا ہوا۔ ایڑیاں رگڑتا ہوا۔ مجھ پر ایک انجانا سا خوف طاری ہو گیا۔ شام کی ساری سرخیاں کچھ ملگجی سی سیاہیوں میں بدل گئیں۔ تیزی سے میں کھیت سے باہر نکل جانا چاہتا تھا لیکن میرے پاؤں کھیت کی کھردری مٹی میں پھنسنے لگے تھے۔ وہ رنگین شام جو مجھ سے بہت قریب آچکی تھی اب مجھ سے دور بھاگے جا رہی تھی۔ دور اڑی جا رہی تھی اور اندھیرے چھا رہے تھے۔ میں نے اس مرد کو پہچان لیا تھا۔ وہ ٹھاکر تھا جس کو دیکھ کر پہلا خیال یہی آتا تھا کہ اس شخص کا رواں رواں ظالم ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ کر میری طرح شاید ہر شخص ایک احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اس کے گھٹیلے بدن کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ بدن کبھی کمزور نہیں ہو گا۔ جیسے وہ ایک پتھر کی طرح بے موت جیئے گا۔ اس کے کالے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی ہلکی مسکراہٹ کچھ اتنی پھیلی لگتی تھی جیسے آس پاس کی ہر شئے کو اپنے اثر میں لیے ہوئے ہو۔ اس مسکراہٹ کی زد میں آنے والا ہر آدمی اپنے آپ کو اس طرح مجبور پاتا جیسے مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی مکھی۔ اس کا قد زیادہ اونچا نہیں تھا چکلا سینہ۔ چوڑے شانے، مضبوط پاؤں جو اس کے بھاری بدن سے تہرہ چوہرہ وزن آسانی سے سنبھال کر مردانہ چال چل سکیں۔ اس کے بازو کسی پکی دھات کے بنے ہوئے لگتے تھے۔ آپس میں ٹکرا جائیں تو آواز پیدا ہو۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ اس کی سانسوں سے بوجھل مستی ٹپکتی تھی۔ جیسے ابلتا ہوا خون اس کے بدن میں بہت تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ جیسے کسی کیمیا گر کے کڑھاؤ میں پگھلا ہوا گرم گرم لوہا اس نے ٹانچ لیا ہو۔ اور وہ پگھلا ہوا لوہا اس کے بدن میں جوانی بن کر سما گیا ہو اور بیتابی سے باہر نکل آنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔

وہ گاؤں کے ایک ممتاز اور متمول شخص کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کے گھرانے سے

ہمارے گھرانے کے خاص تعلقات تھے اور کسی زمانے میں گاؤں کے اسکول میں، میں اس کے ساتھ ایک ہی کلاس میں پڑھ چکا تھا۔ گو کہ وہ مجھ سے چار چھے سال بڑا تھا۔ عمر میں اس سے کافی چھوٹے لڑکوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کلاسوں میں بیٹھ کر پڑھنے میں وہ بجائے کسی عار کے ایک فخر سا محسوس کرتا تھا کہ علم اس کو زیر نہیں کر سکتا، اس نے علم کو زیر کر دیا ہے۔ اور علم اس کے علمِ بغاوت کے سامنے سرنگوں ہو گیا ہے۔

ایک خوشحال گھرانے میں، اکلوتی اولاد کو ملنے والی نعمتوں نے، اس میں ایک خودسری کا انداز اس کے لڑکپن ہی میں پیدا کر دیا تھا۔ گاؤں کے اسکول میں وہ ساتویں کلاس تک اپنے متمول باپ کے اثر و رسوخ کے ذریعہ پہنچ چکا تھا اور اس کے بعد ضلع کے اسکول میں بھی ایک دو سال تک اسی شان بے نیازی نے اسے سرخرو رکھا تھا، لیکن ضلع کے اسکول میں بزدلوں کا سا ماحول اس کی آزادانہ روش سے اور اس کے سرفروشی کے جذبے سے خائف ہو گیا۔ وہ زنجیریں توڑ کر بھاگ جانے والے وحشی کی طرح واپس اپنے جنگل کی طرف لوٹ گیا تھا۔

آج ابھی میں نے اس کو اس کے وحشی روپ میں دیکھا تھا۔ مجھ پر ایک خوف طاری ہو چکا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ مجھے دیکھ لے تو شاید طیش میں آکر میری گردن ناپ لے۔ تیزی سے میں کھیت سے باہر نکل آیا اور جلدی جلدی قدم بڑھانے لگا۔ مجھے ٹھاکر کی وہ دودھاری ہنسی یاد آگئی جو اس بار میرے گاؤں لوٹ آنے پر اس کے ہونٹوں پر چمک اٹھی تھی اور اس نے کہا تھا۔

"آگئے بچو، شاباش۔ ارے مرد بھی کہیں پڑھائی کرتے ہیں۔ چلو تم کو یہاں کے سارے کرتب سکھا دوں گا۔" اس کی بات پر مجھے بھی ہاں کہنا پڑا تھا۔ اور اس نے خوش ہو کر میرے شانے پر اپنا فولادی پنجہ گاڑ دیا تھا۔ کھیت کی مینڈھ پر چلتے ہوئے میرے پیروں میں مجھے کوئی قوت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مینڈھ کی کھردری، اور چکنی مٹی پر میرے پاؤں بار بار پھسل رہے تھے۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ شام کے اندھیروں سے زیادہ میری آنکھوں میں چھائے ہوئے اندھیرے گھرے ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک میرے قریب پودوں میں ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوئی جیسے کوئی جنگلی جانور بھاگ رہا ہو اور وہ گھڑی بھر میں جست لگا کر مجھے دبوچ لے گا۔ میں نے بھاگنے

کے لئے قدم بڑھائے تھے کہ دھم سے ٹھاکر میرے سامنے کود پڑا۔ میں نے ہراس زدہ لہجے میں کہا۔" ارے ٹھاکر!"

ٹھاکر پہلے تو ہنس پڑا پھر اپنی بھاری سانسوں میں کہنے لگا۔" کیوں بے بنتا ہے ایں؟۔ ٹھیک ہے لا سگریٹ پلا۔"

میں نے جواب دیا۔" سگریٹ پینا میں نے چھوڑ دیا ہے۔"

" کیوں پٹائی سے ڈر گیا، ایں؟ ہت تیری نامردکی۔ دیکھ جھوٹ نہ بول نکال سگریٹ۔ دیکھ اگر مرد بن کر عورت کا مزہ اٹھانا ہے تو سگریٹ پینا مت چھوڑ۔ مرد کو وہی کام کرنا چاہیے جس سے سالی عورت چڑتی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے دو مُڑے تڑے سگریٹ نکالے اور دونوں سگریٹ، اپنے ہی ہونٹوں میں دبا کر ایک ساتھ جلا لیے، ایک جلا ہوا سگریٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

" لے پی۔ یہ ذرا اِشٹرانگ ہے"۔ پھر اپنے سگریٹ کا ایک زوردار کش لگا کر ایک دم بہت سارا دھواں چھوڑ دیا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔" قسم ہے اپنی۔ مرد کا سگریٹ پینا عورت کو بہت بھاتا ہے، اس لئے وہ بار بار کہتی ہے، سگریٹ نہ پیو۔ دیکھ، کوئی لونڈیا قابو میں نہ آئے تو سگریٹ جلا لو۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا، تو وہ تیزی سے تمہارے پاس آجائے گی۔ پھر دارو پیو، ایک بوتل کے بعد دوسری۔ وہ گھبرا کر تمہارے سینے سے لگ جائے گی پھر اس کے سامنے کسی دوسری لونڈیا کا ہاتھ پکڑ لو تو یہ لونڈیا تمہارے پاؤں پر گر جائے گی، تمہارے سامنے بِچھ جائے گی"۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

" مرد کو دنیا میں صرف ایک کام کرنا چاہیے، اور وہ ہے عورت کا شکار ۔۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا پڑا اور کھیت کے اس حِصے پر نظر ڈالی جہاں سے وہ نکل آیا تھا اور بڑے ہی بے باکانہ انداز سے کہنے لگا۔

" ابھی ابھی وہاں میں نے ایک جوان شیرنی کو زیر کر دیا۔ بڑی ہی کسی کسائی لگتی تھی، ایسی بھپری ہوئی تھی سالی قابو میں آتی ہی نہیں تھی۔ مگر اپن بھی تو شیر سے کم نہیں۔ سالی نے میرے بازو میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ یہ دیکھ۔" اس نے اپنے بھرے بھرے بازو سے آستین ہٹائی۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ وہاں

دانت کے نشان تھے اور تھوڑا سا خون نکل کر جم گیا تھا۔

تب اس نے کہا۔ "بول کیا ارادہ ہے۔ وہ وار کیا ہے سالی پر کہ ابھی تک وہیں مٹی میں پڑی تڑپ رہی ہوگی۔ بول، ہے ہمت تو چل پڑ۔ یہ خون ایک بار منہ کو لگ جائے تو عمر بھر نہیں چھوٹتا۔"

اس کی اس بات پر میں سر سے پیر تک کانپ گیا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سارے بدن کے اندر کسی نے برف پگھلا دی ہو۔ میرے سوکھے ہونٹوں پر ایک بدرنگ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "آج نہیں پھر کبھی۔"

وہ ہنس پڑا۔ "اچھا، شیر کا جھوٹا شیر نہیں کھاتا؟ شاباش۔ چلو چلتے ہیں۔" اس نے میری پیٹھ ٹھونکی اور ساتھ چلنے لگا۔ جب ہم نے کھیت پار کر لیا تو ٹھاکر نے مجھ سے پوچھا۔ "کیوں گھر پہونچنے کی جلدی ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ چلو اب اندھیرا ہو رہا ہے۔"

میری بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا اور پھدک پھدک کر میرے بدن میں گدگدی کرنے لگا۔ مجھے بھی ہنسی آنے لگی۔ مجھے ہنستا دیکھ کر وہ اور خوش ہو گیا۔ اور میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولا۔ "اندھیرے سے ڈرتا ہے، ایں؟ ارے ایسے اندھیروں سے ڈرے گا تو وہ جگ مگ کرتی ہوئی لونڈیوں کو کہاں چھپائے گا جو تیری گود میں دبک کر بیٹھینگیں۔ چل اب تھوڑی دیر میں چاند نکل آئے گا۔ اس کنویں تک چل۔ میں ذرا نہا لوں۔"

اگلے کھیت میں ایک بڑا کنواں تھا۔ تیز تیز چلتے ہوئے ہم اس کنویں تک پہونچ گئے، اب اندھیرا کافی گہرا ہو چلا تھا اور ہوائیں بھی سرد ہو چکی تھیں۔ کنویں کے پاس پہونچ کر اس نے اپنی قمیض نکالی اور ایک طرف پھینک دی۔ پھر اوپر سے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ کنویں کے اندر پانی کا زوردار چھپاکا ہوا۔ جیسے کسی نے ایک بہت بڑا پتھر پانی میں دھکیل دیا ہو۔ گھڑی بھر میں پانی میں ڈوب کر وہ سطح پر آ گیا۔ اور اندر ہی سے چیخ کر کہنے لگا۔ "چل آجا تیرتے ہوئے رانوں پر کچھ ایسے گرم تھپیڑے لگ رہے ہیں جیسے اپنی رانوں میں کسی کی جوان رانیں آگئی ہیں۔ پانی بھی سالا گرم ہے۔ مزہ آرہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں تم جلدی سے نہالو، گھر چلیں گے۔"

میری بات ان سنی کر کے اس نے پانی میں تیرتے ہوئے ایک زور دار تان لگائی اور گانے لگا۔ کنویں کی دیواروں سے ٹکرا کر اس کی بھاری آواز ایک گونج پیدا کر رہی تھی۔ وہ گا رہا تھا۔ "چھوٹے سے بلما مورے آنگنا میں گلی کھیلیں"۔

تھوڑی ہی دیر میں ٹھاکر نہا کر کنویں سے باہر نکل آیا۔ اس کا بھیگا بدن اندھیرے میں کالے پتھر میں ترشے ہوئے بت جیسا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس وقت میرے جی میں ایک خواہش جاگی تھی کہ اس کے سامنے سرنگوں ہو کر اس سے پاپ کرنے کی شکتی مانگ لوں۔ اپنے سینے میں اٹھنے والے نوخیز جذبات سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا گر سیکھ لوں۔ اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے زمانے اور ماحول کے خوف سے آزاد ہونے کے لیے اس سے اشیرواد لے لوں۔ وہ میرے سامنے کھڑا سردی کے مارے دانت کٹر کٹرا رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ اپنے گیلے ہاتھوں ہی سے اس نے اپنے جسم سے پانی پونچا۔ پھر قمیض پہن کر اپنی گیلی تہبند کھول دی اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

" شرم آتی ہے تو پلٹ جا۔" لیکن میں جوں کا توں کھڑا رہا شاید یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مرد کو مرد سے کیا شرم؟ ٹھاکر نے اسی طرح کھڑے ہوئے اپنی گیلی تہمد سے پانی نچوڑا اور اسے جھٹک کر باندھ لیا اور مطمئن ہو گیا جیسے اونی کپڑے پہن کر وہ سردی سے محفوظ ہو گیا ہو۔

ہم دونوں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے کہا "کل ندی کی طرف آجا۔ خوب تیریں گے۔ تجھے ایک چھوٹی سی، چکنی سی مچھلی پکڑ کر دوں گا۔ سالی روز وہاں کپڑے دھونے آتی ہے۔ اسے پکڑ کر سنتروں کے باغ میں چلا جا۔ چھوڑنا مت سالی کو۔ اتنی چکنی ہے کہ ہاتھوں میں سنبھلتی ہی نہیں۔"

میں نے بڑی ہی بے جان آواز میں کہا۔ "اچھا"۔ لیکن مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دینے لگی۔ ٹھاکر کچھ اور آگے چل کر کہنے لگا۔ "اچھا کل صبح ندی پر ملنا۔" یہ کہہ کر وہ ایک تاریک گلی میں مڑ گیا۔

باب (۶)

میرے قدم اب گھر کی طرف تیز تیز بڑھ رہے تھے۔اور میں اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔لگتا تھا کہ وہ بوجھ جو میرے دل و دماغ پر ٹھاکر نے لاد دیا تھا۔اب اتر چکا ہے اور میں ایک غیر ضروری ذمہ داری کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہوں جو ٹھاکر کی صحبت میں میں اپنے آپ پر محسوس کر رہا تھا۔اس وقت تک ہر طرف ہلکی ہلکی چاندنی پھیل چکی تھی۔گاؤں کے گھاس پھوس اور مٹی کے کچے پکے مکانوں میں مٹی کے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔کسی گھر سے کسی ننھے بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی۔کسی گھر میں کوئی بوڑھا کھانس رہا تھا۔کہیں کوئی جوان اور طرار ہنسی اس مدھم سی روشنی سے پھوٹ کر اندھیرے میں تحلیل ہو رہی تھی۔یہ تمام آوازیں زندگی کے مختلف روپ پیش کر رہی تھیں۔میرے ذہن میں اس وقت کوئی واضح خیال نہیں تھا۔خیال واضح نہ ہو تو واقعی ذہن پر ایک بوجھ بن جاتا ہے۔اس وقت میں شاید اپنے اندر ایک موہوم سی ذمہ داری محسوس کر رہا تھا کہ مجھے کچھ سمجھنا ہے کچھ فیصلہ کرنا ہے۔ان الجھے ہوئے خیالات میں ایک ایسا خیال بھی تھا جو ایک کالے دھاگے کی شکل میں اس چاندنی میں دور تک چلا گیا تھا اور اس کا دوسرا سِرا شاید ٹھاکر کے پاس تھا۔"ٹھاکر کتنا نڈر اور دلیر ہے۔کیسے جی کھول کر ہنستا ہے۔اپنے قہقہہ کی کوئی حدود مقرر نہیں کرتا۔ کیسی گونجدار آواز میں قہقہہ اڑاتا ہے۔فضائے بیکراں میں آزاد قہقہہ۔جیسے قہقہہ جتنا وسیع ہو گا اتنی ہی وسیع فضا اس کی ملکیت ہو گی۔وہ اپنے گونجدار قہقہوں سے فضا کی وسعتوں پر یلغار کر دیتا ہے۔یہ شجاعت، یہ آزادی۔یہ اقتدار اسے کس طرح مل گیا۔میں تو اپنے تئیں یہ سمجھتا تھا کہ میں نے زندگی کا راز جان لیا ہے۔اور میں اس قدر دلیر اور جانباز ہوں کہ گھر سے فرار کی شکل میں، میں نے زندگی کے فرسودہ ماحول سے بغاوت کر دی ہے۔قیوم اور جبار تو شاید اپنی بغاوت کے عَلم گاڑ چکے ہوں۔لیکن ہم نے کِس سے بغاوت کی ہے؟ کونسی دلیری کا ثبوت دیا ہے؟ ہم اپنے ماحول سے کیوں بھاگ رہے ہیں۔؟ ہم کو کیا چاہیے۔؟ نام، شہرت، عزت، زندگی کا عیش۔یہ زندگی کے کتنے ہوش ربا نام ہیں جیسے ان چار خانوں میں بٹ کر زندگی مکمل ہو گئی ہو۔اور اس

ماحول سے جس میں ہماری زندگی کی تپتی جلتی حقیقتوں کا دھواں بھرا ہوا ہے، فرار ہو جانا کونسی دلیری اور شجاعت کا کام ہے؟ پھر مجھے یہ خیال آیا کہ یہ جسارت ٹھاکر کیوں نہیں کرتا۔ وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں کے محدود ماحول میں کس طرح خوش رہتا ہے۔ ٹھاکر باہر کی دنیا سے بے خبر ہے۔ کبھی اس کا جی نہیں چاہتا کہ وہ بڑا آدمی بنے۔ لوگ اس کو عزت کی نظر سے دیکھیں۔ اس کی تعریف کریں۔ کیا اس میں ایسا کوئی جذبہ نہیں۔ وہ دراصل اپنے ماحول کا مارا ہوا ہے۔ بزدل۔ فرار اس کے لیے ممکن نہیں۔ فرار کے لیے تو بڑی سوجھ بوجھ چاہیے۔ بڑا کلیجہ چاہیے۔ مجھے اپنے گھر سے فرار ہونے کے خیال پر اس وقت ایک فخر کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے اپنے زور بازو پر ایک زنجیر توڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں اپنی شجاعت پر بڑا ہی نازاں ہو چلا تھا اور گاؤں کے ان چھوٹے چھوٹے گھروں کی مدھم روشنی سے زیادہ روشنی میری اس فخر آمیز مسکراہٹ سے پھیل رہی تھی، جو میں اپنے ہونٹوں پر محسوس کر رہا تھا۔

ان ٹمٹماتے چراغوں کی روشنی کا سلسلہ میری مسکراہٹ تک تھا اور میری مسکراہٹ کا سلسلہ پیچھے چھوڑتے ہوئے ٹھاکر کے قہقہوں تک تھا، جس کی وجہ سے اس مسکراہٹ کی تہہ میں میرے اندر ایک ایسا احساس بھی سرایت کر رہا تھا، جو بن بن کر ٹوٹ رہا تھا، ایک عجیب و غریب شکست کا احساس۔ کمتری کا احساس۔ کیا ٹھاکر مجھ سے برتر ہے؟۔ ایسا نہیں ہے۔ ٹھاکر تو ایک بدکار اور بے رحم شخص ہے، وہ تو کسی سے نہیں ڈرتا تو پھر وہ آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو بالکل اجڈ گنوار ہے۔ بالکل جانور۔"

پھر بھی ٹھاکر کی یہ ساری صفات، میرے احساسِ شکست پر ایسے کچوکے لگا رہی تھیں جیسے ایک ہی جگہ پانی بوند بوند گر کر اپنا نشان گہرا کرتا چلا جاتا ہے۔

میں اب اور تیز تیز قدم بڑھانے لگا، اس کوشش میں کہ ٹھاکر سے میرا ذہنی ربط ٹوٹ جائے اور اس کی شخصیت کے اثر کی حدود سے باہر نکل جاؤں۔ میں خود ان حدود سے باہر نکل آیا یا سمی نے جھپٹ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا، میں یہ نہیں جان سکا۔ لیکن اس وقت میری نظر کے سامنے سمی کا گھر تھا اور اس گھر کے پچھلے دروازے میں سمی کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں تیزی سے اس تک پہونچ گیا۔ اس نیم وا دروازے

میں کچھ ایسا دھندلکا تھا جیسے گھر سے نکلتا ہوا اندھیرا باہر کی چاندنی سے لپٹا کھڑا ہو۔ اس دھندلکے میں، میں صرف سمی کا سیاہ لباس اور اس کا چاندنی جیسا دمکتا چہرہ دیکھ سکا اس نے دروازے سے باہر جھانک کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "جلدی سے اندر آجاؤ" اور آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھ جھپکتے میں اس نے مجھے دروازے کے اندر گھسیٹ لیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ایک پتلا سا راستہ جس کے دونوں طرف دو بند کمرے تھے اور دروازے کی بائیں طرف جہاں ہم کھڑے تھے ایک چھوٹی سی نالی تھی جس سے تیز قسم کی بدبو پھوٹ رہی تھی۔ سمی پھرتی سے نالی پھلانگ کر کہیں غائب ہو گئی اور میں ابھی تنہائی کا احساس بھی نہ کر پایا تھا کہ اس کا سرد ہاتھ میری کلائی پر تھا۔ اس نے مجھے اس نالی سے لگے ایک تاریک کمرے میں گھسیٹ لیا۔

اس کمرے کی پچھلی دیوار میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ وہاں سے چاندنی کچھ سہمے سہمے انداز میں اندر جھانک رہی تھی۔ اس کمرے میں بھی ایک قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سمی ایکدم خاموش تھی۔ اور میرے ہونٹ کانپ رہے تھے کہ اچانک کمرے میں قریب ہی ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز گونجی۔ میں چونک کر سمیؔ سے لپٹ گیا۔ سمی نے مجھے بھینچ لیا اور مجھے لگا وہ ہنس رہی ہے۔ اس نے بہت ہی دبی دبی آواز میں کہا۔

"یہ ہمارا گھوڑا ہے اور جہاں ہم کھڑے ہیں وہ ہمارا اصطبل ہے۔" مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اس نے کہا۔ "یہاں بیٹھو۔"

میں نے کہا۔ "کہاں، نیچے؟"

اس نے میرے سر کے بال پکڑ کر کہا۔ "ہاں نیچے۔" اور مجھے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اور جہاں میں سنبھلتے سنبھلتے لڑھک گیا، وہاں نرم نرم گھاس تھی۔ اس سے پہلے کہ میں پھر سنبھلنے کی کوشش کرتا سمی مجھ پر آرہی اور اس نے اپنی باہوں میں مجھے دبوچ لیا۔ سمی کا گرم گرم سینہ میرے سینے پر تھا اور اس کے تپتے ہونٹوں میں میرے ہونٹ بند ہو چکے تھے۔ ہم گھاس میں دھنس رہے تھے اور ہمارے ادھر ادھر، نیچے اوپر گھاس ہی گھاس پھیل رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلا وقت تھا کہ میرے بازوؤں نے پھیل کر ایک جوان اور نرم و گداز بدن کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ سمی

یکبارگی اس کچی گھاس میں کسمسا گئی اور نڈھال ہو کر اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکتی ہوئی چاندنی مسکرا مسکرا کر سمی کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ سمی کی پیشانی پر ہلکی سی نمی پھوٹ پڑی تھی اور اس کی رکی رکی سانسوں نے اس کے سینے کے تناؤ کو اور بڑھا دیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری رگوں میں بھی پگھلا ہوا گرم گرم لوہا دوڑ رہا ہے۔ میرے بازو بھی ٹھاکر کے بازوؤں کی طرح مضبوط ہو گئے ہیں۔ میرا سینہ بھی پھول کر ٹھاکر کے سینے جیسا کشادہ ہو گیا ہے اور میرا نام بھی ٹھاکر ہے۔ میں نے اپنی مضبوط باہوں میں سمی کو بھینچ لیا، لیکن سمی اچانک میرے بازوؤں سے پھسل گئی۔ اور مجھ سے الگ ہوتے ہوئے، اس نے اکھڑی اکھڑی سانسوں میں کہا۔ "ٹھہرو۔" اور وہاں سے اٹھ کر اس نے کمرے کے دروازے کے باہر جھانکا اور پلٹ کر میرے پاس آ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نے اس طرح اس وقت مجھے یہاں اندر کیوں بلالیا۔ تم کو ڈر نہیں لگتا۔ اس وقت یہاں کوئی آجائے تو؟"

سمی نے کہا۔ "بابا آج کل باہر گئے ہوئے ہیں۔ شانی اور عشی اپنے سبق یاد کر رہی ہیں۔ چھوٹی امی جان نماز پڑھ رہی ہیں اور بڑی امی امیر حمزہ کی داستان پڑھنے میں مگن ہیں۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے اور مجھے مسکراتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنی بھاری سانسوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"بولو۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟"

میں نے کہا "کہاں؟" اپنے اس سوال پر مجھے محسوس ہوا کہ یہ سوال ایک مرد کے شایان شان نہیں ہے۔ مرد تو پوری خودداری کے ساتھ، ایک جوان لڑکی کے ایسے سوال پر صرف ہاں کہتا ہے۔ اپنی غلطی کے احساس کو مٹاتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ "تم میرے ساتھ چل سکو گی؟"

اس نے پوچھا "کہاں؟"

اس کے اس سوال پر مجھے اپنے اندر ایک بھرپور جوانی کا احساس ہوا۔ میں نے

اس کو اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔ "جہاں میں لے چلوں۔"

اس نے نشیلی آواز میں کہا۔ "ہاں۔" اور میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

میں نے کہا۔ "میں بمبئی جا رہا ہوں۔"

وہ یکلخت میرے سینے سے الگ ہو گئی اور اپنے لہجہ میں خفگی کا انداز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"یہ آوارہ لڑکوں کی سی باتیں مجھے پسند نہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے، تم اس بار گاؤں کیوں بھیجے گئے ہو۔ تم اسکول سے بھاگے ہوئے ہو۔ چھی، آوارہ کہیں کے۔"

مجھے لگا سمی نے مجھے اندھیرے میں دھکیل دیا ہے اور وہ مجھے وہاں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ مجھے سمی کی وہ بات اچھی نہیں لگی۔ محسوس ہوا کہ سمی مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتی۔ اس دو گھڑی کی خاموشی میں، میں سمی سے بہت دور جا چکا تھا، جہاں سمی جیسی کئی لڑکیاں میرے سینے پر سر رکھ کر مجھے اپنا کہنے کے لیے بیتاب ہوں۔

میری خاموشی پر سمی نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا۔ "برا مان گئے؟ میں تم کو آوارہ نہیں سمجھتی۔ میں تو تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" اب سمی مجھے بالکل اپنی لگی۔ صرف میری، میں نے اسے اپنی طرف کھینچ کر پوری طرح اپنے قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ "جہاں میں لے چلوں؟"

اس نے کہا۔ "ہاں" ۔ اور پھر کچھ سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "لیکن کب؟"

میں نے بڑے ہی پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "آج رات۔" سمی کے بدن میں جیسے ایک سنسنی دوڑ گئی۔ اس پر شاید ایک انجانا سا خوف طاری ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا، اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی پھوٹ پڑی ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرے چہرے کو تھام لیا۔ کچھ رکے رکے لہجے میں کہنے لگی۔

"دیکھو، تم آج میری ایک بات مان لو تو زندگی بھر میں تمہاری بات مانوں گی۔"

میں نے کہا۔ "بولو۔"

اس نے میرے چہرے کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "برا مت ماننا۔"

"تم بولو تو۔"

اس نے کہا۔" دیکھو، تم مجھ سے چھوٹے ہو۔"

" چھوٹا ہوا تو کیا ہوا۔؟" میں نے تن کر پوچھا۔

اس نے کہا۔" برا نہ مانو۔اسی لیے تو تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم بہت بہت اچھے ہو۔ تم خوب پڑھو، پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ۔ ساری دنیا تم کو عزت کی نظر سے دیکھے گی۔جانتے ہو اس وقت میں تمہاری دلہن بن کر تمہارے پاس آؤں گی۔"

" دلہن " کے لفظ پر میرے ذہن میں ایک انتشار سا پیدا ہو گیا۔اس ہلکے سے اندھیرے میں سمی کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر میرے سارے باغی خیالات گھریلو بن گئے۔جیسے یکلخت میرے اندر ہی اندر کچھ پگھلنے لگا ہو۔میری نظروں کے سامنے اس سیاہی میں کچھ سرخیاں جھلملانے لگیں۔ان سرخیوں میں ہلکی ہلکی سی دمک تھی۔سمی کی آنکھوں سے ایک نور پھوٹ رہا تھا۔قرمزی۔گلال سا۔اس نے مجھ سے پوچھا۔

"چپ کیوں ہو۔؟"

میں نے کہا۔" تم سچ کہتی ہو؟"

" بالکل۔"

" وعدہ؟"

" پکا۔"

" تو میرا بھی وعدہ۔"

" کس بات کا؟" اس نے پوچھا

" میں بھی خوب پڑھوں گا۔اور بہت بڑا آدمی بن کر تم کو لینے آؤں گا۔"

سمی یکلخت ہنس پڑی۔وہ ہنسی کیسی تھی؟ وہ ہنسی ایسی تھی جو کبھی دل میں چھپی ہوئی خوشیوں کے مرکز سے یکلخت تیر کی طرح نکل پڑتی ہے اور دوسرے کے دل میں دھنس جاتی ہو۔

" سچ؟" کچھ اس انداز سے اس نے پوچھا جیسے اس سچائی سے زیادہ حسین سچائی اس کے لیے دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

میں نے کہا۔" بالکل سچ۔" یہ سنتے ہی اس نے بے ساختہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے سر کے بال پکڑ لیے اور اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں کے

قریب لا کر بڑی ہی سریلی سرگوشی میں کہا۔ "انہیں چوم لو۔"

میں نے ہنستے ہوئے اس کے ہونٹ کاٹ لیے۔ اس نے میرے بالوں کو جھنجھوڑتے ہوئے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ اور ہم دونوں پھر پچھے گھاس پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میں شاید اس وقت ایک ہٹا کٹا گٹھیلا نوجوان بنا ہوا سمی کے بے قابو بدن کو اپنے قابو میں کیے ہوئے تھا۔ سمی چپ تھی۔

ٹھیک اس وقت کمرے سے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور اس چاپ کے ساتھ لالٹین کی روشنی کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ ہم دونوں لپک کر دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے دونوں کے لیے سانسوں کو روکے رکھنا بہت مشکل تھا۔ لیکن ہم دونوں دم سادھے ہوئے تھے۔ سمی نے مجھے اپنے پیچھے چھپا لیا۔ ڈر تھا کہ ہمارے دل کی دھڑکن سارے گھر والے نہ سن لیں۔ لگتا تھا دل کی دھڑکنیں دروازے سے باہر بہت دور تک سنائی دے رہی ہیں۔ ہم نے وہی ہونٹ بری طرح بھینچ لیے تھے جو ابھی سمندروں کی آزاد لہروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ لیکن ان بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساحل پر رکی ہوئی سانسیں یلغار کر رہی تھیں۔ دھڑکنوں کا شور طوفاں برپا کر رہا تھا۔ اس طوفان کی زد میں آ کر ہماری کشتی پاش پاش ہونے والی تھی۔ ڈوبنے والی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے میں پھیلتی ہوئی اس روشنی کو ہم دیکھ رہے تھے جو قدموں کی چاپ کے ساتھ ہم سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ دروازے کے پٹ سے ٹکراتی ہوئی روشنی کی ایک لکیر اس طرح قریب آ رہی تھی، جیسے ایک ننگی تلوار ہو اور اس کی تیز دھار اب ہم کو کاٹ کر رکھ دے گی اور ہمارے دھڑ نیچے آ رہیں گے۔ تلوار کی دھار سمی کی کمر تک آ کر رک گئی۔ میں نے سمی کو اپنی طرف اور دبوچ لیا۔ شاید ایسے ہی لمحات میں انسان کا صرف دل دھڑکتا رہتا ہے اور سارا بدن مر جاتا ہے۔ اس وقت دل کی دھک دھک کوئی آواز نہیں تھی، بلکہ ایک زبان بن چکی تھی جس پر صرف دو ہی الفاظ تھے۔ خدا اور رسول۔ دل کی دھک دھک کی بجائے یہی دو لفظ سنائی دے رہے تھے۔ ہونٹوں سے یہ الفاظ ادا ہوں تو شاید اتنی ہمت اور اتنی ڈھارس نہ بندھے جتنی کہ دل کی دھڑکن سے ادا ہونے پر بندھتی ہے۔ ہماری دعائیں جیسے قبول ہو گئیں، تلوار کی دھار ہمارے بدن سے دور ہونے لگی،

جیسے اندھیرے کی نیام میں واپس ڈالی جارہی ہو۔ اور غنیم دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہا ہو۔ پیروں کی چاپ مدھم ہوتی جارہی تھی اور ہمارے دلوں میں اٹھا ہوا طوفان دھیرے دھیرے تھم رہا تھا۔ کمرے میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے کس قدر پرسکون ہوتے ہیں! باہر سنائی دینے والی دھڑکنیں اب ہماری سرگوشیوں کا سا انداز اختیار کرنے لگی تھیں۔ سمی نے کہا۔ "اب تم چلے جاؤ، بڑی امی باتھ روم کی طرف آئی تھیں۔ چلو، جلدی۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"ٹھہرو، میں نے کہا۔

اس نے کہا۔ "نہیں، اب چلے جاؤ۔"

"میں کل پھر، اسی وقت آؤں گا۔"

"نہیں، کل مت آنا۔ کل بابا آجائیں گے۔"

"تو پھر کب ملو گی؟"

"میں تمہیں بلاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سہمے سہمے باہر دیکھتے ہوئے مجھے گھر کے پچھلے دروازے کے باہر دھکیل دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو دروازہ بند ہو چکا تھا۔

اب سارے راستے پر میں تھا۔ میری تنہائی کے وسیع ماحول پر مدھم سی چاندنی چھائی ہوئی تھی اور ہلکی خنک ہوا چاندنی کی مہین چادر سے میرے بدن کا پسینہ خشک کر رہی تھی۔ اپنے بے ربط خیالات میں مجھے ایک سکون مل رہا تھا۔ ایک ایسا سکون جس میں کوئی تسلسل نہیں تھا۔ سکون کے مسلسل احساس میں بے سکونی کے چند لمحات زندگی کو کیسی نرالی لذّت سے آشنا کر دیتے ہیں جو کبھی مِل نہ پائیں تو شاید ساری زندگی اپنے ہی دل کی دھڑکن سنے بِنا گزر جائے۔ میری زبان چپ تھی، لیکن میرا روم روم بول رہا تھا۔ میرے کانوں میں کئی آوازیں آرہی تھیں، جن کی کوئی زبان نہیں تھی، جن کے کوئی الفاظ نہیں تھے، کوئی معنی نہیں تھے۔ لیکن وہ بے معنی اور بے ہنگم آوازیں مجھے زندگی کا مفہوم سمجھا رہی تھیں۔ ایک بے ہنگم سا شور تھا جو ماحول کی خاموشی کو اور اجاگر کر رہا تھا۔ اس طرح میں اپنے وجود سے بے خبر جب اپنے گھر کے دروازے پر پہونچا تو دروازہ بند تھا۔ شاید گھر والے سب سو چکے تھے۔

دن بھر کام کرنے والا گاؤں اوائل شب ہی کس طرح تھک ہار کر سو جاتا ہے لیکن مجھے جاگنا تھا۔ اس رات کی ہلکی چاندنیوں سے، گہری خاموشیوں سے، بے کنار تنہائیوں سے کچھ مانگنا تھا۔ ایک گوشہ عافیت میں بیٹھ کر اپنے معبود سے یہ پوچھنا تھا کہ میں کیا کروں؟ لذتوں سے بھرپور زندگی کا یقین انسان کو کیسے ارفع و اعلیٰ مقام تک پہونچا دیتا ہے۔!

میں نے دروازے پر اپنا کان رکھ دیا۔ یہ سننے کی کوشش کی کہ اندر کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ بنا کچھ سوچے سمجھے میں دروازے کے سہارے ہی دیوار پر چڑھ گیا اور یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھے اس طرح دیوار پھاندتے ہوئے کوئی دیکھ لے تو کیا ہوگا۔

میں دیوار کے سہارے تیزی سے اندر اتر گیا۔ ہاتھ پاؤں پر تھوڑی سی خراشیں آئیں، لیکن ان کے درد کا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں جلدی جلدی لیکن احتیاط سے قدم بڑھاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں ایک قندیل کی مدھم سی روشنی تھی۔ میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ بغل کے کمرے سے کچھ سرگوشیاں سی سنائی دینے لگیں [illegible] شاید اپنی نئی نویلی دلہن کے بدن کی تعریف کر رہے تھے۔ ان دنوں ان کے بدن کے بارے میں کچھ ایسی ہی گن سن، سنی تھی یہاں وہاں کہ بدن کیا ہے، آگ ہے آگ۔ شعلہ ہے شعلہ۔ "ہش"۔ بن آواز ہی بولتے ہوئے اپنے ان خیالات کو خاموش کرنے کے لیے میں نے کہا۔ لیکن جس طرح ہواؤں سے شعلہ لپکتا ہے میرا خیال لپک رہا تھا۔ "بدن۔ آگ۔ شعلہ، بدن ..... بدن ..... آگ ....." میں خاموش تھا، میرا دماغ کہے جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ، آہستہ اور شاید میں سو چکا تھا۔

باب (۷)

دوسرے دن صبح دل میں ایک خواہش جاگی کہ تیرنے کے لیے ندی کی طرف چلا جاؤں۔ ٹھاکر نے بلایا تھا اور مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں جاؤں گا تو وہ مجھے ایک چکنی چکنی مچھلی پکڑ کر دے گا اور میں اسے سنتروں کے باغ میں لے جا کر اس کے مچلتے بدن

کو اپنے قابو میں کر لوں گا۔ میری نظر کے سامنے ندی کے تھرکتے پانی سے اٹھتا ہوا ایک جوان بدن کا شعلہ تھا۔ پانی میں سلگنے والی اس بدن کی آنچ تھی۔ اس آنچ کی گرمی مجھے اپنے رگ و پئے میں سرائت کرتی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن ...... لیکن۔ میں اس دن گھر سے قدم بھی نکال نہیں سکا۔ شام ہو گئی۔ چاہتا تھا جا کر سمی سے ملنے کی کوشش کروں۔ اس کے گھر کے کئی چکر لگائے لیکن سمی سے ملنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا۔ جب شام ہو گئی تو میں مایوس ہو کر پھر اپنے گھر لوٹ آیا۔ لیکن کچھ عجیب بے چینیوں نے میرے دل و دماغ کو گھیر رکھا تھا۔ ایک پل کے لیے کہیں سکون سے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اپنے آپ کو بہت ہی بجھا بجھا سا محسوس کرنے لگا تھا۔ پتہ نہیں کیوں میں اپنے آپ کو بہت ہی مجبور پا رہا تھا۔ ٹھیک اس وقت میرے بڑے بھائی کی دلہن، میری بھابی میرے کمرے میں آگئیں۔ ان کے سرخ ہونٹوں پر بڑی ہی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ ان کی بڑی بڑی اور سیاہ آنکھوں میں بھی بڑی ہی روشن ہنسی تھی۔ اور بدن تو واقعی شعلہ فشاں تھا۔ وہ میرے پلنگ پر آکر بیٹھ گئیں اور کہا۔ "کیوں میاں بہت چپ بیٹھے ہو۔ گھبراؤ مت، تم کو پھر اسکول کو بھیجا جا رہا ہے۔ اب اچھا پڑھنا اور خوب پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بننا۔" پتہ نہیں یہ سب کچھ کہتے ہوئے ان کو کیوں خوشی سی محسوس ہوئی۔ میں نے ان کو ایک بار بہت ہی غور سے دیکھا۔ ان کے سارے وجود میں جوان فصلوں کی تازگی و طراوت تھی۔ کچے رنگ تھے اور جھرنوں کے مچلتے پانی کی سی بے چینی تھی، بہاؤ تھا۔ میں بھی پتہ نہیں کیوں کھکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ وہ بھی جیسے اپنی بے قراری کی ایک لہر بن گئی تھیں۔ یونہی ہنستی ہوئیں وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں حجلہ عروسی کی سی خوشبو پھیل گئی۔ اس خوشبو سے تر بتر یہ خیال بھی ذہن میں انگڑائی لینے لگا کہ سمی نے بھی کہا ہے تم خوب پڑھنا، پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بننا۔ میں تمہاری دلہن بن کر تمہارے گھر آؤں گی۔" ان الفاظ نے ایک طلسمی نگر کے در کھول دیے۔ اور کئی قسم کے رنگوں اور کئی قسم کی روشنیوں میں ڈھلے ہوئے جو تصورات پیش کیے وہ کوئی خواب نہیں تھے۔ میں ان کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ رات بالکل تنہا ہے۔ اکیلی ہے، اس رات

کے ساتھ کوئی نہیں ۔ یہ رات بہت خاموش ہے ۔ چپ ہے ۔ اس کے گزرتے لمحات مجھ سے قریب آکر ٹھہر گئے ہیں اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔ ان کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی سرگوشیاں ہیں اور وہ منتظر ہیں کہ میں ان کی سرگوشیاں سن لوں تو وہ میرے قریب سے ہوتے ہوئے گزر جائیں ۔ میں اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ کمرے سے باہر نکل آیا ۔ رات واقعی بہت ہی چپ چاپ کھڑی تھی ۔ ہر طرف دھندلی دھندلی چاندنی پھیلی ہوئی تھی ۔ اس رات کے خاموش لمحات نے آخر اپنے لب کھولے ۔ مجھ سے سرگوشیوں میں کچھ کہا اور آگے بڑھ گئے ۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ رات کے وہ لمحات ہیں جو رات کی گہرائیوں میں بہتے ہیں اور بہت کم کبھی رات کی سطح پر ابھر آتے ہیں ۔ وہ لمحات گزر گئے اور میرے سینے میں ایک شدید خواہش کو سلگا گئے ۔ اس خواہش نے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں کے شور میں ایک حوصلے کی شکل اختیار کر لی ۔ میرے قدم آہستہ آہستہ گھر کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گئے ۔ میں دبے پاؤں دروازے تک پہونچا ۔ دروازہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا ۔ کل رات دیوار کے جس حصے کا سہارا لے کر میں گھر میں اترا تھا ، اسی حصے کے سہارے میں دیوار پر چڑھ گیا اور تیزی سے باہر کی طرف اترتے ہوئے نیچے چھلانگ لگادی ۔ اب میں گھر سے باہر سڑک پر تھا اور میرے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی ۔ گھڑی بھر میں کچھ اندیشوں نے مجھے واپس لوٹنے پر اکسایا ۔ لیکن قدم آہستہ آہستہ آگے ہی بڑھتے گئے ۔ میں اس دھندلی چاندنی سے بچ کر ، دوسرے گھروں کی دیواروں کے مختصر سائے میں پناہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا ۔ میں اس پیڑ تک پہونچ گیا تھا جو سمی کے گھر کی پچھلی دیوار سے لگا چپ چاپ کھڑا تھا ۔ اس کی ٹہنیاں اس گھر کے اندر ، چھت تک پھیلی ہوئی تھیں ۔ پیڑ کا تنا کچھ اوپر جاکر دو حصوں میں بٹ گیا تھا ۔ میں پیڑ کے کھردرے تنے سے لپٹ گیا اور اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا ۔ تنا گرفت میں آتا نہ تھا ، دو بار میں نیچے پھسل پڑا ۔ تیسری بار میں تنے کے اس حصے تک پہونچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے وہ دو حصوں میں بٹ گیا تھا ۔ دونوں حصوں کے بیچ میں نے اپنے آپ کو محفوظ پاکر ایک سکون افزا سانس لی ۔ اور گھڑی بھر بعد گھر کے اندر جھانکنے والی ٹہنیوں کو پکڑ کر دیوار پر پہونچنے کی کوشش کرنے لگا ۔ دیوار پر مجھے مضبوط

گرفت مل گئی اور میں دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ٹہنیوں کا سایہ مجھے چھپائے ہوئے تھا میری نظروں کے سامنے سمی کے گھر کا اندرونی صحن تھا۔ صحن کی دائیں جانب سمی کا کمرہ تھا۔ اب مجھے ایک پتلی سی ٹہنی سے لٹک کر صحن میں آہستہ سے کودپڑنا تھا۔ میں نے ایک ٹہنی منتخب کرلی اور اسے مضبوطی سے ہاتھوں میں تھام کر دیوار سے دھیرے دھیرے الگ ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اب میں ٹہنی سے لٹکنے ہی والا تھا کہ باہر سڑک پر کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ "چور، چور۔ پکڑو۔ پکڑو۔" پھر کسی کے وحشت ناک انداز میں دوڑنے کی آواز آئی۔ میرے ہاتھوں سے ٹہنی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی لیکن ایک جھکولے کے ساتھ میں پھر دیوار پر واپس آنے میں کامیاب ہوگیا اور پتہ نہیں کیسے آنکھ جھپکتے میں پھر تنے کے اس حصے پر اتر آیا جہاں وہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ تنے کے دونوں حصوں کے بیچ میں نے اپنے بدن کو سکوڑ لیا اور اپنے دل کی دھڑکن کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے سڑک کی طرف دیکھنے لگا، ٹھیک اس وقت ایک تن ومند مرد وحشتناک انداز میں دوڑتا ہوا آکر اس پیڑ کے نیچے دیوار اور تنے کے بیچ چھپ گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی تیز تیز سانسوں کو میں سن سکتا تھا۔ اس کے پیچھے چار پانچ آدمی دوڑتے اور "پکڑو۔ پکڑو۔" چیختے ہوئے آئے اور میری نظروں کے سامنے سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت سڑک کے دوسرے رخ سے ایک گھوڑے سوار تیزی سے اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور ان سب کے پاس آکر رک گیا۔ گھوڑے سوار نے بڑی ہی پر وقار آواز میں ان آدمیوں سے پوچھا۔

"کیا گڑبڑ ہے۔"

ان آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ "چور ہے، چور۔ مستان کے گھر میں گھس گیا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"کدھر گیا؟"

"بس ادھر ہی آیا۔ مستان گھر سے نکل کر چیخنے لگا تو ہم سب اپنے گھروں سے نکل آئے۔"

"لیکن ادھر سے تو میں خود آرہا ہوں۔ مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔"

"ہو سکتا ہے، کہیں چھپ گیا ہے۔" وہ سب ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"کیا چرا کر بھاگا۔؟" گھوڑے سوار نے پوچھا۔

مستان نے کچھ کہنا چاہا تو دوسرا آدمی بول پڑا۔ "بات کچھ ایسی لگتی ہے ٹھیکیدار صاحب، وہ کوئی چور نہیں تھا، اس کی نیت کچھ اور تھی۔ اس نے مستان کی لڑکی کو جگانے کی کوشش کی۔"

ٹھیکیدار کا نام سن کر میں سر سے پیر تک کانپ گیا۔ یہ سمی کے بابا تھے۔ پھر میں نے نیچے کی طرف دیکھا، دیوار کو لگا ہوا سایہ موجود تھا۔

ٹھیکیدار صاحب نے کچھ تعجب سے پوچھا۔ "لیکن وہ اس طرح غائب کیسے ہو سکتا ہے۔؟ یا تو وہ جنگل کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے یا پھر ان املی کے پیڑوں پر چڑھ کر کہیں چھپ گیا ہے۔"

وہ لوگ جہاں کھڑے ہوئے تھے، وہاں سے کچھ فاصلے پر آٹھ دس املی کے پیڑ تھے۔

"تم لوگ ادھر جا کر دیکھو۔ میں تھانے پر جا کر اطلاع دے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ٹھیکیدار صاحب گھوڑے پر سوار ہوئے اور تھانے کی طرف چل دیے۔ باقی لوگوں نے وہیں کھڑے ہوئے کچھ بات چیت کی اور املی کے پیڑوں کی طرف چل دیے۔

جب وہ سب اس رخ پر تھوڑی دور نکل گئے تو نیچے دیوار سے لگے ہوئے سائے میں حرکت ہوئی اور ایک جست لگا کر وہ سایہ پیڑ پر وہاں تک پہونچ گیا جہاں میں کھڑا تھا۔ میرے سوکھے ہوئے حلق سے ایک ایسی چیخ نکل گئی جو خود میں بھی نہ سن سکا۔ خوف سے میں کانپ رہا تھا۔ وہ سایہ پیڑ کے تنے کو پکڑے ہوئے اوپر میرے مقابل آگیا اور اس نے بڑی ہی دبی اور سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

میرے ذہن میں ایک ہلکی سی روشنی کوند گئی۔ اور میرے منہ سے نکل گیا۔ "ٹھاکر!!"

اس نے مجھے بڑے غور سے اور بڑی ہی تیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور ایک دھیمے اور سہمے لہجے میں اس نے میرا نام لے لیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہہ سکتا، پسینے سے شرابور اس کا بدن میرے بدن سے مس ہونے لگا۔ وہ تنے کے دونوں حصوں پر اپنے آپ کو سہارا دیتے ہوئے مجھ سے لگا لگا کھڑا ہو گیا اور ہنس پڑا جیسے اب

اسے کسی قسم کا خوف نہیں ۔اس نے جلدی میں مجھ سے پوچھا۔"تو یہاں کیا کر رہا ہے؟

گھڑی بھر کے لیے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں ۔ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔"چپ رہو۔ باتیں بعد میں ہوں گی۔"

لیکن میری گھبراہٹ پر وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔"ڈرمت سب ٹھیک ہو جائے گا جلدی سے بتا، اتنی رات گئے تو یہاں کیسے؟"میرے دماغ نے میرا ساتھ دیا اور میں نے اس سے کہہ دیا۔"مجھے پھر اسکول بھیجنے کی کوشش ہو رہی ہے اور میں پھر گھر سے فرار ہو رہا ہوں۔"

میری اس بات پر ٹھاکر دھیان نہیں دے سکا۔ وہ املی کے پیڑوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ادھر سے پھر ان آدمیوں کی باتوں کی آواز آنے لگی۔ ہم دونوں چپ سادھے پیڑ پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ آدمی پھر سڑک پر آگئے تھے ان میں سے ایک نے مستان نامی شخص سے کہا۔"تم گھر جاؤ۔ ہم لوگ تھانے جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لوگ ادھر چلے گئے جدھر ٹھیکیدار گئے تھے۔ مستان اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اب راستے پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ چلو، اب یہاں سے بھاگ چلیں۔"

ٹھاکر نے کہا۔"نہیں، ٹھہر، ابھی نہیں۔ تو بہت کچا کھلاڑی ہے۔ یہیں ٹھہر۔ وہ لوگ واپس آسکتے ہیں۔" پھر ہم نے اسی طرح پیڑ پر کھڑے ہوئے انتظار کیا۔ کوئی آواز نہیں آئی۔ کوئی سایہ نظر نہیں آیا۔ تب ٹھاکر تے کہا۔"ٹھیک ہے تو گھر کی طرف تیزی سے بھاگ جا۔"اور اس سے قبل کہ میں پیڑ سے نیچے اترتا وہ خود کود پڑا اور بجلی کی تیزی سے دوڑتا ہوا سڑک پار کر کے جنگل کی طرف نکل گیا۔ اس کو اس طرح دوڑتا ہوا دیکھ کر میں بھی اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ دیوار پھاندنے کی تو مجھے جیسے عادت سی ہو گئی تھی، تھوڑی ہی دیر میں میں اپنے گھر کی دیوار پر چڑھ کر اندر اتر گیا۔ مجھے یہ ہوش نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں لیکن تھوڑی ہی دیر میں میں اپنے کمرے میں تھا۔ پلنگ پر بیٹھ کر میں نے ایک سکون کا سانس لیا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ میرا سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ میرے سارے بدن پر زخم لگے ہوئے ہیں۔ جیسے میری خوب پٹائی ہوئی ہے اور اب تھوڑی دیر میں میں بے ہوش ہونے والا ہوں۔ اور ہو سکتا ہے تھوڑی دیر بعد شاید

میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے کچھ سدھ نہیں تھی۔

دوسرے دن صبح میں بہت دیر سے جاگا، لیکن میں اپنے آپ کو بیمار سا محسوس کرنے لگا۔ بستر سے اٹھ کر میں سیدھے نہانے کے لیے چلا گیا۔ نہانے کے بعد نہ صرف میں نے تازگی محسوس کی بلکہ میں اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا اور مجھے ایسا بھی لگا کہ رات کے سارے واقعات سے میرے ذہن کا رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس وقت جی چاہتا تھا کہ میرے پاس میرا کوئی قریبی دوست ہو اور میں اس کے ساتھ بہت ساری دلچسپ باتیں کروں، جی بھر کے ہنسوں۔ جانے کیوں مجھے اپنی بھابی کی شخصیت میں کچھ ایسی ہی کشش محسوس ہوئی۔ میں سیدھے ان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اس وقت سنگھار کیا کر رہی تھیں اپنی تنہائیوں میں اپنی شخصیت کا جادو جگا رہی تھیں۔ میں ان کے قریب چلا گیا۔ ان کے بدن کی خوشبو نے مجھے ایک تسکین سی بخشی اور جانے کیوں ان کی ایک روشن روشن سی مسکراہٹ نے میرے اندر ایک عجیب اعتماد کا احساس پیدا کر دیا۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ صحیح معنوں میں یہی وہ شخصیت ہیں جو میرے ہر راز کو معتبر سمجھ کر اپنے سینے میں محفوظ رکھیں گی۔ میری الجھنوں میں وہ ضرور میری مدد کریں گی۔ ان کی پر کشش شخصیت نے میرے ذہن و دل میں دھیرے دھیرے ایک پر سکون اعتماد پیدا کر دیا۔ جی چاہا کہ ان سے قریب بیٹھ کر ان سے اپنا وہ راز کہہ دوں جو میرے سارے وجود کو اپنے خول میں بند کیے ہوئے تھا۔ لگتا تھا ان کو یہ راز بتا دوں تو مجھے اس خول سے باہر نکلنے کی راہ دکھائی دے گی اور میں خول سے باہر نکل کر کھلی سانس لے سکوں گا۔ بھابی نے اپنے مہندی سے رنگے ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لی اور مسکرانے لگیں۔ پھر بڑے دلار سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میاں، چچا جان کا (یعنی میرے بابا کا) خط آیا ہے کہ ضلع کے اسکول سے تمہارا نام نکال دیا گیا ہے اور اب تمہیں رنگ پور بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں تمہارے بڑے بھائی کام کرتے ہیں۔ تم کو وہاں کے اسکول میں پڑھنا ہے۔ وہاں تم کو صرف اس لیے بھیجا جا رہا ہے کہ تم بڑے بھائی صاحب کی کڑی نگرانی میں رہو گے۔ سمجھے؟ اور تمہارے بھائی کل تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے جائیں گے۔ تیاری کر لو۔"
انہوں نے میری کلائی چھوڑ دی۔ پھر کہا۔ "اب خوب دل لگا کر پڑھنا، سمجھے؟"

ان کی بات پر میں نے اثبات میں سر تو ہلا دیا، لیکن رنگ پور کا نام مجھے کچھ ناگوار سا لگا۔ اس پر بڑے بھائی صاحب کی کڑی نگرانی کا ذکر۔

رنگ پور کے بارے میں میں نے سن رکھا تھا کہ وہ دراصل ایک بدنام مقام ہے۔ وہاں زیادہ ایسے لوگ رہتے ہیں جو جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ چور، ڈاکو۔ خونی۔ قتل کی کتنی ہی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ وہاں کی بعض شخصیتوں نے اپنے ان بدنام پیشوں کے باوجود دلیری اور بہادری میں نام کمایا تھا۔ ان کی داستانیں مشہور تھیں۔ پھر رنگ پور کے تصور کے ساتھ میرے بھائی صاحب کی سختی و درشتی۔ وہ اپنی طبعیت کے لحاظ سے بڑے ہی سخت گیر مشہور تھے۔ مجھے لگا اب مجھے باضابطہ ایک قید خانے میں بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں ہو سکتا ہے میں آزادی سے کچھ سوچ بھی نہ سکوں۔

بھابی کے شفیق لہجے نے مجھے متاثر کر لیا تھا۔ میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی اور ان سے کہا۔ "میں اب بہت جی لگا کر پڑھوں گا۔" بھابی خوش ہو گئیں اور کہا۔ "شاباش۔ تمہاری اگلی چھٹیوں میں ہم تم کو پھر یہیں بلائیں گے۔"

"میں بھی چھٹیوں میں یہیں آنا چاہتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ پھر ان سے اور قریب ہونے کی کوشش میں، میں نے ان سے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ تو مجھے برا آدمی نہیں سمجھتیں؟"

"بالکل نہیں۔ تم تو بہت اچھے اور سمجھدار ہو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور مسکرانے لگیں۔ آدمی اگر اپنے ذہن میں اٹھنے والے ہر خیال اور اپنے سینے میں مچلنے والے ہر جذبہ کا کھلے بندوں اظہار کرنے لگے تو میں سمجھتا ہوں وہ آدمی آدمی نہیں رہ سکتا۔ اس سے بڑا وحشی کوئی نہیں ہو سکتا۔ بھابی کی پُرخلوص شخصیت نے ان کی قربت نے پتہ نہیں میرے دماغ کے کن خطرناک حصوں کو چھو لیا کہ گھڑی بھر کے لیے میں نے ان کے سرخ ہونٹوں کی ترادت پر غور کیا۔ ان کے گالوں کی تازگی پر نظر دوڑائی اور ان کی مسکراتی آنکھوں میں ایک عورت کی بے تاب جوانی کی جھلکیاں دیکھیں۔ ان کے بدن کے متناسب خدوخال نے مجھے مجبور کر دیا کہ ان کی کمر کے ایک مخصوص خم پر اپنی نظریں جما دوں۔ مجھے محسوس ہوا میرے ہونٹوں میں ایک کپکپاہٹ سی ہے۔ میں نے کہا۔ "بھابی"۔

"ہاں" کہتے ہوئے انہوں نے میرے ہاتھ چھوڑ دیے۔ ان کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔

"آپ بہت اچھی ہیں۔" مجھے لگا میں نے بڑی ہی غیر موزوں بات کہہ دی ہے۔ بھابی نے کہا۔ "سچ؟" اور ہنسنے لگیں۔

ان کی اس ہنسی نے پتہ نہیں کیسے مجھ میں ایک خود اعتمادی کا جذبہ ابھار دیا۔ میں نے بلا جھجک ان سے کہہ دیا۔ "بھابی وہ ٹھیکیدار صاحب کی لڑکی ہے نا؟"

"ہاں ہے"۔ انہوں نے کچھ چونک کر کہا۔

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔" یہ الفاظ میرے ذہن میں گھوم کر وہیں ذہن ہی میں رہ گئے، اور زبان پر آنے تک اس طرح بدل گئے۔ "وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"تو شام میں بلالو۔ وہ یہاں آسکتی ہے۔ تم جاکر بلالو۔"

"نہیں، ان کے گھر جانا مجھے اچھا نہیں لگتا"۔

"ٹھیک ہے۔ میں بلوالیتی ہوں۔"

مجھے ایسا لگا میں نے ابھی دل کی بات ان سے نہیں کہی ہے۔ میں نے رکتے رکتے پھر کہا۔ "لیکن بھابی جب وہ یہاں آئے گی تو میں بھی اس سے ملوں گا۔"

"ہاں ضرور ملنا۔ تمہیں کون روک رہا ہے۔" میری بات کو وہ کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھیں لیکن دھیرے دھیرے ان کے چہرے کی رنگت بدل رہی تھی اور میرا حلق خشک ہوتا جارہا تھا۔ کوئی بات میرے دماغ میں ایک گھن گرج سی پیدا کررہی تھی اور میں وہ بات بھابی سے بہت جلد کہہ دینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی نظریں جھکالیں اور کہا۔

"بات یہ ہے بھابی کہ اس نے کہا تھا کہ جب بھی میں یہاں سے کہیں جاؤں تو پہلے اس سے ضرور مل لوں۔"

بھابی کے چہرے کی گلابی شگفتگی کے پیچھے ایک ہلکی سی تشویش کی سیاہی رینگ گئی۔ ان کی آنکھیں اور بڑی ہوگئیں۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیوں ......؟"

میرا حلق تو خشک تھا ہی۔ ایک لفظ کانٹا بن کر حلق میں اٹک گیا۔ میں نے اس کانٹے کو نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرے یہاں سے چلے جانے سے پہلے وہ

مجھے ایک کتاب دینا چاہتی ہے۔ وہ کتاب ایک بڑے آدمی کی زندگی کی کہانی ہے۔ وہ چاہتی ہے وہ کتاب پڑھ کر میں بھی بڑا آدمی بن جاؤں۔"

بھابی میرے جواب پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ان کے گالوں پر ہلکی سی نمی بھی پھوٹ آئی۔ لیکن ان کے چہرے پر تشویش کی سیاہی برقرار رہی۔ اس بار انہوں نے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو تم بہت بڑے آدمی بننے والے ہو۔ ہاں؟۔ بہت اچھی بات ہے، لیکن میاں تم کو ایسی ایک نہیں کئی کتابیں پڑھنی ہوں گی۔ سمجھے؟"

"میں بہت ساری کتابیں پڑھوں گا۔" یہ بات تو میں نے صرف اس لیے کہہ دی کہ بھابی میری دوسری بات سننے کے لیے تیار ہوجائیں۔ میں نے اس بار بِنا کسی جھجھک کے ان سے کہہ دیا۔

"بھابی، میں آپ کے نام خط لکھا کروں گا۔ اس میں میں آپ کو لکھوں گا کہ وہ کتاب میں نے کہاں تک پڑھ لی۔"

"اور تم کتنے بڑے بن چکے ہو۔" بڑے ہی ہلکے پھلکے لہجے میں یہ مذاق کرتے ہوئے بھابی ہنسنے لگیں۔ مجھے بھی راستہ صاف لگا۔ میں نے کہا۔ "ہاں بالکل۔ میرا خط آپ سمی کو برابر بتادیا کرنا تاکہ اسے بھی معلوم ہوجائے کہ میں بڑا آدمی بن رہا ہوں۔" میں بھی ہنسنے لگا۔ میری ہنسی کے جواب میں بھابی کے لہجے میں کچھ سنجیدگی سی آگئی۔ انہوں نے کہا۔ "میاں یہ زمانہ اسکول کی کتابیں پڑھنے کا ہے۔ ایسی کتابیں پڑھنے کا زمانہ ابھی نہیں آیا۔ سمجھے؟"

ان کی یہ بات مجھے بدمزہ لگی۔ میں چپ ہو رہا۔ بھابی نے پھر کہا۔ "لیکن مجھے تم ضرور خط لکھا کرنا۔"

"ضرور لکھوں گا۔" میں نے پرزور وعدہ کیا لیکن میں زیادہ خوش نہیں تھا۔ سوچا بھابی سے میں اپنی بات کہنے میں ناکام رہا ہوں۔ مجھے ہلکی سی خفت محسوس ہونے لگی۔ بھابی بھی چپ تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور آنکھوں میں کاجل لگانے لگیں۔ ان کے خدوخال اور آئینے سے جھانکتے ہوئے چہرے پر مجھے اب بھی کچھ ایسی نرمی سی، ملائمیت سی نظر آئی کہ جی چاہا ان سے لپیٹ کر کہہ دوں۔ "بھابی سچی

بات یہ ہے کہ سمی ...... " لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا اور پلٹ کر ان کے کمرے سے نکل گیا اپنے کمرے میں آکر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ مجھے اس بار بھی یہی خیال آیا کہ بھابی نے دراصل میری ساری بات سمجھ لی ہے لیکن انہوں نے اپنی بزرگی جتادی۔ یہ اندیشہ بھی مجھے ستا رہا تھا کہ شاید بھابی نے میری بات ٹال دی ہو اور وہ سمی کو شام میں نہیں بلائیں گی۔

لیکن اس شام سمی اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ ہمارے گھر آگئی۔ میں نے اپنے کمرے سے دیکھا بھابی سمی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ میں ان سب میں شامل ہو سکتا تھا لیکن ایک ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ لگتا تھا دل میں چور ہے۔

بھابی نے مجھے آواز دی۔ میں جیسے ایسے ہی سہارے کا منتظر تھا، تیزی سے ان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں ہر طرف کھلے ہوئے پھول نظر آئے۔ رنگ نظر آئے۔ میں یہ ضروری سمجھ رہا تھا کہ بھابی سے اس وقت کوئی ایسی چٹپٹی سی بات کہوں کہ وہ سب کے سب ہنسنے لگ جائیں۔ لیکن بھابی نے مجھ سے پوچھا۔

" تم کو معلوم ہے، کل رات پچھلی گلی میں چور آیا تھا۔ بڑی گڑبڑ رہی۔ صبح پولیس آئی۔ ٹھیکیدار صاحب کے گھر کے پاس کے پیڑ کے نیچے بھی اس کے پیروں کے نشان ملے ہیں۔"

بھابی کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں یہ سب کچھ کہہ رہی تھیں۔ سمی اور اس کی دونوں بہنیں بھی سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سمی سے پوچھا۔ "سچ؟" سمی نے سر ہلا دیا اور بھابی کی طرف دیکھنے لگی۔ جب ان سب کو معلوم ہو گیا کہ میں اس بات سے لاعلم ہوں تو بھابی نے کہا۔ "پولیس چور کی تلاش میں ہے۔"

میں نے کچھ کہنے کی خاطر کہا۔ "اب چور کی خیر نہیں۔ پولیس سے بچ کر کہاں جائے گا۔ بدمعاش" میری اس بات پر سب یہ سمجھ گئے کہ بات کا فیصلہ ہو گیا۔ اور چپ ہو گئے۔

تب بھابی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سمی سے کہا۔ "یہ کل یہاں سے جا رہے ہیں۔ تم ان کو کوئی کتاب دینے والی تھیں؟"

سمی سٹپٹا گئی ۔ مجھے دیکھا ۔ تب میں نے اسے یاد دلانے کے انداز میں کہا ۔ " وہ کتاب ایک بڑے آدمی کی زندگی کی کہانی جو تم مجھے دینا چاہتی تھیں ۔ " سمی نے پریشان ہو کر اپنی دونوں بہنوں کو دیکھا، لیکن پتہ نہیں کیسے اس کو جواب سوجھ گیا ۔ اس نے بھابی سے کہا ۔ " وہ تو میں نے ان سے مذاق کیا تھا ۔ " وہ چپ ہو گئی ۔ بھابی نے مجھے بڑی ہی عجیب نظر سے دیکھا، پھر سمی سے کہا ۔

" سمی، یہ میاں بہت بڑے آدمی بننے والے ہیں ۔ " یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگیں ۔ ان کے ساتھ وہ تینوں بہنیں بھی ہنسنے لگیں، لیکن سمی کی ہنسی میں کوئی بے ساختگی نہیں تھی ۔ لگتا تھا وہ کچھ بے چین سی ہے ۔ اس نے بھابی سے کہہ دیا ۔ " اب ہم جاتے ہیں ۔ بابا نے کہا تھا ہم جلد ہی واپس آجائیں ۔ "

" اتنی جلدی ؟ " بھابی نے پوچھا ۔

" ہاں ۔ " کہتے ہوئے سمی نے اپنی بہنوں سے کہا ۔ " چلو " ۔ اور میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ مجھ سے خوش نہیں ہے ۔ بھابی نے مجھ سے کہا ۔ " ان لوگوں کے ساتھ جا کر گھر تک چھوڑ آؤ "

" اچھا " کہہ کر میں سمی اور اس کی بہنوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا ۔ جب ہم گھر سے باہر آگئے سورج غروب ہو چکا تھا ۔ افق کی لالیاں مدہم پڑ چکی تھیں ۔ وہ تینوں بہنیں تیز تیز قدم بڑھا رہی تھیں ۔ میں چاہتا تھا وہ سب آہستہ آہستہ چلیں ۔ میں ان سے کچھ باتیں کروں ۔ لیکن بنا کوئی بات کیے ہم سمی کے گھر کے دروازے پر پہونچ گئے ۔ مجھے لگا سمی مجھ سے ناراض ہے ۔ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی ۔ میں نے اس سے پوچھا ۔

" تو اب میں واپس جاؤں ؟ "

سمی نے بنا میری طرف دیکھے دبی آواز میں کہا " اچھا " اور اپنی بہنوں کے پیچھے دروازے کے اندر چلی گئی ۔ سمی کے اس روکھے رویے پر مجھے ایسا لگا جیسے وہ اب میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گی ۔ لیکن اس کے دروازے پر نظریں جمائے میں گھڑی بھر وہیں کھڑا رہا ۔ پلٹ نہیں سکا ۔ اندر جھانکنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہیں ہوئی، کیونکہ سمی بھی مجھے اپنی نہیں لگی، مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی بہت بڑی غلطی کر دی ہے ۔ میں واپس جانے کے لیے پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے میں پھر سمی نظر آئی

اس نے اندر ہی سے جھانکتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔" جلدی سے اندر آجاؤ۔" اور اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اندر کھینچ لیا۔ اور پھر ایکبار میں اس نیم تاریک کمرے میں تھا جہاں گھوڑا بندھا تھا۔ لید کی بو تھی اور ایک کونے میں گھاس رکھی ہوئی تھی۔ سمی نے اپنے جذبات کے لپکتے شعلوں میں میرے پورے جسم کو جھلسا دیا۔ وہ مجھ سے کچھ اس بے چینی کے ساتھ لپٹ گئی جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے' لیکن وقت بہت کم ہے۔ اس نے اکھڑی اکھڑی سانسوں میں پوچھا۔

" تم کل یہاں سے جا رہے ہو؟ مجھے بتایا نہیں۔ تم کو مجھ سے پیار نہیں۔ پھر تم کب آؤ گے؟ نئے اسکول میں پڑھنے جا رہے ہو؟ مجھے کبھی نہیں بھولنا۔" وہ مسکرا بھی پڑی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلے۔ جیسے وقت کی کمی کی وجہ سے وہ ایسی باتیں الگ الگ نہیں کر سکتی۔ میرا کوئی جواب سننے پر وہ تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا " تم مجھے خط بھی نہیں لکھ سکتے۔ اب کیا ہوگا؟" پھر خود اسی نے کہا۔" اچھا خیر خط مت لکھو۔ لیکن میری خوب خوب یاد کرنا اور خوب پڑھ لکھ کر میرے پاس آجانا۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ گئی اور اس طرح خاموش ہو گئی جیسے اب اسے کسی کا ڈر ہے نہ وقت کی کمی کا احساس۔ میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے کہا

" میں بھابی کے نام خط لکھا کروں گا۔ بھابی سے میں نے کہہ دیا کہ میرا خط وہ تم کو بتا دیا کریں۔"

" تمہاری بھابی؟" سمی بہت گھبرا گئی۔" یہ بات ان کو کیسے معلوم ہو گئی۔؟" میں نے اسے سمجھایا۔" بھابی بہت اچھی ہیں، وہ ضرور تمہاری مدد کریں گی۔ تم ڈرنا مت۔ ہاں میں بھابی کے نام جو خط لکھوں گا اس میں میں اپنا پتہ لکھ دوں گا۔ تم اس پتے پر خط لکھنا۔ پہلے پہلے تم اپنا نام بدل کر مجھے خط لکھنا۔ کسی لڑکے کے نام سے جو میرا دوست ہے۔ ورنہ وہ خط کسی کو مل جائے تو ہنگامہ ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی بھیگی آنکھوں پر میں نے اپنے ہونٹ رکھ دیے، لیکن اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں میں دھنسا دیے اور مجھے اس طرح بھینچ لیا جیسے مجھے بتانا چاہتی ہو کہ بچھڑتے ہوئے اس طرح لپٹا جاتا ہے کہ بچھڑنے کو تو بچھڑ جاتے ہیں لیکن بدن کا لمس

زندگی بھر محسوس ہوتا رہتا ہے۔ دل و دماغ کی گہرائیوں میں بس جاتا ہے۔ کسی خیال سے گھبرا کر وہ مجھ سے الگ ہو گئی اور میرے بالوں کو جھنجھوڑتے ہوئے بڑے ہی کرب آمیز لہجے میں کہا۔

"جاؤ جاؤ چلے جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔" اور اس سے لپٹ گیا۔ اس نے مجبور ہو کر میری باہوں میں اپنے بدن کو یونہی چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی بند پلکوں پر دو آنسو آکر ٹھہر گئے۔ اور بہت ہی دور سے آنے والی آواز میں اس نے کہا۔

"اب چلے جاؤ۔" اور تھکے ہوئے انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا "ٹھہرو۔ میں ذرا باہر جھانک کر دیکھ لوں۔" اس نے باہر جھانک کر دیکھا اور مجھ سے کہا۔ "اب نکل جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا یہاں سے"

اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "ارے، بابا گھر میں ہیں۔ کوئی آجائے گا یہاں۔ چلے جاؤ۔"

"نہیں میں اس طرح نہیں جاؤں گا۔"

وہ پلٹ کر مجھ سے لپٹ گئی اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں کے سامنے کر دیے پھر ہمارے ہونٹوں پر کوئی لفظ نہیں آیا۔ ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ ہماری دبی دبی سانسیں بے الفاظ گفتگو کر رہی تھیں۔ سانسوں ہی میں بہت ساری باتیں کہی گئیں۔ سانسوں ہی میں عہد و پیمان ہوئے اور پھر میں نیچی نظریں کیے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں جب باہر نکل رہا تھا پیچھے سے میری قمیض پکڑ کر اس نے کھینچی اور آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سرگوشی میں "خدا حافظ" کہا اور دروازہ آہستہ سے بند کر لیا۔ میں نے پھر ایکبار پلٹ کر دیکھا، لیکن دروازہ ٹھیک سے بند ہو چکا تھا اور اس کے کھلنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ میں اپنے آپ سے بے خبر گھر پہونچ گیا۔

باب (۹)

جب میں اپنے گاؤں سے اپنے بھائی صاحب کے ساتھ رنگ پور جا رہا تھا تو دو

دن کے لیے ہم ضلع میں ٹھہر گئے تھے۔ ان دو دنوں میں مجھے میرے اسکول بھی جانا پڑا تھا۔ وہاں میرے کتنے ہی ساتھی لڑکوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ بہت سے لڑکے مجھ سے ملتے ہوئے بڑے ہی محتاط لگ رہے تھے۔ لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے میرا ساتھ چھوٹ جانے پر اپنے بھولے بھالے انداز میں افسوس کا اظہار کیا تھا۔ ان سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ قیوم اور جبار کے نام بھی اسکول سے خارج کر دیے گئے تھے اور ان کے گھروں میں ان کی بھی خوب پٹائی ہوئی تھی لیکن چند دنوں بعد وہ دونوں اپنے گھروں سے غائب ہو گئے تھے۔ یہ سن کر تھوڑی دیر تک ان دونوں کی قسمت پر مجھے رشک سا محسوس ہوا تھا کہ وہ دونوں اب تک بمبئی پہونچ چکے ہوں گے اور اب تھوڑے ہی دنوں میں وہ دونوں بڑی نامور شخصیتیں بن کر سنیما کے پردے پر نظر آئیں گے، ہاتھوں میں پستول لیے، چہرے پر نقاب لگائے، گھوڑوں کو ہوا میں اڑاتے ہوئے، حسین دوشیزاؤں کو آغوش میں لیے ہوئے۔

اس وقت اپنے ساتھی لڑکوں میں گھرے ہوئے اس تصور کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو بہت ہی مغموم اور تنہا محسوس کیا تھا لیکن ٹھیک اس وقت ایک ہشاش بشاش لڑکا اپنے سینے پر کتابوں کا ڈھیر سنبھالے میرا نام لے کر چیختا ہوا آکر مجھ سے لپٹ گیا تھا وہ وقار تھا۔ میں بھی بے طرح اس سے لپٹ گیا تھا۔ اس کے کالے کالے ہونٹوں پر بڑی ہی جوشیلی مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں بڑے ہی طویل انتظار کے بعد کسی کو اچانک پا جانے کی مسرت کا اظہار تھا۔ اس کے چہرے کی سیاہ رنگت کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سورج کی جھلسانے والی کرنوں کو سیاہ گھنے بادلوں نے جذب کر لیا ہے۔ اور سارا ماحول پرسکون ہو گیا ہے۔ وقار نے بڑے ہی دل آویز انداز میں میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا اور مجھے ساتھ لے کر ایک طرف چل دیا۔ اسکول کی باؤنڈری کے ایک کونے میں جہاں آم کا ایک گھنا پیڑ تھا۔ اس پیڑ کے گھنے سائے نے مجھے بڑے ہی شفقت بھرے انداز میں لپٹا لیا۔ پوچھا۔ "کہاں تھے۔ بھول گئے میرے سائے میں بیٹھ کر کتنے پرشور قہقہے لگاتے تھے۔ کیسے حسین خواب دیکھے تھے، اب لوٹ آئے ہو تو آؤ۔ بیٹھو۔"

وقار نے میرے بازو میں چٹکی لی اور مسکرا پڑا۔ کہنے لگا۔ "تیرا خط میں نے

یہاں سب کو پڑھ کر سنایا۔ بدمعاش عشق بازی کر رہا ہے؟ ابھی تیرا دماغ سُدھرا نہیں۔ اب رنگ پور جاؤ صاحبزادے وہاں تمہارا دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" وقار کے لہجے سے لگتا تھا کہ وہ مجھے کچوکے لگانا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی باتیں مجھے بڑی ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا وہ مجھے خوب خوب باتیں سنائے۔ برا بھلا کہے تاکہ میں اس سے ان سارے معرکوں کا ذکر کروں جو میں نے گاؤں میں انجام دیے تھے۔ اس لمحے میں وقار کے سامنے بیٹھے ہوئے اس بات پر کتنا فخر محسوس کر رہا تھا کہ وقار کی طرح میرے سینے پر کتابوں کا بوجھ نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ سمی کے جوان بدن کا لمس ہے۔ جانے میں نے سمی کی بات کہاں سے اور کس طرح شروع کی تھی لیکن جب میں نے بات ختم کی تھی تو مجھے ایسا لگا تھا کہ میں نے اس سے وہ بات ہی نہیں کہی جو کہنی چاہیے تھی۔ جو بات صرف ایک موزوں لفظ میں بیان ہو سکتی تھی۔ اس کو کہہ دینے کے لیے کئی غیر موزوں الفاظ میں نے استعمال کیے تھے اور میرے بیان کا کوئی تاثر ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ تب میں نے اس سے اس آخری رات کا ذکر کیا تھا جب کہ میں نے سنیما کے ایک ہیرو کی طرح اپنی ہیروئن کے گھر کی دیوار پھاندنے کی کوشش کی تھی اور ایک چور کی طرح پکڑا جانے سے بچ گیا تھا تو وقار کی آنکھوں میں مجھے بلا کا خوف نظر آیا تھا۔ وہ کچھ سہم گیا تھا اور اپنی نظریں اوپر اٹھائے وہ آم کے پیڑ کی بلندی کو تک رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے زمین پر رکھی کتابیں اپنے ہاتھوں میں اٹھالی تھیں۔ لیکن ایسے میں میں نے اس سے جب یہ کہا تھا کہ "اب تو میں بھی تیری طرح ڈھیر ساری کتابیں پڑھوں گا اور بہت بڑا آدمی بنوں گا" تو میری اس بات پر اس کی نرم نرم نظریں مجھ پر پڑی تھیں اور وہ مسکرا رہا تھا۔ تب اچانک بڑی ہی اونچی آواز میں وہ بول پڑا تھا۔ "بڑا آدمی۔" وہ زور سے ہنس پڑا۔ "تو اور بڑا آدمی بنے گا؟ تو تو نمبر ایک کا لفنگا ہے۔"

"دیکھ لینا تو۔ سمی نے یہی شرط لگائی ہے کہ جب میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جاؤں گا تب ہی وہ مجھ سے شادی کرے گی۔ سمجھا۔ تو کیا جانے عشق کیا ہوتا ہے۔"

اس نے بڑے ہی پر لطف لہجے میں کہا۔ "واہ رے عشق، بڑا آدمی۔ شادی!"۔ پہلے اب رنگ پور جاؤ۔ تم پر بے بھاؤ کی پڑنے والی ہے وہاں۔ اور چھٹی کا دودھ یاد

آئے گا تم کو وہاں ۔ لفنگے پن میں تو تم کو ایک کی جگہ دس مل جائیں گے ۔ تجھے معلوم ہے دن دہاڑے ڈاکے اور خون ہوتے ہیں وہاں ۔"

"میں ان سب کو سدھار دوں گا ۔" میں نے ہیرو کا پوز بنا کر کہا ۔ اور اپنی جیب سے ایک سگریٹ نکال کر جلانے لگا ۔ لیکن اچانک پتہ نہیں کیوں وہ ایک بے ہنگم سا تصور مجھے بے حد ناخوشگوار سا لگا ۔ جی میں ایک خواہش جاگی کہ کیوں نہ میں اپنے اس پرانے اسکول میں وقار کے ساتھ بیٹھ کر پڑھوں ۔ اس کے ساتھ رہوں ۔ خوب ہنسوں بولوں ۔ اس کو جلا جلا کر سمی کو محبت بھرے خطوط لکھوں ۔ اس کے پیار بھرے جواب وقار کو بتاؤں اور فخر محسوس کروں ۔ جی لگا کر محنت کروں ، خوب پڑھوں اور وقار سے آگے نکل جاؤں ۔ سمی کے بارے میں سب کچھ بتا دینے سے پہلے مجھے ایک یقین سا تھا کہ یہ سب کچھ سن کر وقار مجھ پر رشک کرنے لگے گا ، مجھے ایک ہنگامہ خیز شخصیت سمجھنے لگے گا ، لیکن وقار کے کالے کلوٹے ، پرسکون چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا ۔ اس کے چہرے پر تو ایسی باتوں سے کبھی متاثر نہ ہونے والے یقینوں کا استقلال تھا جو اس کی رگوں میں بہنے والے خون کی رفتار کو کبھی تیز یا سست ہونے نہیں دیتا تھا ۔ وقار کے ان مستحکم یقینوں نے مجھ میں کہیں اندر ایک ہلکا سا زخم لگا دیا تھا ۔ میں نے سمی سے رومان لڑا کر اپنی دانست میں ایک بڑا کارنامہ انجام دیا تھا ۔ لیکن اس کی کوئی وقعت وقار کی نظروں میں نہیں تھی ۔ اس نے بڑے ہی سیٹھے لہجے میں کہا "بڑے ہیرو بن رہے ہو میاں ۔ ان ساری باتوں کو بھول جاؤ اور پڑھ لکھ کر اپنے ماں باپ کا نام روشن کرو اور روشن نہ کر سکو تو کم از کم اسے داغدار تو نہ بناؤ ۔" اس کی اس مولویوں جیسی نصیحت پر مجھے غصہ آگیا ۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی ایک بے معنی مسکراہٹ نے مجھے بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا ۔ میں نے ایک پتھر اٹھا کر اوپر پیڑ پر دے مارا ۔ پتھر پتوں سے سنسناتا ہوا گزر کر اسکول کی باؤنڈری کے باہر جا گرا ۔ اس وقت اسکول کی گھنٹی بجی ۔ وقار نے کہا ۔ "چلو ۔ انٹرول ختم ہو گیا ۔" ہم دونوں اسکول بلڈنگ کی طرف چل دیے ۔ وقار نے اپنی کلاس کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے کہا ۔ "رنگ پور سے مجھے خط لکھنا" اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا ۔ "تمہاری سمی کو میرا سلام کہنا ۔" وہ مجھے بار بار پلٹ کر دیکھتا رہا اور کلاس روم میں غائب ہو گیا ۔

اب اسکول کی اس دور تک پھیلی ہوئی باؤنڈری میں سوائے میرے کوئی نہیں تھا۔ میں تنہا کھڑا ہوا اسکول کی اس بڑی بلڈنگ کو گھور رہا تھا۔ سارے بچے اپنی اپنی کلاس میں غائب ہو چکے تھے۔ اس وقت میرا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ آسمان پر سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ فضا میں دور کہیں بلندیوں پر دو تین چیلیں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔ کتنی بے رنگ اور بے رونق فضا تھی۔

"زندگی کے ہر لمحے کو زندگی کی رنگین فضا کیوں نصیب نہیں ہوتی؟ وقت ہمیشہ خوش رنگیوں سے ہو کر کیوں نہیں گزرتا؟" ان سوالات کے جواب میرے پاس کہاں تھے۔ ایک ذہنی تھکاوٹ اور بوجھ کے ساتھ میں ہیڈ ماسٹر کے آفس کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ گیا۔ ورانڈے میں لٹکا ہوا اسکول کا گھنٹا۔ صبح سے شام تک اس گھنٹے کی ضربیں دل پر کیسے گہرے گھاؤ لگاتی ہیں۔ جب گھنٹا بجتا ہے تو گھڑی بھر کے لیے بچوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور پھر کچھ لمحوں بعد معمول پر آجاتی ہیں۔ اور ان کے ذہن کا انتشار گھنٹے کی گونج کے ساتھ فضا میں تیر جاتا ہے۔

کبھی اس گھنٹے کی چوٹ اتنی گہری ہوتی تھی کہ پتہ نہیں کیوں مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ تو زندگی بھر مجھے سنائی دیتی رہے گی۔ وہ بھی اسی طرح۔ اسکول کا گھنٹہ ہی تو ہوتا ہے جو ایک نام نہاد تہذیب کے مارے انسان کو ہمیشہ کے لیے وقت کا غلام بنا دیتا ہے۔ اس وقت اچانک میری نظر اس گھنٹے کے قریب، ورانڈے میں بیٹھے ہوئے اسکول کے بڑے چپراسی پر پڑی۔ کتنی عمر ہو چکی تھی اس کی، وہی ایک گھنٹہ بجاتے ہوئے۔ اس وقت اس کی نظریں پتہ نہیں اس چلچلاتی دھوپ میں کہاں بھٹک رہی تھیں۔ وہ نظریں جن کو زندگی کی ناکام حسرتیں اور نا امیدیاں اپنے شانوں پر لیے ایک ایسی منزل کی طرف چلی جاتی ہیں جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ چپراسی بننے سے پہلے جانے وہ کیا بننا چاہتا تھا۔ جانے کیسی حسین اور خوش رنگ زندگی کا تصور اس کی جوان اور تابناک نظروں کی کرنوں میں دمکتا ہوگا۔ اور جب اس کو چپراسی کا کام مل گیا تو پتہ نہیں کتنی تیزی سے، کتنی عجلت سے اس نے اس تصور کو وہیں زمین میں دفن کر کے اس پر ایک اسٹول رکھ دیا تھا، اس خیال سے کہ جیسے ہی کوئی موقع ہاتھ آجائے اس اسٹول کو ہٹا کر اپنی زندگی کا خزانہ کھود کر باہر نکال لے اور ہنستا گنگناتا، فتحیابی کے

احساس کے ساتھ وہاں سے اپنی طلسماتی زندگی کی طرف چل دے ۔ لیکن ہوا یہ کہ سفید پگڑی بندھے اس کے سر کے اوپر سے وقت گزرتا رہا جس کا اعلان وہ اسکول کا گھنٹہ بجا بجاکر کرتا رہتا ۔ وقت آگے بڑھتا گیا اور اسٹول کے نیچے سے وہ زمین پیچھے سرکتی رہی ۔ اور اب اس کی گونگی، آنکھوں سے ایک خوف ناک یقین چپ چاپ جھانکتا رہتا ہے کہ اب اس کی زندگی کا خزانہ اس کے اسٹول کے نیچے نہیں ہے ۔ اور اب اس خطہء زمین کا کوئی نشان اس کی یادداشت میں نہیں ہے جہاں اس کی زندگی کا خزانہ کبھی دفن تھا ۔

مجھ پر جو اس کی نظر پڑی تو اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا ۔ "کہاں ہو آج کل ؟"

"رنگ پور جارہا ہوں" میں نے کہا ۔

"رنگ پور !! ۔ کیوں ؟ ۔ اچھا" وہ چپ ہو گیا ۔

"میرے بھائی کہاں ہیں ۔" میں نے پوچھا ۔

"اندر ہیں ۔"

تھوڑی دیر میں بھائی صاحب ہیڈ ماسٹر کے آفس سے باہر نکل آئے اور میں ان کے ساتھ اسکول سے باہر نکل آیا ۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ۔ پتہ نہیں وہ چپراسی مجھے دیکھ رہا تھا یا پھر کہیں اس بے رنگ فضا میں کھو گیا تھا ۔

باب (۱۰)

رنگ پور آئے ہوئے مجھے قریب دو مہینے گزر گئے تھے ۔ پہلی بار جب میں رنگ پور کے قریب پہونچ رہا تھا تو پتہ نہیں کیوں ہماری بس ٹھیک اس پہاڑ کی چوٹی پر آکر یکلخت تھوڑی دیر کے لیے رک گئی تھی ۔ جہاں سے اس پہاڑی کے میلے کچیلے دامن میں پھیلی ہوئی نہیں بلکہ سکڑی ہوئی ایک مٹیالے رنگ کی بستی مجھے نظر آئی تھی اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ میرے دل کی دھڑکنیں کچھ دھیمی پڑ گئی ہیں ۔ اس سکڑی سکڑائی بستی کے چھوٹے چھوٹے مٹی اور گھاس پھوس کے مکان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے

کھڑے نظر آئے تھے جیسے انھیں کوئی انجانا سا خوف ہو اور وہ خوف ان گھروں کی مٹی کو کھائے جا رہا ہو۔ پہاڑی سے کچھ ہی دور ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس کے گدلے پانی میں سورج کی شعاعیں بھی کوئی دمک پیدا نہیں کر سکتی تھیں۔ اس جھیل کے کنارے پر دو منہدم شدہ برج نظر آئے تھے، قدیم بُتوں کے ہیولے، جیسے ان کے جبڑے کھلے ہوئے ہوں اور ان کی مٹی کے گر جانے سے جو پتھر بے ترتیب انداز میں نکل آئے تھے، کسی بھیانک شکل کے کھلے ہوئے منہ سے نِکوسے ہوئے دانت نظر آتے تھے۔ اس جھیل سے آگے کچھ دور ایک مسمار شدہ قلعے کے کھنڈر کھڑے تھے جو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کا رونا تو روتے ہی ہوں گے لیکن تمام بستی والوں سے یہ کہتے ہوں گے کہ ہم دراصل ان گنت اور ان کہے مظالم کی اجڑی ہوئی قبریں ہیں۔

ہماری بس جب اس پہاڑ کی چوٹی سے نیچے بڑے ہی پرپیچ راستے سے اتر رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم اب تیزی سے زمین کے اندر اتر رہے ہیں، زمین کے تہہ خانوں میں۔

جہاں آکر بس رکی تھی وہاں سے کچھ دور سرکاری دواخانے کی ایک بد رنگ عمارت تھی، اور اس عمارت سے قریب ہی پولیس کی چوکی تھی۔ پولیس کی چوکی کے اطراف پتھروں کی بنائی ہوئی دیوار تھی۔ ہر چیز نظر کو آگے بڑھنے سے روکتی تھی۔ دل کو دھڑکنے سے منع کرتی تھی۔ اور ایسے میں وہاں مجھے نظر آیا تھا منظور حسین، میرا ہم عمر۔ میرے ہی خاندان کا ایک سپوت۔ وہ بھی اس سال یہاں تعلیم کی غرض سے بھیجا گیا تھا، لیکن میری طرح ایک مخصوص قسم کی سزا بھگتنے کے لیے نہیں، بلکہ تعلیم کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے، کیونکہ اس نے کبھی اسکول یا نظامِ تعلیم سے بغاوت نہیں کی تھی۔ اس کو تو گھرانے کے بزرگوں کو ناراض کرنے کا ایک حق دیا گیا تھا۔ اپنی ہر مرضی کو قیمتی سِکوں میں ڈھالنے کا اسے ایک مخصوص طریقہ سکھایا گیا تھا۔ اور اپنے گھر کی طرح اسکول میں بھی وہ ان سِکوں کو چلانے کا خواہشمند نظر آتا تھا۔ اس کے بدن کی ساری سیاہی کو قیمتی لبادوں میں چھپائے رکھنے کے کئی جتن کیے گئے تھے۔ خاندان بھر کی تاریخ میں سب سے پہلے اس کو تین پہیوں کی سائیکل ملی تھی۔ اس کے بعد سب سے پہلے دو پیڈل والی موٹر گاڑی ملی تھی اور اس سے بار بار یہی کہا گیا تھا کہ

اپنے باپ کی میلوں پھیلی ہوئی زمینات اور کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے باغات کی سیر وہ اس چھوٹی سی موٹر میں بیٹھ کر کرے۔ لیکن اس نے اپنے لیے ایک ترو تازہ گٹھیلے بدن کی چھوٹے قد کی گھوڑی کا بندوبست کر لیا تھا کہ کھیتوں اور باغات کی کھردری زمین پر وہ دندناتا ہوا پھرے گا۔

تین پہیوں کی سائیکل پر وہ اسکول نہیں جا سکا تھا۔

پیڈل والی موٹر پر بھی وہ اسکول نہیں جا سکا تھا۔

اور گھوڑی پر بیٹھ کر اسکول جانے سے اس نے انکار کر دیا تھا۔

زبان بالائی اور مٹھائیوں کے ذائقے سے لت پت رہا کرتی تھی، چھوٹی چھوٹی کتابوں میں لکھے ہوئے بڑے بڑے الفاظ زبان پر آکر جب ان مٹھائیوں کے ذائقہ میں کڑواہٹ پیدا کرنے لگتے تو وہ رونے لگتا۔ آخر ذہنی صلاحیتیں بالائی کی موٹی تہوں کی طرح جمنے لگیں۔ اس کو جو کچھ پڑھایا جاتا وہ بالائی کے کیچڑ میں پھنس کر رہ جاتا۔ بڑی ہی منتوں مرادوں کے بعد جب اس کو اس دلدل سے نکالا گیا تھا تو اس کا بدن اس کے ذہن کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل چکا تھا۔ اس کے باپ کی عنایتوں نے اس کے اسکول کے ٹیچروں کے ہاتھوں میں بڑی ہی نرمی سے چلنے والے قلم تھما دیے تھے۔ وہ ہر سال اگلی کلاس میں داخل کیا جاتا تھا اور ہر سال نئی نئی کتابوں کی خوش رنگیوں میں مگن وہ بنا کتاب کھولے رنگ پور پہونچ گیا تھا۔

مجھے بس میں دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن وہ مسکرا نہیں سکا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے یہاں سزا پانے کے لیے بھیجا گیا ہے اور مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دے تو وہ میرے ارتکاب جرم میں شریک سمجھا جائے گا۔ بس سے اترنے کے بعد میں نے بہت سارے سوال اس سے کیے لیکن جواب میں وہ صرف ہاں یا نہیں کہہ کر مجھے احساس دلاتا رہا کہ وہاں میری کوئی اہمیت نہیں اور میری ایک موہوم سی امید کو کہ منظور حسین تو میرے ساتھ رہے گا، مزہ آئے گا، وہ اپنی روکھی پھیکی ہاں اور نہیں سے کاٹتا رہا۔ اور میں اپنی زخمی امید کو اس خیال کے خول میں محفوظ کرتا رہا کہ وہاں سے کہیں دور ایک حسین و جمیل ہستی سی میری اپنی ہے۔

جب ہم گھر پہونچے تو منظور حسین اپنے کمرے میں اس تیزی سے چلا گیا جیسے

بتانا چاہتا ہے کہ میں اس کے کمرے میں نہیں آسکتا۔ میں شاید اس کے اس رعونت بھرے انداز سے مرعوب ہو چکا تھا اور چپ تھا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس کے لیے دو علٰحدہ ٹیوٹر رکھے گئے ہیں، جو اسے گھر پر پڑھانے آتے ہیں۔ اور ان ٹیوٹروں نے یقین دلایا ہے کہ اس سال وہ اسکول میں اول نمبر پر پاس ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے کوئی ٹیوٹر پڑھانے نہیں آئے گا۔ مجھے خود پڑھنا ہوگا، محنت کرنی ہوگی اور اس اول نمبر پر پاس ہونے والے منظور حسین سے مقابلہ کرنا ہوگا۔

اسکول میں کچھ دن گزارنے کے بعد میں نے پتہ نہیں کیوں منظور حسین کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ مجھ سے الگ الگ رہتا، دور دور رہتا۔ اسکول کو جاتے ہوئے یا اسکول سے آتے ہوئے وہ میرے ساتھ کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے خوبصورت لباس کو دیکھ کر مجھے اس کی برتری کا احساس ہوتا تھا۔ مگر اپنے اس احساس پر میں بہت کڑھتا بھی تھا۔ اس کے سر پر قیمتی ٹوپی ہوتی تھی۔ اس کے بوٹ بھی قیمتی ہوتے تھے اور بڑے ہی چمکیلے۔ اس کی کلائی پر ایک بہت ہی خوبصورت سنہری گھڑی تھی۔ اس کی جیب میں دو خوبصورت فونٹین پن لگے رہتے تھے۔ اور میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی ان ساری چیزوں کو دیکھ کر میرا جی للچاتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ان ساری جگمگاتی چیزوں کے مقابلہ میں میرے ذہن میں بسا ہوا صرف یہ خیال کہ سمی میری ہے، مجھے ایک عجیب سا سکون بخش دیتا اور مجھے منظور حسین کے وجود ہی سے بے خبر کر دیتا۔ میرے دل میں ایک یقین سا ہوتا کہ میں جب پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جاؤں گا اور سمی جیسی حسین دوشیزہ میری ہو جائے گی تو منظور حسین مجھے زیادہ رشک بھری نظروں سے دیکھا کرے گا۔

اسکول کی اس نیم شکستہ عمارت کے نیم تاریک سیلن زدہ کمروں میں بیٹھے ہوئے لڑکے بڑے ہی سہمے سہمے لگتے تھے۔ اور کمرے میں پھیلی ہوئی ٹھنڈک کی وجہ سے شاید ان کے بدن کا خون ان کے چہروں اور دماغوں تک پہونچ نہیں سکتا تھا۔ چہرے زرد زرد لگتے تھے۔ پہلے دن تو میں کلاس کے ایک کونے میں بیٹھا رہا تھا۔ منظور حسین دانستہ طور پر مجھ سے دور بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد مجھے اپنی نیم تاریک کلاس کا وہ گوشہ بھلا لگنے لگا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اکثر مجھے سمی کے گھر کا اصطبل

یاد آیا کرتا تھا، جہاں میں نے اس سے پہلی اور آخری ملاقات کی تھی۔ کچھ دنوں بعد کچھ لڑکے میرے بھی دوست بن گئے۔ منظور حسین کے صرف ایک یا دو دوست تھے۔ اکثر انٹرول میں ان کو اپنے ساتھ لے کر وہ چنے والے یا مٹھائی والے کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ وہ اپنی جیب سے ایک چمکتا ہوا سکہ نکالتا اور بہت سارے چنے اور مٹھائی خرید کر خود کھاتا اور اپنے دوستوں کو کھلایا کرتا۔ ایسے وقت میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک املی کے پیڑ تلے بیٹھ جاتا اور اپنی پچھلی زندگی کے واقعات سنا سنا کر ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کیا کرتا۔ لیکن میں نے کسی سے ابھی سمی کی بات نہیں کہی تھی۔ بلکہ اپنے آپ کو ٹھاکر کا یار غار بتا کر اس کے کارناموں میں اپنے آپ کو شریک بتاتا اور اس بات پر بہت فخر محسوس کرتا رہتا۔ میرے دوست یہ سب کچھ سن کر مجھے بڑی ہی رشک بھری نظروں سے دیکھا کرتے۔ ایسے لمحوں میں منظور حسین کی اہمیت میری نظروں میں صفر کے برابر ہو جاتی۔ اور میں اپنے خیالوں میں یکا و تنہا چل پڑتا۔ رنگ پور آنے کے دو ہفتوں بعد میں نے گاؤں کو اپنی بھابی کے نام خط بھیجا تھا۔ اپنا پیام سمی تک پہونچا دیا تھا۔ لیکن بھابی کے پاس سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ بار بار یہی خیال ستانے لگتا تھا کہ سمی کے بارے میں میں نے بھابی سے جتنی کچھ بات کی تھی شاید ان کو وہ بھلی نہیں لگی تھی اور وہ اسی لیے چپ ہیں۔ ہو سکتا ہے میرا پیغام سمی تک پہونچ ہی نہ سکا ہو۔ کس تڑپ اور بے چینی سے سمی میرے خط کا انتظار کرتی ہوگی۔ کتنے بہانوں سے وہ بھابی سے ملنے آتی ہوگی اور اپنی نظروں میں کتنی ہی امیدیں لیے وہ بھابی کی طرف دیکھتی ہوگی اور بھابی اس سے کچھ نہیں کہتی ہوں گی۔ چند دنوں بعد میں نے پھر ایک خط بھابی کے نام لکھا۔ میں نے اس بار ان کو لکھا کہ میں بہت ہی جی لگا کر پڑھ رہا ہوں اور خوب محنت کر رہا ہوں، اب کے امتحان میں اول آؤں گا اور بھی بہت ساری باتیں لکھی تھیں کہ رنگ پور بڑا ہی بدمزہ مقام ہے۔ یہاں کے لوگ اچھے تو ہوں گے لیکن اچھے نہیں لگتے، ان سب سے دور رہنے کو جی چاہتا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ یہ ساری باتیں بھابی سمی کو بتا دیں گی۔ اور وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے یہ سب کچھ صرف اسی کے لیے لکھا ہے۔ اس بار کچھ دنوں کے انتظار کے بعد میرے پاس سمی کا خط آ گیا۔ ایک مختصر سا خط۔ بڑے ہی ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں لکھا

ہوا اور ایک لڑکے کے قلم سے لکھا ہوا۔ جیسے میرے گاؤں کے ایک دوست نے لکھا ہے۔

جواب چونکہ گھر کے پتے پر آیا تھا، پہلے تو وہ بھائی صاحب کے پاس گیا۔ اس کے بعد وہ خط کسی طرح منظور حسین نے دیکھ لیا اور پڑھنے لگا اور میری طرف جلی کٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس بات پر کہ میرے نام کسی دوست کا خط آیا ہے وہ جل بھن رہا تھا۔ مجھے بار بار مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے اچھی طرح وہ خط پڑھ لیا تب بھی اس نے وہ خط میرے حوالے نہیں کیا۔ مجھ سے باز پرس شروع کر دی کہ وہ خط لکھنے والا کون لڑکا ہے؟ کس کا بیٹا ہے؟ کہاں پڑھتا ہے؟ اور اتنی رفاقت اور دوستی جتا کر خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے ان بے جا سوالات نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی لیکن میرے دل میں بیٹھا ہوا چور مجھے اپنے غصے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں نے بات ٹالنے کے انداز میں اس کے سوالات کے کچھ یونہی سے جوابات دے دیے لیکن وہ میرے ایک حریف کی طرح ڈٹا رہا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔

" اگر تم نے میری باتوں کا صاف صاف جواب نہیں دیا تو میں وہ خط پھاڑ کر پھینک دوں گا۔

اس کی اس بات پر میرے صبر و ضبط کا بند ٹوٹ گیا، میں نے اس سے کہہ دیا۔

" تم کو ان ساری باتوں سے کیا مطلب، خط میرے نام ہے مجھے دیدو"۔

" نہیں دیتا۔ جو چاہو سو کر لو۔" وہ مڑ کر جانے لگا۔

جی چاہتا تھا کہ اچک کر اس کا گریبان پکڑ لوں۔ ایک پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں۔ لیکن یہ اندیشہ کہ کہیں وہ سچ مچ ہی خط پھاڑ کر نہ پھینک دے میں نے اس سے کہا۔ " اچھا۔ ٹھہرو۔ پوچھو کیا پوچھتے ہو۔"

تب اس نے پلٹ کر کہا۔ " تو بتاؤ۔ کس کا خط ہے؟"

" یہ خط میرے ایک دوست کا ہے۔ وہ ایک بہت ہی غریب لڑکا ہے۔ اس بار جب میں گاؤں سے یہاں آ رہا تھا تو ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ ہم خطوط لکھیں گے۔

" کیوں؟" اس نے اپنی ضد جاری رکھی۔

میں نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

"کیوں؟" اس نے پھر ایک سوئی چبھوئی۔

"اس لیے کہ ہم دونوں گاؤں میں ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ ایک ساتھ گھومتے تھے۔"

"وہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ سبھی لڑکے اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتے ہیں، ساتھ کھیلتے ہیں لیکن ہر لڑکا تو خط نہیں لکھتا۔"

اس بار میں نے اپنے جلتے ہوئے خون میں ایک شدت محسوس کی تھی۔ قریب تھا کہ میں اس پر پل پڑتا لیکن خط کے ضائع ہو جانے کا مجھے یقین تھا۔ میں نے پھر بڑے ہی ٹھنڈے لہجے میں بات کی۔

"بھئی بات دراصل یہ ہے کہ وہ لڑکا مجھے بہت پسند کرتا ہے۔ اس لیے اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ مجھے خط لکھے۔ میں اس کا جواب دوں۔ بھئی یہ تو اپنی اپنی پسند کی بات ہے، اپنا اپنا معاملہ ہے"۔

اس بار منظور حسین نے بڑے ہی معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہ سب جھوٹ ہے اس خط کے پیچھے ضرور کوئی بھید ہے۔ اچھا، یہ لو تمہارا خط۔ لیکن ایک نہ ایک دن میں یہ بھید معلوم کر کے رہوں گا۔" اس نے کچھ غصے سے وہ خط میری طرف پھینک دیا۔ اور وہاں سے چل دیا۔ میں نے تیزی سے وہ خط اٹھالیا اور پڑھنے لگا۔ لیکن ابھی میں نے اس مختصر خط کے پہلے دو تین ٹیڑھے میڑھے الفاظ ہی پڑھے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ ان الفاظ کی پھیلی ہوئی روشنائی میں بلا کا پیار ہے۔ درد ہے۔ سوز ہے۔ میرے جلے بھنے دل و دماغ پر اس پیار بھرے درد نے ایک ایسی ضرب لگائی کہ اپنے آپ کو میں نے بے حد مظلوم، مجبور اور لاچار پایا۔ میں وہ خط آگے پڑھ نہیں سکا۔ دھیرے دھیرے منظور حسین کی نظر بچا کر میں گھر سے باہر نکل گیا اور سیدھے اس پہاڑ کی طرف چل دیا جہاں میں اپنے آپ کو بالکل تنہا پا سکتا تھا۔ گاؤں سے کچھ دور پہاڑی کے دامن میں گھنا جنگل تھا۔ پھر اس جنگل میں ایک چھوٹا سا جھرنا تھا۔ میں جھرنے کے پاس ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھ گیا۔ چٹان پر ایک گھنے پیڑ کا سایہ تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس ہرے بھرے جنگل میں، میں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا پاکر بڑا ہی سکون محسوس کیا۔ اس تنہائی کے احساس میں عجیب سی

لذت تھی ۔ ان دھڑکنوں کی لذت جو دل کو صحیح معنی میں زندگی کا سرچشمہ بنا دیتی ہیں
میری جیب میں آج ایک انوکھی شئے رکھی تھی ۔ میری زندگی کا پہلا خط تھا جو کسی لڑکی
نے مجھے لکھا تھا ۔ اپنا پیار جتایا تھا ۔ میں نے بڑے ہی سکون اور اطمینان کا سانس لیا اور
جیب سے وہ خط نکال کر پڑھنے لگا ۔

میرے عزیز دوست ۔ سلام ۔

تمہارا پیام مجھے مل گیا تھا ۔ میں کتنا خوش تھا ، بہت بہت
خوش ۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ تم بہت ہی جی لگا کر پڑھ رہے ہو ۔ میری
دعا ہے کہ تم خوب پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ ۔ اور جب بڑے
آدمی بن جاؤ تو مجھ جیسے چھوٹے دوست کو نہیں بھولنا ۔ تمہارے
جانے کے بعد تو کچھ دِنوں کے لیے میں نے کچھ کھیلنا ہی چھوڑ دیا ۔
سب دوست کھیلتے رہتے اور میں چپ بیٹھا رہتا ۔ گلی ڈنڈے میں تو
اب کوئی مزہ ہی نہیں رہا ۔ ایک دو بار چاندنی رات میں آنکھ مچولی
کھیلی ، لیکن کہیں چھپنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا ۔ کسی کے پیچھے بھاگنے
اور شور مچانے میں کوئی لطف ہی نہیں آتا تھا ۔ میں بھی اپنے بابا سے
کہنے والا ہوں کہ وہ مجھے بھی ضلع کے اسکول میں پڑھنے کے لیے بھیج
دیں ۔ میں بھی خوب پڑھنا چاہتا ہوں ۔ اگلی چھٹیوں میں یہاں ضرور
آنا ۔ خوب خوب کھیلیں گے ۔ کھیل کھیل کر نڈھال ہو جائیں گے ۔
جواب ضرور دینا ۔ سب دوست سلام کہتے ہیں ۔

میرے دوست ، تمہارا دوست

رفیق

میں نے وہ خط دوبارہ پڑھا ۔ پھر جہاں نظر پڑ گئی ، وہیں سے پڑھ لیا ۔ پھر ان
جملوں کو بار بار پڑھا جس میں گلی ڈنڈے کا ذکر تھا ۔ جس میں چھپنے چھپانے کا ذکر تھا ۔
پیچھے پیچھے بھاگنے کا ذکر تھا اور اس جملے سے تو میری نظر ہٹتی ہی نہیں تھی ۔ " اگلی

چھٹیوں میں ضرور آنا۔ خوب خوب کھیلیں گے، کھیل کھیل کر نڈھال ہو جائیں گے۔"

خط سے نظر ہٹا کر میں نے جھرنے کی طرف دیکھا۔ جھرنے کے پانی میں موتیوں جیسی چمک تھی۔ بالکل سمی کے موتی جیسے دانتوں کی سی۔ جھرنے کے شفاف پانی میں سمی کے حسین چہرے کا عکس تھا۔ وہ شرارت کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ "گلی ڈنڈا۔ گلی ڈنڈا۔" وہ کھکھلا کر ہنس رہی تھی۔ پانی کی چمک ہر طرف پھیل گئی تھی اور وہ ہرا بھرا جنگل ہر طرف روشن ہو گیا تھا۔ کسی پیڑ پر بیٹھا ایک پنچھی چہچہانے لگا۔ "گلی ڈنڈا۔ گلی ڈنڈا۔"

سمی کتنی شریر ہے۔ شوخ ہے۔ کیا سب محبت بھرے خطوط ایسے ہی ہوتے ہیں؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت کرنے والے اپنے خطوط میں جدائی کا رونا روتے ہیں۔ آہیں بھرتے ہیں۔ ہائے ہائے کرتے ہیں۔ لیکن یہاں تو سمی میرے ساتھ کھیلنے کے لیے کھلے میدانوں میں نکل گئی تھی۔ ہنستے کھلاتے میرا پیچھا کر رہی تھی۔ بڑے ہی چاؤ سے میں نے وہ خط اپنی جیب میں رکھ لیا۔ چٹان سے نیچے چھلانگ لگادی اور جنگل کے ناہموار راستے پر کودتا پھاندتا گاؤں کو جانے والی سڑک پر چلا آیا۔

میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا، بڑا ہی مسرور و شاداں، اپنے آپ سے بے خبر۔ یکبارگی میری نظر اس سر منڈھی پہاڑی پر پڑ گئی جہاں سے رنگ پور آنے والی بس نیچے اترتی تھی۔ اس پہاڑی کی چندیا دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس کی چکنی چکنی چندیا کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ جیسے گاؤں کا موٹا بنیا سر منڈھائے بیٹھا ہو جس کو ہم چکنوٹ کہتے تھے۔ جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے وہ ٹوٹے پھوٹے برج نظر آئے جو آج بھوت جیسے نہیں لگ رہے تھے۔ بلکہ اپنی جٹائیں اور ڈاڑھی بڑھائے ہوئے سادھو لگ رہے تھے۔ رنگ پور کے مٹیالے رنگ کے وہ گھر جو کسی انجانے خوف سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نظر آتے تھے، آج ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں تو جیسے ایک دوسرے ہی رنگ پور کی طرف جا رہا تھا۔ میری سانسوں میں جانے کتنی خوشیاں الجھی الجھی سی تھیں۔ کتنے ہی ایسے خیالات جن پر ابھی الفاظ کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ کتنے ہی جذبات جو کسی بھی زبان کی بندشوں سے آزاد تھے، میرے دل و دماغ میں ایک شور برپا کیے ہوئے تھے۔ میں اس شور و غل میں آگے بڑھ

رہا تھا۔ اپنے ساتھ نئی نئی مسرتوں کا نئی نئی امنگوں کا ایک جلوس لیے۔ میرے اندر ایک نئی قوت جاگ رہی تھی، نئے حوصلوں نے مورچے سنبھال لیے تھے۔ "مجھے یہاں سے آگے بڑھنا ہے۔ بہت آگے ...... زندگی کی محبوس اور مقید مسرتوں کو آزاد کرانا ہے۔ غنیم پر یلغار کرنا ہے۔ میرے اندر ہی اندر جیسے کوئی زور سے چیخ پڑا۔ "یلغار۔" لیکن میرے سامنے کوئی غنیم نہیں تھا۔ کوئی دشمن نہیں تھا۔ میرے سامنے وہی مٹیالے رنگ کا خوفزدہ سہما سہما گاؤں تھا۔ جس کا نام رنگ پور تھا۔ جوں جوں میں رنگ پور کے مٹیالے گھروں کے قریب جارہا تھا، میری سانسوں میں پھر رنگ پور کی مٹی کی جی اکتا دینے والی بو بسنے لگ گئی تھی۔ یہ کمزور دیواریں دراصل کتنی مضبوط ہیں۔ اور یہ رنگ پور کتنا بڑا جیل خانہ ہے!" میری رفتار دھیمی پڑ گئی۔ میری تیز و تند سانسوں میں ٹھہراؤ سا آنے لگا۔ اور ایک آزاد فضا میں اڑنے والے ان سارے خیالات پر الفاظ کے سائے پڑنے لگے۔ ان پر الفاظ کے کالے کالے بادل منڈلانے لگے۔ الفاظ کی سیاہیوں میں خیالات کے رنگ مدغم ہونے لگے۔ ان رنگ برنگ خیالات نے الفاظ میں ڈھل کر کیسی بھدی اور بے ہنگم شکلیں اختیار کر لی تھیں۔ وہ شکلیں مجھ سے بہت قریب آگئیں تھیں بالکل قریب۔ میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ یہ شکلیں تھیں جبار کی قیوم کی۔ ٹھاکر کی۔ اور منظور حسین کی۔

"یہ بھدی شکلیں میرا پیچھا کیوں کر رہی تھیں۔ یہ شکلیں میرے ذہن سے کیوں چپک گئی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر کیسی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ان کی آنکھوں میں شکست کا احساس تھا۔ مجروح جذبات سے رسنے والا خون تھا۔ یہ شکلیں کیسے مجھ سے لگی لگی میرا پیچھا کر رہی تھیں کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں سمی کی طرف۔ پڑھائی کی طرف۔ بڑا آدمی بننے کی آرزو کے پیچھے۔ یہ شکلیں میرا پیچھا کر رہی تھیں لیکن آج کوئی آہٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔ ان کے پاؤں نہیں تھے۔ ان کے ہاتھ نہیں تھے۔ دھڑ نہیں تھے۔ صرف چہرے تھے ہوا میں معلق چہرے۔ میں چاہتا تھا وہ سارے چہرے میرے ذہن سے نکل جائیں، میں چاہتا تھا میرے ذہن میں لبے ہوئے سارے گاؤں ساری بستیاں پل بھر میں تباہ و تاراج ہو جائیں۔ ان کا کہیں کوئی نشان باقی نہ رہے۔ اور پھر اس فضا میں ایک نیا ذہن تعمیر ہو، جیسے میری زندگی نے ایک نیا جنم لیا ہو۔

جس میں چاروں طرف نیچے اوپر ذہن و نظر کے لیے کوئی حد مقرر نہ ہو۔ ان کی کوئی سرحد نہ ہو۔ لیکن وہ ہوا میں معلق چہرے میرے پیچھے تھے، بالکل قریب تھے اپنی نظروں کے جال میں مجھے پھنسائے ہوئے، چپ چاپ۔ اور میرے دل کی دھڑکنوں سے لگا ہوا سمی کا خط تھا۔ "میری دلی دعا ہے کہ خوب پڑھ لکھ کر تم بڑے آدمی بن جاؤ .... وہ ہوا میں معلق چہرے میرے پیچھے تھے۔ مجھ سے بہت قریب۔ مجھ سے لگے لگے چل رہے تھے" اور میں؟۔ اور میں؟ میں بڑا آدمی بنوں گا۔ سمی میری ہے۔ میں بڑا آدمی بنوں گا۔ سمی میری ہے..... میں بڑا آدمی بنوں گا..... سمی..... بڑا آدمی..... بڑا آدمی ...... بڑا..... سمی..... سمی..... اچانک ایک شور سنائی دیا۔ انسانوں کی چیخیں۔ میرے قریب..... پکڑو۔ پکڑو۔ وہ بھاگ رہا ہے..... پکڑو..... وہ خونی ہے۔ خونی ہے..... پکڑو..... میں نے دیکھا سڑک پر میرے سامنے ایک لمبا تڑنگا آدمی میری طرف دوڑتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر بندوق ہے۔ وہ اکیلا ہے۔ وہ مجھ سے بہت قریب آگیا ہے۔ اس کے چہرے پر بلا کی وحشت ہے۔ اس کی سانسیں اس کے قابو میں نہیں ہیں۔ وہ میرے مقابل آگیا ہے۔ بالکل سامنے، اپنی بندوق کو ایک ہاتھ سے پکڑا ہوا ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ وہ جتنا بھی تیز بھاگنا چاہتا ہے شاید اتنے ہی اس کے ہاتھ پاؤں بھاری ہونے لگے ہیں۔ وہ میرے قریب سے گزر گیا۔ جیسے وہ مجھ سے بالکل بے خبر تھا۔ اس نے میری طرف ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا وہ اپنے بھاری بھاری قدموں سے تیز بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے کا شور اور بڑھ رہا تھا۔ پکڑو...... بھاگو..... تقریباً چالیس پچاس آدمی ایک ساتھ اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ لیکن ان کی رفتار تیز نہیں تھی۔ ان کے بھاگنے کا انداز بتا رہا تھا جیسے ان کے پیروں کو زمین بڑی ہی تیزی سے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ان کے ہاتھ اس طرح ہل رہے تھے جیسے ان کے سامنے کئی مکڑیوں کے جالے ہوا میں لٹکے ہوئے ان کا راستہ روک رہے ہیں۔ ان کی نظروں میں دور سامنے دوڑنے والے شخص کے کندھے پر لگی بندوق کی نالی تھی، جس سے گولی نکل سکتی تھی۔ وہ اپنے بھاری قدموں سے بھاگ رہا تھا۔ اور اس کا پیچھا کرنے والے وہ چالیس پچاس آدمی اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے بار بار ان کو وہ مکڑی کے جالے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ میں سڑک سے

پرے کھڑا ہو گیا۔ ان چالیس پچاس بھاگنے والے آدمیوں کا جتھا اچانک میرے قریب آکر رک گیا۔ ان میں سے کوئی زور سے چیخ پڑا۔ "ارے وہ پلٹ کر بندوق چلا رہا ہے۔ ہٹ جاؤ۔" اس چیخ کے ساتھ ہی سارا جتھا پل بھر میں تتر بتر ہو گیا۔ جتھے کے لوگ ہر طرف بکھر گئے۔ میں بھی کچھ لوگوں کے ساتھ بستی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر ہم سب نے مڑکر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہ خونی شخص بندوق تانے سڑک پر تنہا کھڑا تھا۔ ادھر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کی طرف بڑھے۔ ساری فضا میں ایک وحشت طاری تھی۔ سب کے ہونٹ بند تھے۔ سب اسی شخص کو گھور رہے تھے۔ وہ اپنی بندوق تانے الٹے پاؤں پیچھے جا رہا تھا۔ اسی طرح وہ پیچھے ہٹتا گیا۔ اور ایک مقام پر پہونچ کر بڑی ہی تیزی سے سڑک کی ایک طرف اتر گیا۔ اور تیزی سے اس جنگل کی طرف بھاگ گیا جدھر سے کچھ دیر پہلے میں لوٹا تھا۔ گھڑی بھر میں وہ سب کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب وہ سب لوگ زور زور سے کہہ رہے تھے۔ "ارے وہ جنگل میں بھاگ گیا، اب اس کا ملنا مشکل ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے "نہیں۔ چلو جنگل کے اطراف گھیرا ڈالتے ہیں۔ کدھر بھاگے گا بدمعاش۔" کسی نے کہا۔ "کوئی فائدہ نہیں۔ وہ قانون سے تو بچ نہیں سکتا۔ ہم پکڑ بھی لیں تو کیا کریں گے، قانون ہی کے حوالے کر دیں گے۔" یہ ساری باتیں میں بہت غور سے سن رہا تھا۔ لیکن کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں خاموش خاموش سب کا منہ تک رہا تھا۔ لیکن اس وقت اس مجمع میں میرے اسکول کا ایک لڑکا نظر آگیا۔ اس کے پاس جاکر میں نے پوچھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ لڑکے نے میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر بڑے ہی بزرگانہ انداز میں کہنے لگا۔

"تم نہیں جانتے بڑے خانصاحب کا خون ہو گیا ہے۔ اس حرامی نے ان کا خون کیا ہے، جو ابھی ابھی جنگل کی طرف بھاگا ہے۔ معلوم ہے بالکل تین فیٹ کے فاصلے سے گولی چلادی اس نے۔ خانصاحب کا سینہ پھٹ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ جانتے ہو یہ خونی دراصل عرب خاندان کا آدمی ہے۔"

میں جب یہ باتیں سن رہا تھا تو میں اس لڑکے کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بڑی ہی سہمی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا۔ "لیکن اس نے ان کا خون

کیوں کیا؟"

"دشمنی تھی۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"دشمنی؟ کس بات کی دشمنی؟"

اس لڑکے کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ پھر کچھ دیر وہ میری صورت تکتا رہا۔ پھر ادھر ادھر لوگوں کو دیکھا اور میری طرف تھوڑا سا جھک کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔ "اس حرامی خونی کی ایک بیوہ بہن ہے۔ بڑے خانصاحب راتوں کو اس کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ کل رات اس نے دیکھ لیا، لیکن خانصاحب بھاگ نکلے۔ مگر آج سالے نے خانصاحب کا فیصلہ کر دیا۔" یہ کہہ کر وہ جنگل کی طرف دور دیکھنے لگا۔

اچانک مجھے یاد آگیا۔ بڑے خانصاحب کو میں نے ایک بار دیکھا تھا۔ دو گھوڑوں کی بگھی میں بیٹھے ہوئے۔ ٹھاٹھ کی بگھی تھی۔ دو اونچے پورے سیاہ چمکدار گھوڑے۔ کوچوان زرد زرد سا لباس پہنا ہوا۔ جب بگھی مجھ سے قریب آئی تھی تو میں نے بڑے ہی اشتیاق سے ان کو دیکھا تھا۔ کیسا بھاری بھرکم جسم تھا ان کا۔ ناک نقشہ کتنا سیدھا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور چمکدار۔ گال سرخ اور پھولے ہوئے۔ سنہرے بال، سنہری مونچھیں۔ بگھی میں بیٹھے کس تمکنت کے ساتھ راہ چلتے لوگوں کا سلام لے رہے تھے، جیسے سارے رنگ پور کے راجہ ہوں۔ سنا تھا بہت سارے باغات کے مالک ہیں، ڈیڑھ دو سو ایکڑ زمین ہے ان کی۔ اور کتنے ہی سرکاری افسران کی مٹھی میں ہیں۔ گھر کیا تھا خاصی لمبی چوڑی حویلی تھی۔ آئے دن سرکاری افسروں کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ شہر سے بھی بڑے بڑے لوگ ان کی دعوتیں کھانے کے لیے رنگ پور آتے تھے۔ ان دعوتوں کے ساتھ بڑی ہی دھوم دھام کے مجرے ہوتے تھے۔ دور دور سے طایفے آتے تھے، اور رنگ پور کی میلی گدلی فضا میں نئے رنگ بکھیر کر چلے جاتے۔ وہ حویلی تو اپسراؤں کا بسیرا لگتی تھی۔ لیکن۔ لیکن ...... اس عرب خاندان کی بیوہ عورت میں خانصاحب کو آخر کونسی انوکھی بات نظر آئی ہوگی کہ دنیا بھر کے عیش میسر ہونے پر بھی اس کے گھر چلے گئے۔ اور آج جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کچھ ایسا ہی سوال تھا جو میرا ذہن مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس لڑکے سے بھی یہی سوال پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے موقع نہیں مل سکا تھا۔ ہمارے قریب کچھ اور لوگ جمع

ہو گئے تھے اور اس موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

"بات یہ نہیں ہو گی جی، اس خون کے پیچھے کوئی اور ہی راز ہو گا۔"

"نہیں نہیں قصور خانصاحب ہی کا تھا۔جی ہی آگیا تھا اس عورت پر تو نکاح پڑھوا لیتے۔آخر بیوہ ہی تو تھی۔"

"ارے یہ بیوہ وغیرہ کا چکر نہیں ہے۔اس خون میں سرکار کا ہاتھ ہے۔"

سرکار کا نام سن کر سب کے سب کچھ رک سے گئے۔ کسی نے کہا۔ "بھگوان جانے" کسی نے کہا "خدا جانے"۔ کسی نے کہا۔ بھئی خانصاحب بیکار مارے گئے۔ لیکن یہ حرامی بچے گا نہیں۔ کل ضرور پھانسی چڑھے گا۔ دیکھ لینا۔" ایسی ہی باتیں کرتے ہوئے لوگ وہاں سے کھسکنے لگے۔اور تھوڑی دیر بعد سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ سب جا چکے تھے۔میرے ذہن پر خانصاحب کی بگھی، ان کی وجیح شخصیت، ان کے پھٹے ہوئے سینے سے ابلتا ہوا خون۔ وہ اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ بھاگنے والا وحشت زدہ خونی۔اور اس کا پیچھا کرنے والے لوگ۔سب کے سب اس طرح چھا گئے تھے کہ اب کسی دوسرے خیال کی گنجائش ہی نہیں تھی۔میرے دماغ میں کہیں کوئی خالی جگہ ہی نہیں تھی جہاں میں سمی کے خط کو محفوظ رکھ سکتا۔یا تو میں تھوڑی دیر پہلے رنگ پور پر دھاوا بولنے والا تھا۔رنگ پور کے مظلوم در و دیوار پر یلغار کرنے والا تھا یا تو اب یہ حالت تھی کہ ایک چوہے کی طرح دبے دبے کچھ راستے سے ہٹ کر، دھیرے دھیرے گھر کی طرف جا رہا تھا۔گھر پر سبھی لوگ خانصاحب کے قتل کے بارے میں بات کر رہے تھے۔میں سیدھے اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔چاہتا تو یہ تھا کہ سمی کے خط کے ایک ایک لفظ پر غور کروں۔سمی کے ساتھ گزرے ہوئے حسین لمحات کا ان الفاظ سے مقابلہ کروں۔ان الفاظ میں بھی وہی رنگت تھی جو ان حسین لمحوں میں تھی۔وہی لمحات تو عبارت بن گئے تھے۔لیکن میں جس پر لطف انداز میں ان لمحوں کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا، دماغ اس کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ان الفاظ اور ان لمحات کے درمیان خانصاحب کے سینے سے ابلتا ہوا خون تھا۔خون؟خونی؟ کیسے بھیانک قسم کے الفاظ ہیں۔الفاظ بھی خون میں لت پت۔یہ خون کیوں ہوتے ہیں؟ کیا واقعی رنگ پور خونیوں کا اڈا ہے۔میں نے جو کچھ سنا تھا وہ اپنی آنکھوں سے آج دیکھ

رہا تھا۔ خانصاحب کے خون کے سارے واقعات ایک سرد بوجھ بن کر میرے سارے ذہن پر چھا گئے تھے۔ سمی کے خیال کی گرمی اپنے اندر جذب کر گئے تھے۔ میں اس وقت اپنے آپ کو بڑا ہی مجبور اور مغموم محسوس کر رہا تھا۔

یونہی دو دن گزر گئے۔ پتہ نہیں کیوں خانصاحب کے خون کے واقعہ سے میرے ذہن نے اتنا گہرا اثر قبول کیا تھا۔ وہ دو دن بڑی ہی بے کیفی اور بڑی ہی بیکسی کے عالم میں گزرے تھے۔ لگتا تھا رنگ پور میں میرا اپنا کوئی نہیں۔ میں بالکل یکا و تنہا ہوں۔ ایک عجیب بے معنی سی بے چینی محسوس ہوتی تھی۔ کئی بار سوچا کہ پیار و محبت سے بھرپور جواب لکھوں سمی کو۔ لیکن جواب لکھ نہیں پاتا تھا۔ ذہن ادھر راغب ہی نہیں ہوتا۔ سمی سے بڑی دوری محسوس ہونے لگی تھی۔ جانے کیا بات تھی بار بار ذہن میں یہی خیال سر اٹھانے لگا تھا کہ سمی کو بھول جانا چاہیے۔ سمی سے بے خبر ہو جانا چاہیے۔ سمی ایک بہت بڑا جال ہے، دھوکہ ہے۔ سمی ہی نے مجھ سے میری ہمتیں چھین لی ہیں۔ میری آزادی چھین لی ہے۔ مجھے مجبوریوں اور ذمہ داریوں کے دلدل میں پھنسا دیا ہے۔ میں ان خیالات سے بھی دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میری نظروں کے سامنے اب صرف ایک ہی راستہ تھا۔ اس سے پہلے کہ رنگ پور کا خونخوار ماحول میری رہی سہی ہمتیں بھی چھین لے میں نے رنگ پور چھوڑ دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور ایک موزوں موقع کا انتظار کرنے لگا۔ بڑی ہی بددلی کے ساتھ کچھ دن اور گزار لیے، لیکن اچانک ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آگیا۔ بلکہ اسے میں ایک حادثہ کہوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ وہ حادثہ تھا جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا تھا۔ ان دنوں رنگ پور میں ایک تھیٹریکل کمپنی آگئی۔ میں نے ایک دن سڑک پر ایک بڑا ہی دلفریب اور بڑا ہی جاذب نظر منظر دیکھا۔ میرے ساتھ کتنے ہی لوگ اس منظر کو دیکھ رہے تھے، اس منظر کو دیکھتے ہوئے ان سب کے چہرے روشن روشن سے لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

ایک چھوٹا موٹا جلوس سا تھا۔ سامنے بینڈ باجے والے چل رہے تھے اور وہ جو دھن بجا رہے تھے وہ بڑی ہی دل لبھانے والی تھی۔ ایک دیوانہ اپنے لمبے لمبے بال بکھرائے، اپنے چہرے اور سر پر راستے کی خاک اڑاتے ہوئے اور بار بار اپنے کپڑوں کو

چاک کرتے ہوئے اسی دھن میں گاتا جارہا تھا۔ "خاک ہے منہ پہ ملی حال فقیرانہ ہے۔"
اور بینڈ پر زور کی تھاپ پڑتی تو وہ دیوانہ جھک کر راستے سے خاک اٹھالیتا اور اپنے سر
پر اڑاتا ہوا چیختا۔ "لیلیٰ۔" تو اس کو دیکھنے والے لوگ باگ کھکھلا کر ہنس پڑتے
جیسے جی کھول کر ہنس لینے کے لیے ان سب کو اسی دیوانے کا انتظار تھا۔ رنگ پور کی وہ
گلیاں لیلیٰ کی گلیاں بن گئیں اور رنگ پور نجد بن گیا۔ لیکن جب وہ سڑک چھاپ
مجنوں بینڈ باجے کے ساتھ گاتا چیختا آگے بڑھ گیا تو میں نے دیکھا کہ اس مختصر سے جلوس
کے پیچھے چرخ چوں چرخ چوں کرتی ہوئی ایک موٹر گاڑی بھی تھی جس کی چھت پر
ایک لیلیٰ بیٹھی ہوئی تھی جس کے پیروں کو موٹر کی چھت سے اس طرح باندھ دیا گیا تھا
کہ وہ پھسل کر نیچے نہ آجائے اور کوئی اسے شرارتاً نیچے نہ کھینچ سکے۔ وہ مسلسل
مسکرائے جارہی تھی اور بڑے ہی پرفریب انداز میں ناٹک کی پرچیاں تقسیم کر رہی
تھی۔ موٹر کے ساتھ بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کا ایک ہجوم دوڑ رہا تھا۔ چوراہے پر
آکر وہ موٹر رک گئی تو بینڈ والوں نے زور زور سے بینڈ بجانا شروع کر دیا۔ اور وہ
مجنوں، لیلیٰ کی طرف دیکھ کر چیخ پڑا۔ "لیلیٰ"۔ تو لیلیٰ نے فضا میں ان گنت رنگ برنگی
پرچیاں اچھال دیں۔ لوگ پرچیوں پر جھپٹ پڑے۔ میں سڑک کے کنارے کھڑا ہوا یہ
تماشہ دیکھ رہا تھا، لیکن بار بار میری نظریں لیلیٰ کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس کی بھولی
بھالی شکل، اس کا جوان متناسب بدن اور اس کی بکھری بکھری نظریں مجھے مجبور کر رہی
تھیں کہ میں بالکل الگ تھلگ کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہوں۔ میری نظروں کی یہی
کوشش تھی کہ کسی ایک نقطے پر اس کی نظروں سے ٹکرا جائیں۔ کچھ ایسا ہی ہوا۔ نہ
صرف اس نے میری طرف دیکھا بلکہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے ایک ہی نظر میں
میری نظروں کی گہرائیوں کو تک دیکھ لیا ہے جیسے اس ہجوم میں، میں ہی تو ایک ہوں
جس کو وہ بہ نظر خاص دیکھ سکتی ہے۔ گھڑی بھر کے لیے مجھ پر آکر ٹھہر جانے والی اس کی
نظروں نے مجھ سے وعدہ بھی لے لیا کہ آج رات میں اس کا تماشہ دیکھنے کے لیے ضرور
آؤں گا۔

باب (۱۱)

وہ رات میرے لیے رنگ و نور میں نہائی ہوئی ایک رات تھی۔ اس رات میں تھیٹر میں تھا۔ اسٹیج کے بالکل قریب پہلی قطار میں۔ یہ سرکاری افسروں کو دیئے گئے اعزازی پاس والوں کی قطار تھی۔ میں بڑی ہی تمکنت کے ساتھ پہلی قطار میں ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری کرسی پر منظور حسین بیٹھا تھا اور اپنی اکڑ فوں بتا رہا تھا لیکن ہم ایک دوسرے کو نظرانداز کیے ہوئے تھے۔

سارا تھیٹر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کچھ عجیب سا ہلکا ہلکا شور تھا۔ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ تھیٹر کے باہر بینڈ باجا بج رہا تھا۔ لوگ تھیٹر کے اندر چلے آ رہے تھے۔ اپنی اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ گرما گرم چائے اور سگریٹ بیڑی بیچنے والوں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ رنگ پور جیسے مقام کی بدرنگ فضا میں لتنے سارے رنگ کیسے بکھر گئے تھے۔ رنگ پور کے باسیوں کے بن تیل دیئے جیسے چہرے کس طرح جل اٹھے تھے۔ کیسی لَو دے رہے تھے جیسے سارا تھیٹر ان چہروں ہی سے روشن ہو۔ انسان کے ذہن کو زندگی کی الجھنوں سے ذرا آزاد کر دو تو انسان کس تیزی سے دیوانگی کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی سے گھڑی بھر کے لیے بے تعلق ہو جانا کس طرح زندگی سے بھی زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ میں بھی تو دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اس وقت میں نہ جانے کتنے نوخیز اور غیرمانوس، ارمانوں کے ہجوم میں اپنے آپ کو گھرا محسوس کر رہا تھا۔ میری نظریں اسٹیج کے اس رنگ برنگے پردے پر جمی ہوئی تھیں جس پر ایک بڑے محل کا ایک حصہ بنایا ہوا تھا۔ اس حصے کے سامنے ایک وسیع اور خوبصورت باغ تھا۔ پھولوں کی کیاریاں، تراشے ہوئے پودے، بڑے بڑے حوض۔ اور ان میں فوارے۔ پردے میں ہلکا سا بھی ارتعاش ہوتا تو میرا دل دھڑک اٹھتا، لگتا اب اسی محل سے کوئی حسین شہزادی نکلے گی اور باغ کی روشوں سے ہوتی ہوئی میری طرف بڑھے گی۔ مجھے یقیناً انتظار تھا اس لیلیٰ کا جس نے مجھ سے آج تھیٹر آنے کا وعدہ لیا تھا۔ مجھے یقین تھا پردہ اٹھتے ہی وہ جادوگر جلوہ گر ہوگی۔ اپنے نئے روپ سروپ میں، راگ و رنگ کے ساتھ

اپنے جوان بدن کی حشر سامانیوں کے ساتھ۔ میرے ذہن میں بھی اس وقت تھیٹر جیسا ایک بے ہنگم شور برپا تھا۔ اس شور میں عجیب سی بے معنی آوازیں تھیں جو میرے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے بار بار ٹکرا رہی تھیں۔ میں صبر و ضبط سے ضرور کام لے رہا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں پردہ اٹھنے کے انتظار میں اتنا دیوانہ کیوں ہوا جارہا تھا۔ آخر اسٹیج پر ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا جیسے کسی نے پٹاخہ اڑا دیا ہو۔ اس آواز کے ساتھ ہی پردہ دھیرے دھیرے اٹھنے لگا۔ اسٹیج پر پھیلی ہوئی رنگ برنگی روشنیوں سے ابھی میری آنکھیں دوچار ہوئی تھیں کہ اسٹیج کے ایک کونے سے موسیقی کی ایک دھار پھوٹی جو گھڑی بھر میں میرے سارے وجود کو اپنے ساتھ سمیٹ لے گئ۔ طبلے کی تھاپ نے دل کی رہی سہی دھڑکن سے بھی بے خبر کر دیا۔ سامنے اسٹیج پر سارے فنکار ایک قطار میں کھڑے حمد گا رہے تھے۔ شاید ایک فنکار ہی کا دل خدا اور انسان دوستی کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ان سب کے چہروں پر اس وقت کیسی سچائی تھی۔ شاید ان کے فن کا نور تھا۔ پھر وہ سواگت کا گیت گانے لگے۔ اس قطار میں میری نظر صرف اس حسینہ پر تھی جس کی لمبی لمبی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ جس کے سرخ سرخ ہونٹ سواگت کا گیت کیا گا رہے تھے، میرے سواگت کے لیے پھول برسا رہے تھے۔ اس وقت شاید میرے احساسات کی حدود میں ہم دونوں کا ہی وجود تھا۔ ایک وہ تھی اور میں تھا۔ اس وقت مجھے کسی تیسرے وجود کا احساس نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے پردہ گرا بھی ہو، اٹھا بھی ہو، لیکن میری محویت نے تو صرف یہی دیکھا کہ وہی من موہنی شکل، وہی ہوشربا حسن، وہی شعلہ فشاں بدن اب محو رقص ہو گیا ہے۔ اس نازک بدن کا ایک ایک خم، اس کی ایک ایک لچک ایسی تھی، لگتا تھا ایک ہی کمان سے ایک ساتھ کئی تیر چھوٹ رہے ہیں۔ لیکن ان ہزار جان لیوا اداؤں میں ایک وہ ادا بھی تھی جو گھڑی بھر میں میری نظروں میں، نظروں کی گہرائیوں میں اور دل کی دھڑکنوں میں زندگی بھر کے لیے محفوظ ہو گئ تھی۔ رقص کرتی ہوئی وہ اچانک اپنے پنجوں پر بیٹھ جاتی اور اسی لمحے اپنی نظروں کی مستیاں اور بدن کی نزاکتیں فضاء میں بکھیرتی ہوئی اس تیزی سے کھڑی ہو جاتی جیسے نکلتے سورج کی پہلی کرن اچانک سارے آسمان پر چھا گئ ہو وہی کرن میرے ذہن کے ہر گوشے میں، میرے دل کی ہر دھڑکن میں ہمیشہ کے لیے

سما گئی ۔ ان لمحات رقص میں کتنی ہی بار اس نے سارے تماشائیوں کی نظروں سے اپنی نظریں بچاکر مجھے دیکھا تھا ۔ اپنی مخصوص اداؤں سے مجھے اپنے قریب بلایا تھا ۔ میرے پاس میرے اندر اب میں خود نہیں تھا ۔ میں شاید اس کے وجود کا ایک حصہ بن چکا تھا ۔ شاید سارے وجود پر چھا جانا اسی کو کہتے ہیں ۔ اگر دیوانگی ہمارے احساسات میں ایک لذت بھرا کرب اور سرور پیدا کر دیتی ہے تو میں یقیناً دیوانہ ہو چکا تھا ۔

ناٹک تو ختم ہو گیا تھا ، لیکن مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنی جگہ ایک دوسرا ہی آدمی ہوں ۔ میری ساری پچھلی زندگی ایک حرف غلط کی طرح مٹ چکی تھی اور میں تھیٹر کے باہر پھیلے ہوئے اندھیروں میں پتہ نہیں کہاں چلا جا رہا تھا ۔ سمی کو تو شاید میں بھول چکا تھا ۔ سمی ایک ایسی روشنی بن گئی تھی جو پچھلی زندگی کے اندھیروں میں ایک بار چمک کر بجھ چکی تھی اور ان اندھیروں میں اس کا کہیں گزر نہیں تھا ۔ میں اس ناہموار راستے پر اندھیروں میں لپٹا لپٹایا آگے بڑھتا چلا گیا ۔

نفرت کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو میرے اس جذبے کا اظہار کر سکتا جو اسکول یا تعلیم کی اہمیت کے خیال کے ساتھ ہی ابھر کر میرے دل و دماغ کی حدود سے بار بار ٹکرا جاتا تھا کہ ان حدود کو توڑ کر نکل جائے ۔ دیوانگی اور جنون کوئی ایسے الفاظ نہیں تھے جو میرے ان جذبات کا اظہار کر سکتے جو ناٹک اور ناٹک والی اس حسینہ کے تصور کے ساتھ ہی میرے سارے وجود کو سمیٹے آسمان کی کھلی فضاؤں کی طرف اڑ جاتے تھے کچھ ایسی ہی کیفیت میں اپنے ماحول کے ایک رقت آمیز تصور سے بے تعلق ہو کر دن اور رات پتہ نہیں میں نے ناٹک کے کتنے ہی چکر لگائے تھے ۔ اپنے اندر ہی اندر میں بھٹکا ہوا تھا ۔ بہکا ہوا تھا ۔ اپنی جسمانی حدود سے فرار ہو چکا تھا ۔ خاموش راتوں کی تنہائیوں میں گھر کی پابندیوں سے لڑتا ہوا کتنی ہی بار گھر کی دیواریں پھاندنے کی مہم سر کی تھی ۔ بار بار تو کوئی اعزازی پاس مل نہیں سکتا تھا ۔ تھیٹر کا ہلکے سے ہلکا ٹکٹ خرید کر ، تماشائیوں کی نظروں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی کوشش میں تھیٹر کے فرش پر کسی محفوظ کونے میں بیٹھنے لگ گیا تھا کہ اس حسینہ کو محو رقص دیکھ سکوں ، جو مجھے دیکھ تو نہیں پاتی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کی نظریں صرف میری تلاش کرتی رہتی ہوں گی ۔ دن میں سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے اسے اس کی موٹر

پر بیٹھے پرچیاں تقسیم کرتے ہوئے دیکھ لینا زندگی کا حسین ترین مقصد بن چکا تھا۔ ایسے میں جب وہ مجھے ہجوم سے الگ تھلگ کھڑا ہوا ایک نظر دیکھ لیتی تو مجھے یقین ہوجاتا، وہ مجھ سے کہہ رہی ہے۔ "میں خوب جانتی ہوں، تم وہاں تنہا صرف، میرے لیے کھڑے ہوئے ہو۔ میں بھی ..... میں بھی صرف تمہاری ہی ہو سکتی ہوں، ضرور ملتے رہنا۔"

جن راہوں سے میں ان دنوں گزر رہا تھا وہ اتنی آسان نہیں تھیں، قدم قدم پر بڑی ہی اذیت ناک رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ اسکول سے غائب ہوجانے کے سبب پٹائی ہوچکی تھی۔ منظور حسین کے سامنے مجھے ذلیل ہونا پڑا تھا۔ اور ان تمام باتوں کے پیچھے منظور حسین ہی کی بے معنی رقابت اور دشمنی کا ہاتھ تھا۔ اس کی زندگی کا جیسے مقصد ہی یہ بن چکا تھا کہ وہ میری ٹوہ میں رہے۔ صبح سے شام تک وہ مجھے جلی کٹی سناتا رہتا۔ گھر اور اسکول والوں سے میری شکایتیں کر کر کے مجھے پٹوانے میں اسے عجیب سی خوشی ہوتی تھی۔ ایسا کرنے میں وہ ایک فخر سا محسوس کرتا تھا۔ جب میں تنہا بھی ہوتا تو مجھے محسوس ہوتا اس کی حاسد نظریں میرا احاطہ کی ہوئی ہیں جیسے اس کو یقین ہوچکا تھا کہ میں تھیٹر والوں کے ساتھ فرار ہونے والا ہوں۔ مجھے بھی اس حسینہ کے دِلائے ہوئے یقین نے ایک ایسی قوت بخش دی تھی کہ میں اسکول اور گھر کی ساری پابندیوں سے بے پروا ہوکر اپنے آپ کو یہی یقین دلاتا رہتا کہ مجھے تو بہرحال تھیٹر والوں کے ساتھ فرار ہوجانا ہے۔ فرار..... فرار۔ جانے کب مجھے اس لفظ کے معنی معلوم ہوئے تھے۔ اس کا مطلب سمجھ میں آیا تھا۔ یہ لفظ کس طرح ہمیشہ میری زندگی کو ساتھ لیے چلتا رہا ہے۔ اس ایک لفظ نے کتنی بار میری زندگی کو ایک نئی قوت بخشی تھی۔ مجھے ہمت دی تھی۔ سہارا دیا تھا۔ پھر ایکبار مجھے فرار ہونا تھا زندگی کی نئی اور حسین سمتوں کی طرف۔

میں بھول چکا تھا کہ مجھے سمی کو خط لکھنا ہے۔ جواب کے انتظار میں جلتی ہوئی اس کی آنکھوں کو اس یقین کی ٹھنڈک پہونچانا ہے کہ میں آؤں گا۔ لیکن۔ لیکن مجھے ناٹک والوں کے ساتھ فرار ہوجانا تھا۔ سمی کا دوسرا خط بھی آیا تھا، پہلے خط کی طرح، ایک لڑکے کی تحریر میں لکھا ہوا۔ اسی شوخی میں رنگے ہوئے اور پیار کی مٹھاس میں تربتر

الفاظ ۔ اور ساتھ ہی یہ طنز ۔ " میرا خط پاکر بھی میرے دوست تم چپ رہے ۔ اگر میں لڑکی ہوتا اور تم کو خط لکھتا تو تم جواب میں اب تک دس خط لکھ دیتے ۔ " ان پیار بھرے، طنز بھرے الفاظ کی سیاہی میں سمی کی لمبی لمبی پلکوں والی آنکھوں کی روشنی بھی تھی ۔ لیکن ان آنکھوں میں یہ حکم بھی تھا، اس خواہش کا اظہار بھی تھا کہ میں اسکول کی چو دیواری ہی میں قید رہوں ۔ محنت کروں، خوب خوب پڑھوں ۔"

مجھے ان ساری باتوں سے جتنی نفرت ہو سکتی تھی، ہو چکی تھی ۔ سمی کے پہلے خط نے مجھے پیار کے جس طوفان میں گھیر لیا تھا، اس بار اس کا کہیں تصور بھی نہیں تھا ۔ ہوا کے دو ہلکے جھونکے بھی نہ آپائے تھے ۔ ماحول کتنا پھیکا اور بے رنگ لگتا تھا ۔ سامنے بہت دور تک پھیلا ہوا چٹیل میدان ۔ بے آب و گیاہ ۔ میری نظروں کے سامنے اب اسکول، گھر یا سمی کی طرف جانے والا کوئی راستہ نہیں تھا ۔ میں نے سمی کا خط جلا دیا، تاکہ بار بار مجھے اس کے خط کا خیال نہ آئے ۔

اب میں چپ چاپ ناٹک والوں کے ساتھ فرار ہونے کے منصوبے بنا رہا تھا کہ ناٹک کے مالک سے مل کر یہ درخواست کرنی چاہی کہ وہ مجھے اپنے ٹروپ میں شامل کر لے ۔ اس بات کے امکان نے مجھے اسٹیج کی رنگ برنگی روشنیوں میں کھڑا کر دیا تھا ۔ اور میں تماشائیوں کی تالیوں کی گونج میں قیس یا فرہاد بنا اس حسینہ کے دوش بدوش اس منزل کی طرف رواں دواں تھا جہاں صرف شہرت ہوتی ہے، نام ہوتا ہے، حسن ہوتا ہے اور فن ہوتا ہے ۔ اسٹیج سے فلم کی دنیا کتنی قریب ہو جائے گی ۔ میری وہی منزل جس کے لیے بہت پہلے میں نے اپنا سفر شروع کیا تھا ۔ لیکن جو ذہن زیادہ سوچتا ہے وہ شاید کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا ۔ شدید خواہش بھی اپنی جگہ کوئی فیصلہ نہیں ہوتی اس سے پہلے کہ میں کوئی فیصلہ کر پاتا اسٹیج کی رنگ برنگی روشنیاں میری نظروں سے غائب ہو چکی تھیں ۔ وہ ڈیرا میری نظروں کے سامنے اٹھ چکا تھا جس میں ناٹک ہوا کرتی تھی ۔ اس وقت بھی میں سڑک کے کنارے الگ تھلگ کھڑا ہوا تھا جب کہ ناٹک کی وہ چرخ چوں کرنے والی موٹر رنگ پور سے باہر جانے والی سڑک پر چل پڑی تھی ۔ فرق اتنا تھا کہ موٹر کی چھت پر بیٹھ کر پرچیاں تقسیم کرنے والی حسینہ اب موٹر کے اندر بیٹھی ہوئی تھی ۔ لیکن اس بار بھی اس نے بہت سارے تماشائیوں کی نظروں سے

اپنی نظر بچا کر مجھے مسکرا کر دیکھا تھا اور اس بار بھی اس کی مخصوص نظر نے مجھ سے کہا تھا۔ " تمہارا انتظار کروں گی۔ " پھر میں اس راستے پر اڑنے والی دھول کو بہت دور تک دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ کارواں نظروں سے غائب ہو گیا اور غبارِ کارواں میری نظروں میں دیر تک بسا رہا۔

میں جب گھر لوٹ رہا تھا راستے میں مجھے منظور حسین نظر آیا جو میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنی نظریں بچانے کی کوشش کی، مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور کوئی ایسی چبھتی ہوئی، زہر بھری بات کہے گا، ایک ایسی کاری ضرب لگائے گا کہ میں تڑپ کر رہ جاؤں۔ لیکن خلاف معمول آج اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی نظر آئی، اس کے چہرے کے نقوش میں ایک ملائمت سی محسوس ہوئی۔ میرے قریب آکر اس نے پوچھا۔ " کیا ناٹک والے چلے گئے۔؟ "

" ہاں " میں نے کہا اور جبراً مسکرا دیا۔

" ارے میں بھی ان لوگوں کو دیکھنے کے لیے آ رہا تھا۔ " یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ آج راستے میں بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں اس نے بات کی۔ کہنے لگا۔ " تم کو معلوم ہے مجھے جو ٹیچر پرائیوٹ ٹیوشن دینے آتے ہیں نا، انہوں نے کہا ہے کہ میں اس بار اول درجے میں نہیں تو دوم درجے سے ضرور پاس ہو جاؤں گا۔ " یہ کہہ کر اس نے میری طرف بڑے ہی پُرسکون انداز میں دیکھا۔

پتہ نہیں کیوں میں نے اسے اور زیادہ خوش کرنے کی کوشش کی اور کہا۔

" پھر تو تم اگلے سال ضلع کے اسکول میں چلے جاؤ گے۔ پھر کالج۔ اور، پھر۔ "

وہ زور سے ہنس پڑا تو مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک ایسا خیال بھی ابھرا جو مجھے بڑا ہی ناگوار سا لگا۔ " منظور حسین جیسا بد فطرت اور غبی لڑکا بھی مجھے ہرا دے۔ مجھے شکست دے دے۔ میرے مقابلہ میں سرخرو ہو جائے۔ اس کے سامنے میری پھر ہتک ہو جائے اور پھر سارے لوگ مجھے منظور حسین جیسے حاسد اور بدمزاج لڑکے کی کامیابی کا طعنہ دینے لگ جائیں۔ اس سے بڑھ کر میری ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ "

منظور حسین اسکول کے بارے میں کچھ اور باتیں کرتا رہا اور گھر پہونچنے تک

میں اس کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ گھر پہونچنے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور کچھ دیر وہاں اکیلا، کچھ گم سم بیٹھا رہا۔ پھر کسی خیال سے میں نے اپنی بکھری ہوئی کتابیں اکٹھا کر لیں۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں میرا دل بھر آیا تھا۔ اور میرے ہاتھ پاؤں سرد تھے۔

ناٹک کے چلے جانے کے بعد رنگ پور میرے لیے زیادہ ہی ویران ہو چکا تھا۔ میں بہت ہی گم سم رہنے لگا تھا۔ دن اور رات بالکل یکساں طور پر خاموش لگتے تھے۔ رات کی آنکھوں میں جس طرح سکوت ہوتا تھا اسی طرح دن کے ہونٹ بھی بند رہا کرتے تھے۔ رات کا چہرہ بدرنگ ہو گیا تھا اور دن کا چہرہ اداس۔ وقت بالکل چپ تھا، بے آواز اور بے خبر۔ بس کبھی کبھی اچانک ان خاموشیوں میں ایک ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے جاتی۔ " کیوں نہ بھاگ جاؤں۔؟ نہیں۔ چپ رہو۔ کیوں نہ سمی کو خط لکھوں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ چلو۔ سمی کے پاس لوٹ چلو۔ ایسے لمحوں میں رات کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ یہ رات کتنی نم ہے۔ جانے اس کے سیاہ آنچل میں کتنی ہی آنکھوں کے آنسو جذب ہو رہے ہیں۔ یہ آنچل تو ساری دنیا پر پھیلا ہوا ہے۔ اور یہاں سے وہاں تک یہ آنچل بھیگا ہوا ہے۔ میری آنکھوں میں بھی شاید نمی پھوٹ پڑتی اور اس آنچل کو زیادہ بھگو دیتی۔ ایسے میں سمی میرے بہت ہی قریب بیٹھی ہوئی محسوس ہوتی، بالکل قریب، اپنی پرنم آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہوئی اور اسی طرح سرگوشیاں کرتی ہوئی جس طرح اس نے اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے میں مجھے رخصت کرتے ہوئے کی تھیں " مجھے خط نہ لکھ سکو، نہ لکھنا۔ لیکن میری خوب خوب، یاد کرنا۔ بس صرف مجھے ہی یاد کرنا۔" اور خوب پڑھ لکھ کر میرے پاس آجانا....."

بس ان تنہا تنہا اور بے رنگ راتوں کی وہی سرگوشیاں ان دنوں میرا سب کچھ تھیں۔ ان لمحات نے مجھے اسکول جانے پر راغب کیا تھا۔ وہی لمحات مجھے اسکول تک اپنے ساتھ لیے چلتے تھے۔ اسکول میں جب فرصت کے اوقات ہوتے تو یہی لمحات مجھے رنگ برنگے پھولوں سے بھرے ایک پرفضاء، باغ کی سیر کرا لاتے۔ جہاں وہ سب کچھ ہوتا جس کا بے پناہ حسین تصور میرے نظروں میں بسنے لگا تھا۔ ایک بہت بڑے آدمی کا تابناک مستقبل۔

باب (۱۲)

پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس، ایک پیر میں خاصہ لنگ لیے، انعام میں ملی آسمانی رنگ کی کتاب سینے سے لگائے، جب وہ ہیڈ ماسٹر کو نمسکار کر کے واپس اپنی بنچ پر بیٹھنے کے لیے آرہا تھا اس کے چہرے پر مدھم سی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں بجائے سرخروئی کے ایک بیچارگی کا احساس تھا۔ اسکول کے تمام لڑکے جو تقسیم انعامات کے جلسے میں شریک تھے، اس کو لنگڑاتا ہوا دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ اس کو انعام میں ملی ہوئی آسمانی رنگ کی کتاب کا نام تھا۔ "ابراہم لنکن۔" ہیڈ ماسٹر نے اسے سارے اسکول میں سب سے اچھے طالب علم کی حیثیت سے یہ کتاب انعام میں دی تھی۔ وہ انعام لے کر جب اپنی بنچ کی طرف واپس جارہا تھا تو ہیڈ ماسٹر کی نظریں اس کے پھٹے ہوئے لباس سے جھانکتے ہوئے اس کے ملگجے رنگ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ شاید اس کے بدن میں اس وقت ایک ہلکی سی چمک تھی جس کو ہیڈ ماسٹر کی آنکھوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ جب جلسہ ختم ہوا تو سارے لڑکے شور مچاتے ہوئے اس ہال سے بھاگنے لگے۔ انعام پانے والے لڑکے اپنے اپنے انعام کو سینے سے لگائے فخر محسوس کر رہے تھے اور ان کے بہت سے ساتھی ہنس تو رہے تھے لیکن ہنسی سے حسد کی آگ کا ہلکا ہلکا دھواں اڈ رہا تھا۔ جب وہ لنگڑا لڑکا ہال سے نکل کر اسکول کی بیرونی گیٹ کے قریب پہونچ رہا تھا، اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے آج اس کو اپنے پیر کے لنگ میں بھی چلنے کا لطف آرہا ہے۔ اس وقت گیٹ کے قریب اسکول کے چار گرگے اس کی چال پر آپس میں اشارے کرتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ ان گرگوں کے سردار رستم خاں نے ایک پھبتی کسی۔ "دیکھو سالے لنگڑے لنکن کو۔" یہ سن کر اس کے دوسرے ساتھی زور زور سے ہنستے ہوئے وہی بات دہرانے لگے۔ "لنگڑا لنکن...... لنگڑا لنکن۔"

لنگڑاتے ہوئے لڑکے نے بھی ان کی بات پر اس طرح مسکراتے ہوئے جیسے ان کی بات اس کو دلچسپ لگی ہو، کہا۔ "نام اچھا ہے مگر لنکن لنگڑا نہیں تھا۔ لنگڑا میں ہوں۔" اور اس کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر اس طرح پھیل گئی جیسے وہ اپنی

انکساری کا اظہار کر رہا ہو۔ رستم خاں نے پھر جیسے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے خیالات کی ایک اور چنگاری اڑائی۔

"یہ قصور تمہارا نہیں، تمہارے باپ کا ہے بیٹا جو تم لنگڑے پیدا ہوئے"۔

اس بات کے ننگے پن پر رستم خاں کے ساتھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ لنگڑے لڑکے نے کچھ زیادہ ہی بیچارگی کے ساتھ ان سب کو دیکھا اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر چپ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے فوراً آگے بڑھ جائے ورنہ اس کی اور سُبکی ہو گی۔ وہ گیٹ سے کچھ آگے بڑھ گیا۔ رستم اس کے پیچھے لپکا۔

"سالے ہماری بات کا جواب بھی نہیں دیتا۔ اکڑ بتا رہا ہے، ائیں؟" کہتے ہوئے رستم نے لنگڑے کی ٹانگ پر اپنی ٹانگ ماری۔ لنگڑا اس ناہموار سڑک پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے چہرے پر اب بھی ایک مسکراہٹ تھی، جس میں ایک بے بسی کا اظہار تھا۔ رستم خاں نے اس پر جھک کر کہا۔ "بول، ہے نا تیرے باپ کا قصور؟" اور اس سے پہلے کے لنگڑا کوئی جواب دیتا ایک بھرپور تھپڑ اس کے گالوں پر پڑا۔ اور ایک جھٹکے سے اس کے سینے کو لگی ہوئی کتاب سڑک کے کنارے بہنے والی گندی نالی میں گر پڑی۔ لنکن کے چہرے پر گندگی پھیل گئی۔ لنگڑے کی آنکھوں میں آنسو نظر تو آئے لیکن اس نے اپنا پورا زور لگا کر ان کو بہنے سے روک لیا۔ اس وقت بہت سارے لڑکے وہاں جمع ہو گئے تھے اور ان میں زیادہ تعداد ایسے لڑکوں کی تھی جو لنگڑے کو اور اس کی کتاب کو اس گندی نالی میں دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ لنگڑے کے چہرے پر اس کی شدید بے بسی کا احساس ہلکی سیاہی بن کر چھا گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کی سرخیوں کو اجاگر ہونے سے روک رہا تھا۔ اب وہ بالکل چپ تھا اور سڑک پر ہی بیٹھے ہوئے اپنی لنگڑی ٹانگ کے گھٹنے پر لگے زخم کی مٹی صاف کر رہا تھا، سب لڑکے اس کو دیکھ رہے تھے وہ نالی کی طرف پلٹا اور گندگی میں پڑی ہوئی کتاب کو اٹھانے کے لیے جھکا تھا کہ پیچھے سے رستم خاں نے چیخ کر کہا "خبردار سالے، کتاب کو ہاتھ لگائے گا تو تجھے بھی نالی کا پانی پلا دوں گا۔"

رستم خاں کی آواز پر تیزی سے پلٹ کر وہ بڑی ہی ملتجی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ رستم خاں کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی اور وہ دو گھڑی لنگڑے کی طرف اپنی

چمک دار آنکھوں سے دیکھ کر مسکرا پڑا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر کتنے ہی لڑکے اس طرح کھلکھلا کر ہنس پڑے جیسے بہت دیر سے وہ سب سہمے سہمے کھڑے ہوئے اس ماحول کے تناؤ کو اپنے ذہنوں پر سہے جا رہے تھے۔ رستم خاں نے بڑے ہی فیاضانہ لہجے میں کہا۔ "لے لو بیٹا۔ اٹھا لو اپنی کتاب۔ گھر جا کر اپنے باپ کو بتاؤ کہ تمہارے لنگن نے کتنا پانی پیا ہے۔" اس بات پر پھر سب لڑکے ہنسنے لگے۔ لیکن رستم کو دیکھ کر ہنستے ہنستے رک گئے اور کچھ پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگے۔ لنگڑے لڑکے نے لپک کر نالی کی گندگی سے اپنی کتاب اٹھا لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک بار اپنے گھٹنے کے زخم پر نظر ڈال کر وہ اپنے کپڑے صاف کرنے لگا۔ اور اس کے بعد تمام لڑکوں پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ سب کے سب اس کے پھٹے پرانے کپڑوں اور اس کے لنگڑے پاؤں کو غور سے دیکھنے لگے۔ وہ لنگڑا لڑکا اب آہستہ آہستہ راستے پر آگے بڑھنے لگا، سر جھکا ہوا "چپ چاپ۔ اسے اس طرح ایک زخمی پرندے کی طرح چلتا ہوا دیکھ کر میرے رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے سینے پر مجھے ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں اس وقت پوری قوت سے چیخ کر اس لنگڑے کو روکنا چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ دوسرے سب لڑکے وہاں سے چلے جائیں اس لنگڑے لڑکے کے سامنے رستم خاں کی تکا بوٹی کر دینا چاہتا تھا۔

اس لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے رستم خاں کا گریبان پکڑ کر اس طرح نیچے گھسیٹا ہے کہ رستم خاں اسی نالی کے کنارے چاروں خانے چت پڑا ہوا ہے اور میں اس کے سینے پر سوار ہوں۔ اس کے بالوں کو پکڑ کر اس کا سر نالی کی گندگی میں ڈبو رہا ہوں۔ اس کا منہ نوچ رہا ہوں اور وہ لنگڑا لڑکا زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے اور سارے لڑکے تالیاں بجا بجا کر شور مچا رہے ہیں۔ رستم خاں کا چہرہ لہولہان ہو گیا ہے۔ اس کا سر نالی کے اندر ڈھلکا ہوا ہے اور نالی کی گندگی اس کے منہ میں جا رہی ہے۔ میں اسے اس طرح چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا ہوں اور تیزی سے اس لنگڑے لڑکے سے لپٹ گیا ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اس بری طرح چمٹ گئے ہیں کہ دونوں کے سینوں میں پھنسی ہوئی کوئی شے پگھل کر سیال بن گئی ہے اور امڈ کر ہماری آنکھوں سے ٹپکنے لگی ہے اور اب تک جو بہت سارے لڑکے سہمے سہمے ہنس رہے تھے وہ

ہمارے ساتھ خوشی خوشی رو رہے ہیں۔

لیکن اس وقت تک ایک زور دار قہقہہ لگاتا ہوا رستم خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ میرے قریب پہونچ چکا تھا۔ میں اس وقت دراصل یکاوتنہا کھڑا ہوا اس لنگڑے لڑکے کو سڑک پر اپنے گھر کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ سب لڑکے اِدھر اُدھر جا چکے تھے۔ مجھے اس طرح کھڑا ہوا دیکھ کر رستم خاں نے مجھ سے کہا۔ "بڑے پیار سے دیکھ رہے ہو میاں لنگڑے کو۔ بیچارے کو سہارا دے کر گھر تک چھوڑ آتے تو ثواب مل جاتا۔" رستم خاں کا لہجہ ایک تیز چھری کی طرح میرے سینے سے آر پار ہو گیا۔ میں اپنے زخم کو چھپانے کی کوشش میں رستم خاں کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔ میری اپنی ہنسی سے میرے سارے بدن پر رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ پتہ نہیں رستم خاں کے جی میں کیا آئی وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے سوچا ان سب سے نظر بچا کر سیدھے اس لنگڑے لڑکے کے گھر پہونچ جاؤں۔ گو کہ میرا کوئی قصور نہیں تھا، لیکن جی چاہا کہ اس کے پاس جا کر میں اس سے معافی مانگوں۔ اس کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے ساتھ روؤں۔ اسے سمجھاؤں۔ دلاسہ دوں اس کی ہمت بڑھاؤں۔ لیکن میں ادھر نہ جا سکا۔ رستم اور اس کے ساتھیوں کا ایک انجانہ خوف میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ وہ لنگڑا لڑکا بھی میری نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔

اس لنگڑے لڑکے کا نام تھا پربھاکر۔ اس کا باپ اس مقام کا پوسٹ مین تھا پچاس پینتالیس سال کا دبلا پتلا ایک منکسر المزاج آدمی۔ اس کو میں نے ہمیشہ ایک ہی لباس میں دیکھا تھا۔ میلا کچیلا جھریوں سے بھرا ہوا خاکی یونیفارم۔ سر پر رومال بندھا ہوا چہرے پر فرض کے احساس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ساتھ ادب تمیز سے پیش آنے والی مسکراہٹ۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب پربھاکر کا باپ پوسٹ دینے کے لیے ہمارے گھر آئے گا تو میں اس کو آج کا سارا واقعہ بتا دوں گا۔ اور اس سے کہوں گا کہ وہ رستم خاں کے باپ کے پاس جا کر اس کی شکایت کر دے۔

میں ایسی ہی باتیں سوچ رہا تھا کہ قریب ہی تیزی سے دوڑنے والے ایک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ میں چونک پڑا۔ بجلی کی طرح، میرے قریب سے ایک سیاہ گھوڑا گزر گیا اور میں صرف اس کے پیچھے اڑنے والا غبار دیکھ سکا۔ اس تیز رفتار

گھوڑے پر شیر خاں سوار تھا۔اس خیال ہی سے ایک بار میرا دل زور سے دھڑکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال دل کو اچھا بھی لگا کہ یہ بدمعاش رستم خاں کیسی دھونس جماتا ہے۔ کیسی اکڑ بتاتا ہے۔ لیکن جب شیر خاں کے سامنے ہوتا ہے تو لڑکیوں کی طرح شرمانے لگتا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ رستم خاں، شیر خاں کا رکھا ہوا ہے، اور اس کو رستم خاں کی لت پڑ گئی ہے۔ رستم خاں، شیر خاں کی گود میں بیٹھ کر لڑکیوں جیسے نخرے کرتا ہے اور اس سے خوب پیسے اینٹھتا ہے۔ شیر خاں کی ہمت پر ہی وہ سارے اسکول کے لڑکوں پر رعب گانٹھتا ہے۔ ان کو طرح طرح سے ڈراتا ہے، مارتا ہے اور ٹیچرز بھی اسی لیے اس کے منہ نہیں لگتے کہ بات کہیں شیر خاں تک نہ پہونچ جائے۔ شیر خاں نہ صرف اس مقام کی بلکہ سارے ضلع کی ایک مشہور شخصیت تھا۔ ہمیشہ ایک دونالی بندوق کندھے سے لٹکی ہوئی۔ چکلے سینے پر کارتوس کا بیلٹ تنا ہوا۔ سرخ چہرے پر گھنی نکیلی موچھیں۔ آنکھوں میں وحشت ناک جوانی کی چمک۔ ڈھیلے ڈھالے ریشمی کرتے پر ویسٹ کوٹ۔ ۷۰ گز کا شلوار۔ سر پر رومی ٹوپی۔ وہ جب گھوڑے پر بیٹھتا تو زین نہیں کستا تھا۔ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر اس طرح ایڑ لگاتا کہ گھڑی بھر میں گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگ جاتا۔ رنگ پور کو ضلع سے آنے والی بس کے ساتھ اپنے گھوڑے کی دوڑ لگا کر وہ دوڑ جیت چکا تھا۔ لیکن ایک وحشت ناک قصہ یہ بھی تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دراصل ایک بزدل آدمی ہے۔ اس نے اپنے ایک دلیر اور بہادر دوست کو جو اس سے زیادہ ضلع میں مشہور تھا۔ ایک شام بہت ساری شراب پلا کر کسی پرانی رقابت کی بنا پر قتل کر دیا تھا۔ اور اس قتل کے الزام میں اس کو عمر قید ہو گئی تھی لیکن دو تین سال کی سزا بھگتنے کے بعد وہ جیل سے رہا ہو گیا تھا۔

اب اسے جیل سے رہا ہوئے دو تین مہینے گزر چکے تھے۔ لیکن ان دنوں وہ اور زیادہ وحشت ناک ہو گیا تھا۔ اس لیے بھی کہ اس قتل کے بعد یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ شیر خاں شیر دل نہیں، بزدل ہے۔ کمزور پر ظلم کرتا ہے، اب اس کے ہم پیشہ لوگ بھی اس کو گری ہوئی نظر سے دیکھنے لگے تھے اور اس سے زیادہ ملتے جلتے نہیں تھے۔ اس لیے بھی اس نے کم سن لونڈوں سے اپنی محفل سجالی تھی۔ ان لونڈوں میں رستم خاں اس کا

بہت زیادہ چہیتا تھا اور شیر خاں کا چہیتا ہونے پر اس کو بڑا ناز تھا۔

پربھاکر کے گھر چلے جانے کے بعد میں وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا تھا۔ لیکن جب میں وہاں سے اپنے گھر جانے لگا تو پربھاکر کا باپ مجھے راستہ ہی میں مل گیا۔ وہ مجھ سے مل کر جیسے بہت خوش ہو گیا تھا۔ بڑی ہی میٹھی اور پیاری باتیں وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "معلوم ہے مجھے تم خوب پڑھتے ہو، پھر اگلے سال یہاں سے چلے جاؤ گے۔ بڑے اسکول میں، بڑے کالجوں میں۔ اور میرا پربھاکر.........." اس نے جیسے ایک ہچکی لی اور پھر ایک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی اس کے سارے ہی وجود پر، کہ وہاں اچانک مجھے اس کی جگہ اس کا دہ میلا کچیلا یونیفارم ہی نظر آیا، خالی خولی، جیسے وہ اس یونیفارم میں نہیں تھا۔ پھر دوسرے لمحے اس کی آواز آئی۔ "کیا رکھا ہے بھلا میرے اس انجر پنجر میں، جو اس کو دے سکوں........"

لیکن اس کے سینے کے اندر ہی اندر دھنستی ہوئی اس کی آواز کا جواب دیتے ہوئے ایک عجیب و غریب خوشی محسوس کی تھی میں نے جس سے میرا ہر لفظ روشن روشن سا لگا تھا۔

"تمہارا بیٹا پربھاکر سارے اسکول میں اول آیا ہے اور ہیڈ ماسٹر نے اس کو سب لڑکوں کے سامنے انعام دیا ہے۔" اپنے بیٹے کے انعام پانے کی خبر سن کر اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں یکبارگی شفقت بھری چمک آگئی تھی اور پھر غائب ہو گئی تھی۔ اس کے پتلے سے سینے میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی کسی انجانی خواہش نے اسے آسمان کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آسمان پر سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا سورج کی چمک سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ لمحہ بھر بعد مجھے دیکھتے ہوئے وہ مسکرا پڑا۔ اس وقت اس کو اس کے بیٹے پربھاکر کے ساتھ رستم خاں کے سلوک کے بارے میں میں نے ساری بات بتادی۔ جب پورا قصہ اس نے سن لیا تو اپنے سینے کو تنا کر بڑی ہی دِقت سے اس نے ایک سانس لی اور کہا "اچھا۔" کچھ دیر اس کی سانس یونہی رکی رہی اس کے چہرے کے تناؤ کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب کہے گا۔ "میں اب رستم خاں کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔" یا "میں رستم خاں کی جان لے لوں گا" یا ایسی ہی کوئی بات۔ لیکن اپنی رکی ہوئی سانس کو چھوڑتے ہوئے اس نے اپنے کندھے

جھکا لیے اور کہا۔ "اچھا، تم جاؤ کل میں ہیڈ ماسٹر کے پاس عرضی دوں گا۔" وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا مجھ سے آگے نکل جائے۔ لیکن اس کی پھٹی پرانی چپل اس کے بے وزن پیروں سے نکل کر پیچھے رہ گئی۔ اس نے پلٹ کر پھر اپنی چپل پہن لی اور ذرا مشکل سے سڑک پر گھسٹنے لگا۔ میں نے دیکھا اس کے کندھے اور جھک گئے ہیں۔ جیسے وہ کبھی نظر نہ آنے والا ایک بوجھ اس کے کندھوں پر کچھ اور زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلتا رہا۔ سڑک پر بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر اس کی چپل پھسلتی رہی اور وہ آگے کی طرف اپنے آپ کو گھسیٹتا رہا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ پاؤں کچھ اس طرح جھول رہے تھے جیسے اس کے دماغ نے اس کے سارے بدن کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں اس کے قابو میں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں گر جائے۔ پربھاکر کی معذوری اور مجبوری کے ساتھ رستم خاں نے جس قسم کا سلوک کیا تھا اس کے ذکر سے پربھاکر کے باپ کے اندر ہی اندر کہیں زبردست چوٹ پڑ چکی تھی اور وہ اس وقت سڑک پر میرے سامنے لڑھک رہا تھا۔

تھوڑی دور چل کر میں اپنے گھر کی طرف جانے والی گلی میں مڑ گیا۔ گلی میں میں اکیلا تھا۔ میرے دماغ نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ "یہ وینکٹ راؤ پوسٹ مین کس سے ڈرتا ہے؟۔ کیا مفلسی جب شرافت بنتی ہے تو نہ صرف سارے جسم و روح کو اندر ہی اندر کھود کر کھوکھلا بنا دیتی ہے بلکہ جذبہ و احساس و آس و امید کو بھی زخم بنا کر جونک کی طرح خون پیتی رہتی ہے۔ اس کے کندھوں پر یہ کبھی نظر نہ آنے والا بوجھ کس نے لاد دیا ہے۔؟ وہ اتنا سارا بوجھ کیوں ڈھوتا پھرتا ہے۔؟ وہ شیر خاں سے کیوں ڈرتا ہے؟ رستم خاں سے کیوں ڈرتا ہے۔ مجھ سے ہمدردی کیوں کرتا ہے؟ بستی بھر کے لوگوں کے سامنے وہ مسکرانا کیوں ضروری سمجھتا ہے جب کہ اس کے سینے میں ایک دھیمی دھیمی آنچ سلگتی رہتی ہے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ڈرتا تو میں بھی ہوں شیر خاں سے، رستم خاں سے، یکلخت مجھے ٹھاکر کا خیال آیا میں ٹھاکر سے بھی ڈرتا تھا، آخر کیوں؟ ٹھاکر نے تو ہمیشہ میری پیٹھ ٹھونکی تھی۔ مجھے اپنا ہمسر سمجھا تھا۔ اپنے معرکوں میں مجھے برابر کا شریک رکھنا چاہتا تھا۔ پھر بھی میں اس سے ڈرنے کیوں لگا تھا۔ مجھے قیوم اور جبار یاد آئے جن کے کہنے پر میں اپنے گھر سے فرار ہو چکا تھا، گھر

والوں سے بغاوت کر دی تھی۔ میں تو ایک ایسا بہادر اور دلیر آدمی تھا جو شمشیر و تفنگ سے لیس اپنے منہ زور گھوڑے پر سوار دندناتا ہوا غنیم کی صفوں میں کود پڑ سکتا تھا اور فلم کی ہیروئن کو دشمن کے چنگل سے چھڑا کر اس کے محل تک پہونچا سکتا تھا۔ میں تو سمی جیسی حسین دوشیزہ کا عاشقِ جانباز تھا۔ میں تو رات کے اندھیروں میں دیوار پھاند کر سمی کی مسہری پر حملہ کرنے والا دلیر لٹیرا تھا۔ لیکن آج اس گلی سے گزرتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال کیوں آرہا تھا کہ "میں قیوم اور جبار سے ڈرتا ہوں۔ ٹھاکر سے اور منظور حسین سے ڈرتا ہوں۔ رستم خاں سے ڈرتا ہوں۔ میں ڈرپورک ہوں...... میں ڈرپوک ہوں"۔

ان خیالات کے ساتھ سینے میں ایک شدید جلن سی محسوس ہونے لگی اور یہی یقین ہونے لگا کہ میری یہی بزدلی اور میرا یہی ڈرپوک پن میرے راستے کی وہ رکاوٹیں ہیں جو بار بار آگے بڑھنے کی ہمت مجھ سے چھین لیتی ہیں۔ یہی وہ حالات ہیں جو میرے ذہن کو ایک جیل خانہ بنادیتے ہیں۔ جس کی چار دیواری ایسے ہی ڈر اور ایسے ہی اندیشوں کے مضبوط پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ گھر کی طرف بڑھتے ہوئے میرے پیروں میں مجھے اب کچھ زیادہ قوت محسوس نہیں ہو رہی تھی، میرے سینے کو لگی ہوئی میری کتابوں پر بھی میرے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ سمی کہتی ہے میں خوب پڑھ لکھ لوں، سمی نے بھی مجھے ڈرپوک بنادیا ہے۔ سمی بھی ایک چار دیواری بن جاتی ہے، وہ بھی ایک قید ہے میں نے پھر ایک بار یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ایسی ہر قید کو توڑ کر نکل جاؤں گا۔

باب (۱۳)

ان دنوں میرے ساتھ منظور حسین کا رویہ غیر معمولی طور پر خوشگوار تھا اور حیرت انگیز بھی۔ وہ میرے ساتھ کچھ اس طرح گھل مل کر رہنے لگا تھا جیسے اب میرے ساتھ رہنے میں اس کو بہت زیادہ لطف آتا ہے۔ میں چونکہ ان دنوں زیادہ خاموش رہنے لگا تھا، وہ مجھے ہنسانے کی کوشش کرتا، بہت ساری باتیں کرتا جن میں اس کی

برتری کا کہیں احساس نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو بڑی ہی فراخدلی سے وہ میری ذہانت کی تعریف کرتا۔ اپنی باتوں میں وہ مجھ سے اس قدر قریب ہوجاتا کہ اس کی قربت اور اس کا خلوص مجھے مجبور کر دیتے کہ میں سمی کا ذکر چھیڑدوں۔ اس کے خط کا راز اسے بتادوں۔ لیکن میری ہمت نہیں ہوتی تھی۔ کتنی ہی بار میری زبان پر سمی کا ذکر آگیا، لیکن پھر میرے ذہن نے مجھے چونکا دیا۔ ہم دونوں اب ایک دوسرے کے لیے بڑے ہی پرخلوص اور اچھے دوست بن گئے تھے۔ ساتھ ساتھ اسکول جاتے، ساتھ ہی واپس ہوتے۔ انٹرول کی گھنٹی بجتے ہی وہ آکر مجھ سے باہر چلنے کو کہتا۔ اس کے اور میرے اس طرح گھل مل جانے سے میرے اور اس کے دوست بھی آپس میں گھل مل کر رہنے لگے تھے اب ہم سب کے سب خوب ہنستے تھے، گاتے تھے، کھیلتے تھے۔ دوست کا پیار دنیا کو کس قدر دلچسپ بنادیتا ہے، ہر رنگ میں دنیا پیاری لگتی ہے۔ جیسے شرط صرف یہی ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی سے پیار سے ملے۔ خلوص سے ملے۔ اب اسکول کے ماحول میں میرا دل بہلا رہتا اور یہ ساری تبدیلی ایک دو ہفتے کے اندر اندر ہو چکی تھی۔

ایک دن اسکول کے انٹرول میں منظور حسین مجھے مٹھائی والے کے پاس لے گیا، اپنی جیب سے ایک روپیہ کا سکہ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا "تم جو چاہو خرید لو۔" جانے کیوں اس وقت اس کے لہجے میں مجھے کچھ ہلکا سا ارتعاش سا محسوس ہوا۔ جیسے اس نے جو کچھ بھی کہا ہے اور جو کچھ بھی کیا ہے اس پر اس کو پورا یقین نہیں ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔ "نہیں، تمھاری جو مرضی ہو وہی خرید لو"۔ "ٹھیک ہے" کہتے ہوئے اس نے کچھ مٹھائی خرید لی۔ جب ہم دونوں مٹھائی کھا رہے تھے، پتہ نہیں کیوں وہ مجھے گھورے جارہا تھا پھر بہت ساری مٹھائی میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "مجھ سے آج کھایا نہیں جارہا ہے۔ لو یہ بھی کھالو۔" میں نے انکار کیا تو اس نے برا نہیں مانا۔ بولا۔ "ٹھیک ہے کسی اور دوست کو کھلادیں گے۔" تب منظور حسین نے کچھ بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے سوال کیا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو" میں نے کہا۔ "ہے نا مٹھائی اچھی؟" منظور حسین نے پوچھا۔
میں نے کہا۔ "مٹھائی تو بہت اچھی ہے، لیکن یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

یہ سن کر منظور حسین کھل کر ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "تم نے مجھے اب تک نہیں بتایا کہ وہ خط تم کو کس نے لکھا تھا؟"

میں جو مٹھائی کھا رہا تھا وہ میرے حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی۔ پھر میں نے سنبھل کر کہا۔ "کونسا خط؟"

"ارے وہی خط جس کے لیے میں نے خواہ مخواہ تم کو ستایا تھا۔"

یہ بتاتے ہوئے کہ منظور حسین کے اس سوال کی میرے پاس کوئی اہمیت نہیں ہے میں نے اس کا جواب یوں دیا۔ "اچھا، اچھا یاد آیا۔" تم شاید اس خط کی بات کر رہے ہو جو گاؤں سے میرے ایک دوست نے لکھا تھا۔ میں نے تو اس کا کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ میں تو بھول ہی گیا وہ بات"۔

میرا اتنا لمبا چوڑا جواب سننے کے لیے منظور حسین تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر چپ رہا، پھر بڑے ہی مستانہ انداز میں بولا۔

"ارے چھوڑو یار، یہ دوستوں کی بات۔ یہ بتاؤ کبھی کسی لڑکی نے تم کو کوئی خط لکھا ہے؟"

"نہیں ....." کچھ اتنی تیزی سے اور کچھ اتنی بے وزن سی آواز میں یہ لفظ میری زبان سے نکل گیا کہ مجھے محسوس ہوا میں نے "ہاں" کہہ دیا ہے۔ اور فوراً میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "ارے آج ہم دونوں ہی ادھر چلے آئے، دوسرے دوست ہم کو ڈھونڈھ رہے ہوں گے۔" لیکن منظور حسین نے میری یہ بات سنی ہی نہیں۔ لگتا تھا اس نے دراصل میرے "نہیں" پر بھی کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ تو مجھ سے اپنے سوال کا کوئی جواب بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اس کے سوال کا وہ خود جواب دے۔ اس نے کہا۔ "ارے مارو گولی ان دوستوں کو، روزان ہی کا تو منہ دیکھتے ہیں دیکھو ایک بات میں تم کو بتانا چاہتا ہوں، تم اس بات کا کبھی کسی سے ذکر نہیں کرنا"۔

میرا دل آہستہ سے دھڑکا۔ راز خواہ کسی کا ہو، اپنا یا دوسروں کا، جب افشا ہوتا ہے تو دل ضرور دھڑکتا ہے۔ میں نے فوراً اس سے وعدہ کر لیا کہ میں وہ بات کسی سے نہیں کہوں گا۔

منظور حسین کے چہرے پر اب تک جو ایک تناؤ تھا، وہ اب کم ہونے لگا۔ وہ ایک ہلکی بے تابی کے احساس کے ساتھ ہنسا اور بولا۔

"یہ دیکھو یہ ایک لڑکی کا خط ہے"

میرا دل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا۔ "کہیں سمی کا تو نہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" میرے ذہن میں یہ الفاظ گونج کر رہ گئے۔ میں نے بڑی ہی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اچھا، کون لڑکی ہے، کس کے نام ہے یہ خط؟"

اس بار منظور حسین کے کالے چہرے پر جذبہ، عشق کی ہلکی سی دمک نظر آئی اور غائب ہو گئی۔ اس نے کہا "خود ہی دیکھ لو۔" اور خط میری طرف بڑھا دیا۔

بڑی ہی بے چینی سے وہ خط میں نے کھولا۔ اور پڑھنے لگا۔ خط منظور حسین کے نام تھا اور القاب ہی میں منظور حسین کو حسینوں کا راجہ بتایا گیا تھا۔ میں نے القاب پڑھ کر جب ایک نظر منظور حسین پر ڈالی تو محسوس ہوا کہ وہ منتظر ہی تھا کہ القاب پڑھنے کے بعد میں ایک نظر ضرور اس کی طرف دیکھوں۔ اس وقت اس کے چہرے پر اوائل عشق کی ایک پر غرور تمازت نظر آئی جس میں اپنے آپ کو تھوڑا سا غمگین بتانے کا شوق بھی شامل رہتا ہے۔ وہ خط میں نے پورا پڑھ ڈالا۔ تحریر میں کچھ عجیب اکھڑا اکھڑا پن تھا۔ بڑی ہی پر کشش بے ترتیبی تھی۔ اور ہر لفظ پر ہلکا تبسم پھیلا پھیلا لگتا تھا۔ اور ان الفاظ کے ساتھ ایک بے باک سی ہنسی سنائی دیتی تھی۔ اور لگتا تھا کہ خط لکھنے والے کو قطعی اس بات کا خیال نہیں تھا کہ تحریر پر اثر ہو۔ کبھی کبھی خط بھی اپنے لکھنے والے کی ایک تصویر ہوتا ہے۔ اور لکھنے والا ان دیکھا بھی ہو تو نظر آنے لگتا ہے۔ خط کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا کس قسم کی باتیں کرتا ہوگا۔ دوران گفتگو اس کے چہرے کے نقوش کیسے ہوتے ہوں گے۔ وہ کس طرح ہنستا ہوگا، کس طرح چپ رہتا ہوگا۔ وہ خط منظور حسین کے نام تھا لیکن تحریر کا انداز ایسا تھا کہ اس خط کے لکھنے والے سے نہ جانے کیوں مجھے بھی ایک قربت سی، ایک اپنائیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ کہیں مل جائے تو ہم کچھ اس طرح آپس میں باتیں کرنے لگ جائیں جیسے زمانے سے ایک دوسرے کے انداز گفتگو سے واقف ہوں اور ہم فوراً ایک دوسرے کو پسند کرنے لگ جائیں۔ آپس میں خوب ہنسنے بولنے لگ جائیں۔ خط

کے آخر میں نام لکھا تھا "صبا" ۔ مجھے یہ نام بڑا عجیب سا لگا تھا۔ لیکن میرے ذہن میں اس خط کے لکھنے والے کے قد و قامت اور اس کے مزاج و فطرت کا ایک تصور جو یونہی ابھر آیا تھا اس کے لیے یہ نام موزوں لگتا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد میں نے منظور حسین کو دیکھا وہ بے حد بے چینی سے اس بات کا منتظر تھا کہ میں اس کے اس معرکے کے بارے میں کچھ کہوں' اسے چھیڑوں ۔ اسے ستاؤں تاکہ وہ اپنی اہمیت جتاسکے ۔ واقعی زندگی کا پہلا پیار ایک معرکے سے کم نہیں ہوتا۔ ایک لڑکی کا پیار پاکر آدمی اپنے آپ کو ایک بڑی مہم کے فاتح سے کم نہیں سمجھتا۔ میں نے کہا۔

" تم تو بڑے بمبارڈ قسم کے آدمی نکلے ۔" میری بات پر منظور حسین کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جو ایک شدید خواہش کا اظہار تھی ۔ ٹھیک یہی بات بلکہ یہی لفظ وہ مجھ سے سننے کا خواہش مند تھا۔ ان دنوں یہ لفظ " بمبارڈ " ہمارے اسکول میں بہت چل نکلا تھا۔ ہر ایسی چیز کے لیے استعمال ہوتا تھا جو اپنی جگہ بڑی ہی زبردست ، پرزور اور ہنگامہ خیز ہو ۔ جس کو جان کر لوگ چونک پڑیں ۔ منظور حسین نے مجھ سے کچھ قریب آکر دبی آواز میں کہا " خط کی پشت پر کیا لکھا ہے ، وہ نہیں پڑھا تم نے ۔ دیکھو صبا کل یہاں آرہی ہے ۔" میں نے تیزی سے خط کو پلٹا کر دیکھا ، صبا کے رنگ پور پہونچنے کی اطلاع تھی ۔ ایک رنگین اور خوبصورت بیلون کے اچانک پھٹ پڑنے پر گھڑی بھر کے لیے کسی بچے کی صورت جیسے بن جاتی ، میری صورت ایسی ہی بن گئی ۔ اور بجائے منظور حسین کی خوشی میں اپنے آپ کو شریک کرنے کے پتہ نہیں کیوں میں کچھ کھسیانا ہو گیا۔ اور ایک پھیکی سی بے معنی سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی ۔ میں نے کہا ۔ " لو ، اب تو پانچوں گھی میں ہیں ۔" یہ سن کر منظور حسین نے نظریں جھکالیں ۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے کالے کلوٹے سخت سے چہرے پر اتنی ملائمت اور نرمی کہاں سے آگئی تھی ۔ اس کے چہرے کی کرختگی اور اس کی آنکھوں سے ٹپکتا ہوا نخوت کا زہر کہاں چلا گیا تھا۔ عشق شاید آدمی کے خون میں بہنے والے ہر زہر کو پی جاتا ہے ، نفرت کے زہر کو' دشمنی کے زہر کو ۔ رشک و حسد کے زہر کو ۔ پہلی بار میں نے منظور حسین کو مجھ سے التجا کرتے ہوئے سنا۔ اس نے کہا

"دیکھو یار، یہ راز کسی کو نہ معلوم ہو۔ تم جانتے ہو کہ صبا چچی جان کے خاندان کی لڑکی ہے، ان کے بھائی کی لڑکی ہے۔ اگر چچی جان کو ہلکا سا بھی شبہ ہو گیا تو پھر میری خیر نہیں، ویسے وہ آتو رہی ہے چچی جان سے ملنے کے لیے لیکن دراصل میرے لیے آرہی ہے۔ کچھ دن پہلے جب میں چچی جان کے ساتھ ان کے گاؤں گیا تھا، وہاں صبا کو میں نے دیکھا تھا۔ تم نے اسے دیکھا نہیں، بالکل لڑکا لگتی ہے وہ۔ تیز و طرار۔ بے حد بے باک کھلنڈری اور ہنسوڑ۔ اس کی آنکھیں اتنی بڑی ہیں کہ جب وہ میری طرف دیکھتی تھی تو میں اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگتا تھا۔"

منظور حسین نے بڑی ہی بےچینی سے ادھر ادھر دیکھا جیسے اس کی نظروں کو کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ لیکن اچانک اس نے اپنے آستین کے بٹن میں لگا ہوا سرخ نگینہ میری آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ "یہ دیکھ رہے ہو، اس کا چہرہ ایسا ہی سرخ اور روشن ہے۔ صبا مجھے کیوں چاہنے لگی ہے، مجھے نہیں معلوم، میں تو بہت کالا ہوں نا؟" منظور حسین کے چہرے کی سیاہی میں اس وقت بیچارگی کا احساس نمایاں تھا۔ لیکن اس کے لہجے میں سکون تھا۔ اطمینان تھا، اعتماد تھا۔ شاید اس خیال سے کہ عشق میں کالے گورے کا فرق ہی کیا؟ میں نے اس سے کہا۔ "تو اب صبا کے یہاں آنے کے بعد تم اس سے تنہائی میں کہاں ملو گے؟"

"تنہائی میں!!" منظور حسین کی آنکھوں میں سرخی سی دوڑ گئی اور اس کی آواز اس کے حلق میں دب گئی۔ چہرے کی رنگت کچھ پھیکی پڑ گئی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم ہی بتاؤ کہاں ملوں؟"

میں نے کہا۔ "رات کے اندھیرے میں۔ اپنے کمرے میں اسے آنے کے لیے کہہ دینا۔" اس بات پر جیسے منظور حسین کا گلا بالکل خشک ہو گیا۔ وہ کچھ اس طرح کھانسنے لگا جیسے اپنا گلا صاف کر رہا ہو۔ آگے بڑھ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ سرد تھا۔ بڑے ہی دبے دبے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔ "اس میں تم میری مدد کر سکتے ہو۔" اس کی اس بات پر آنے والی اس رات کا اندھیرا گھڑی بھر کے لیے میری آنکھوں میں چھا گیا۔ اس گھڑی بھر کے اندھیرے میں مجھے بھائی صاحب نظر آئے، بھابی نظر آئیں، گھر کے نوکر چاکر نظر آئے اور منظور حسین سے کچھ دور صبا نظر

آئی۔ میں نے بھی اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔" میری اس بات پر منظور حسین آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا اور تب ہم دونوں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں کے دل بہت زور زور سے دھڑک رہے ہیں۔

دوسرے دن صبا آگئی۔ بالکل اسی انداز سے آئی جیسے کہ مجھے توقع تھی۔ تیز رفتار، تیز گفتار۔ اس دن اس کے ساتھ ہم سب ہنس رہے تھے۔ منظور حسین اس لیے بھی زیادہ ہنس رہا تھا کہ اس کو ہنسنے کا زیادہ حق تھا۔ میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ میں نے اس سرخ اور روشن نگینے جیسے چہرے کو دیکھا۔ منظور حسین کے کالے چہرے کو دمکتے ہوئے دیکھا تو مجھے ایک عجیب تنہائی سی محسوس ہوئی۔ مجھے سمی یاد آگئی اور پتہ نہیں کیوں مجھے خیال آیا "عورت کا حسن اور حسن کی تمکنت تو اس کے شرمیلے پن میں ہے۔ حیا و حجاب کے ایک انداز میں ہے۔ اس کی چپ میں ہے۔ اس کے رُک رُک کے چلنے میں ہے، بے وجہ چھپ جانے میں ہے۔ پلکیں اٹھا کر نہیں پلکیں جھکا کر دیکھنے میں ہے، ایک دو بار نظر آکر دیر تک غائب ہو جانے میں ہے۔ یا پھر اس کی آہ میں ہے، چپکے سے ٹپک جانے والے آنسوؤں میں ہے۔ ایک بیچارگی کے احساس کے ساتھ نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے میں ہے۔"

میں نے اسی دن ایک گوشے میں بیٹھ کر سمی کے نام جذبات سے بھرپور ایک خط لکھا، وہ خط لکھتے ہوئے کہیں رک کر میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بڑے ہی سلیقے سے اور پر اثر انداز میں پیار کا اظہار کرنا چاہیے۔ میں صرف لکھے جا رہا تھا۔ میرے قلم کے سینے میں شاید سمی کے لیے کچھ اتنا پیار تھا کہ قلم کی زبان کہیں رکتی ہی نہیں تھی۔ مسلسل بولے جا رہی تھی اور میں اس کی سریلی آواز سنتا جا رہا تھا۔ وہ خط بے حد طویل تھا۔ میں نے اتنا طویل خط پہلے کبھی کسی کو نہیں لکھا تھا۔ اور جب میں نے وہ خط پڑھنا شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ خط میں نے نہیں لکھا ہے، وہ تو کوئی دوسری ہی قوت تھی جس نے میرے قلم سے وہ خط لکھوایا تھا۔ جب میں نے پورا خط پڑھ لیا تو یہ احساس بھی ہوا کہ میں تو سمی کے پاس کوئی خط بھیج نہیں سکتا، میں تو صرف بھابی کے نام خط لکھ سکتا تھا۔ مجبوراً میں نے وہ طویل خط اپنے پاس رکھ لیا اور بھابی کے نام

ایک مختصر سا خط لکھ دیا کہ میں بہت جی لگا کر پڑھ رہا ہوں اور میں نے ٹھان لی ہے کہ جب تک کہ مجھے اچھے درجے میں پاس ہونے کا یقین نہ ہو جائے میں اپنی نظر اپنی کتاب سے نہیں ہٹاؤں گا۔" خط کو میں نے بھابی کے نام پر پوسٹ کر دیا لیکن جانے کیا بات تھی صبا کے وجود نے، اس کی خوش مزاجیوں نے، اس کے قہقہوں نے مجھے کتاب کی طرف نظر اٹھانے کی اجازت ہی نہیں دی۔ حالانکہ دن بھر وہ منظور حسین کو چھیڑا کرتی، چور نگاہوں سے اس کو دیکھتی اور ہنس پڑتی۔ اس وقت منظور حسین کے سیاہ چہرے پر ہلکی سی ایک دلآویز دمک نمودار ہو جاتی تھی۔ میں چپ چاپ ان دونوں کو دیکھتا رہتا اور دل ہی دل میں سمی اور صبا کے پیار کرنے کے انداز کے فرق کو محسوس کرتا رہتا۔ کچھ ایسی ہی الجھنوں میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس ایک ہفتے کے عرصے میں منظور حسین نے کبھی صبا سے رات میں بھی کہیں ملاقات کی تھی، یا کہیں تنہائی میں وہ اس سے مل چکا تھا۔ منظور حسین نے کبھی مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی اور میں نے بھی کوئی ایسی بات جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایک دن جب ہم دونوں اسکول سے واپس گھر آرہے تھے، مجھے اس نے ایک جگہ روک لیا اور کچھ کانپتی آواز میں کہنے لگا۔ "آج رات صبا نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔"

میں نے اس بات پر کچھ زیادہ ہی زور سے منظور حسین کا سینہ ٹھونکا اور کہا۔ "اب تم پکے عاشق بن رہے ہو۔ کل صبح مجھے سب کچھ بتانا۔" منظور حسین کے حلق میں جیسے کوئی چیز ٹھنس گئی تھی۔ میری بات سن کر وہ خرخر کرنے لگا۔ میں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور ایک تجربہ کار عاشق کے انداز میں اس سے کہا۔ "استاد، آج کی رات میں سب رنگ ہوں گے، بس یہ رات کالی نہیں ہوگی۔ سب تم کو دیکھ سکیں گے اور تم کسی کو دیکھ نہیں پاؤ گے، سوائے اپنی صبا کے۔" منظور حسین کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے گلے کی خرخر کم ہو گئی اور پتہ نہیں کیوں اس نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ "دیکھو، آج رات تم بھی سونا نہیں۔ تم اپنے کمرے میں جاگتے رہنا۔ شاید مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں جاگتا رہوں گا۔ یہ سن کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اس کے ہاتھ سے نکلے ہوئے پسینے میں میرا ہاتھ بھیگ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "چلو گھر چلیں" ہم لوگ گھر کی طرف چل دیے۔

باب (۱۴)

اس شام منظور حسین میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میرا سایہ بنا ہوا۔ وہ سہما سہما سا تھا۔ کچھ گھبرایا ہوا۔ صبا اسے دیکھ کر ہنس پڑتی۔ اس کی ہنستی نظریں جب میری نظروں سے بھی ٹکراتیں تو میرے اندر ایک ہلکا سا شعلہ لپک جاتا۔ وہ جوان تھی، جسم کی بڑی ہی گداز، اسے دیکھ کر یونہی خیال آتا جیسے سیدھے وہ دیکھنے والے کی باہوں میں آگرے گی۔ میں برابر یہ کوشش کیے جارہا تھا کہ اس کی نظروں کی طرف نہ دیکھوں، لیکن بار بار میں اپنی اس کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ میں نے ایک بار منظور حسین سے سرگوشی میں کہا۔ "دیکھو، اپنی صبا سے رات کی بات پکی کر لو۔" یہ کہہ کر میں جیسے اپنے آپ کو باہر اٹھا لایا۔ اور شام کے دھندلکوں میں اپنی تنہائیوں پر غور کرنے لگا۔ محسوس ہوا کہ آج شام ہوائیں نہیں چل رہی ہیں بلکہ مسلسل کوئی مجھ سے سرگوشیاں کر رہا ہے۔ بار بار مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے۔

ان سرگوشیوں میں عجیب بہکاوے تھے۔ عجیب عجیب لذتوں کی طرف اشارے تھے جسم و جاں کی راحتوں کی طرف بلاوے تھے۔ میں چپ تھا۔ یہ کیسی عمر ہے، لگتا ہے جیسے میں پہلی بار زندگی سے متعارف ہو رہا ہوں۔ ہر دھڑکن حیرت زدہ ہے۔ کوئی بات تو سمجھ میں آئے۔ کہیں تو کوئی راستہ دکھائی دے۔ میں اپنے آپ سے الگ ہو چکا ہوں، اور میرے سامنے جو شکل ہے وہ میری ہی ہے، لیکن اس پر مجھے کوئی بھروسا نہیں۔"

رات ہو گئی، کتنی سیاہ! کتنی خوبصورت! کبھی کبھی رات بھی ایک مخصوص شکل میں ڈھل جاتی ہے جو بہت واضح نظر آتی ہے۔ وہ رات کچھ ایسی ہی تھی۔ مجھے وہ نظر آرہی تھی، ایک حسین اجنتائی مجسمے کی شکل میں ڈھلی ہوئی۔ سرتا بہ قدم شان کج ادائی

دمکتی سیاہیوں میں سنبھلی سنبھلی گولائیاں ۔ کمر کے دل آویز زاویوں میں خط کشیدہ اشارے ۔ رانوں کے سخت جان قوس ۔ دمکتی ساق سیاہ کی رہبری ۔ اس پُرنور مرمریں ڈھلے پیکر کی چشمِ مجوب بھی کفر پرور ۔ کھنچے کھنچے ابرووں میں جہانِ نصف کا گھیراؤ ۔ جھکی جھکی پلکوں میں دیو مالائی حسن کا سا انداز ۔ نظر میں سوم رس کا خمار سیال ۔ اور پھر نگاہِ مجوب کے سائے میں ایک تبسم ستم لہجاد ۔ اور اس کی سرگوشی ۔ بس ایک پل کا فاصلہ اور ہم گئے ۔"

اس طرح رات ایک اجنتائی مورت بنی کھڑی ہے ۔ میری نظروں نے حیرت کی حدیں بھی پار کر لی ہیں ۔ میرے کمرے میں، میں اکیلا ہوں ۔ چپ چاپ دم سادھے ہوئے ۔ میں نے لیمپ بجھا دیا ہے ۔ میری نظروں کے سامنے کھلے دروازے کا چوکھٹا ہے اور اس چوکھٹے میں وہ رات کھڑی ہے ۔ نظروں کی گہرائیوں میں تاروں بھرا آسمان ہے اور کچھ نہیں ۔ میں بار بار سگریٹ جلا رہا ہوں، نیند تو آنکھوں سے اتنی ہی دور ہے جتنا آسمان ۔ سگریٹ کا جلتا ہوا حصہ اندھیرے میں مخصوص زاویوں میں حرکت کرتا ہوا نظر آرہا ہے، کمرے کے اندھیروں میں کہیں کوئی ملائمت نہیں ہے ۔ اندھیروں میں جیسے سلوٹیں ہی سلوٹیں ہیں ۔ ہر کروٹ بے سکون ہوں ۔ "کیا یہ واقعی سمی کی یاد ہے، اس کا فراق ہے، یا منظور حسین کی رنگین رات کے خیال نے مجھ میں ایک عجیب محرومیت کا احساس پیدا کر دیا ہے یا واقعی یہ وہ جذبہ تو نہیں جسے جلن یا حسد کہتے ہیں کوئی بات تو ہے، کوئی بات تو ہے ۔ لیکن آج مجھے سمی کی یاد اس انداز سے کیوں نہیں آرہی ہے کہ اس کے پاس پہونچ جانے کی خواہش سینے میں تڑپ اٹھے ۔ کیوں ایک ایسا خیال ایک ہلکے سے درد کی طرح میرے سینے میں اٹھ رہا ہے کہ مجھے اس وقت سمی کی ضرورت نہیں ۔ اس کے پاس سکون نہیں........"۔

رات اچانک بہت ہی خاموش ہو گئی ہے ۔ کمرے میں حبس سا ہے، رات سانس تک نہیں لیتی ۔ ایک سناٹا ہے جو تاروں بھرے آسمان تک پھیلا ہوا ہے اور اس سناٹے نے مجھے چونکا دیا ہے ۔ میں صاف سن رہا ہوں منظور حسین اور صبا کی سرگوشیاں ۔ بھاری سانسیں ۔ ان کے دلوں کی دھڑکن ۔ ان کے لبادوں کی کانا پھوسی اور ان کی ہم آغوشی کی سرسراہٹ ۔

میرے سینے میں ایک تلخ سا جذبہ ابھرتا ہے ۔ منظور حسین نے بھلا کونسا میرا ساتھ دیا ہے ۔ میں کیوں اس کے لیے یہ ساری اذیت برداشت کروں ۔ اس نے تو ہمیشہ مجھ سے عداوت کی ہے ۔ میں کیوں اس کا ساتھ دوں ۔؟ میں تو سکون سے سو سکتا ہوں ۔ سب کچھ بھول بھال کر آنکھیں بند کر لوں تو نیند آجائے گی ۔ منظور حسین خود غرض ہے ۔ مغرور ہے ۔ میں کیوں...... میں کیوں...... لیکن صبا ؟؟...... صبا.... ؟ صبا میری کون ہوتی ہے ۔؟ آخر میں کس کے لیے جاگ رہا ہوں ؟ کس کے لیے ؟ پکڑی گئ تو صبا بھگتیگی ..... مجھے کیا پڑی ہے ...... ان سارے خیالات کے باوجود میری بے خوابی اور میرے ذہنی تناؤ میں اضافہ ہی ہو رہا ہے ، کچھ تو ہے ، کچھ تو بات ہے ۔ کچھ تو ہونے والا ہے ۔ منظور حسین اب تیزی سے گھبرایا ہوا بھاگتا آئے گا ، مجھ سے لپٹ جائے گا اور کہے گا ۔ " میں ..... میں لٹ گیا ۔ ہم پکڑے گئے ۔ تم میری مدد کرو ...... " میں کیا کر سکوں گا ۔ کچھ بھی تو نہیں ...... صبا سمجھے گی میں کس قدر بے معنی آدمی ہوں ۔ بزدل ہوں ...... لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منظور حسین بازی مار لے ۔ اور ساری رات صبا کی باہوں میں گزار لے ۔ صبا کو جیت لے ۔

جانے کیوں اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے آپ کو اپنی سانسوں میں الجھا ہوا پایا ۔ کمرے میں وہی اندھیرا تھا ۔ ہر طرف وہی سناٹا تھا لیکن اب دروازے کے چوکھٹے میں وہ اجنتائی مورت نہیں تھی ۔ وہ مورت کچھ ایسے اندھیروں میں تحلیل ہو گئی تھی جو دور تاروں بھرے آسمان تک پہونچ چکے تھے ۔ جہاں اب گہرے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ کمرہ بہت تاریک تھا ۔ دروازے کا چوکھٹا بھی تاریک تھا ۔ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا ہے ۔ میری آنکھوں میں اندھیرا اور گہرا ہو گیا ۔ میرا احساس ایک ننگی تلوار کی دھار کی طرح تیز ہو گیا ، جیسے مجھ سے کوئی قریب آئے تو کٹ کر رہ جائے ۔

اف وہ لمحہ ! مجھے صرف اتنا محسوس ہوا کہ اندھیرے کا ایک غبار میری طرف آیا اور مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ بے دھڑک کوئی مجھ پر گر پڑا اور مجھ سے چمٹ گیا ۔ میرے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل پڑی تو کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ اس ہاتھ کی ملائمت اور خوشبو نے مجھ میں ایک حرارت سی پیدا کر دی ۔ اب میرے سینے پر

ایک دوسرا دھڑکتا سینہ تھا۔اور اس دھڑکن سے آواز آرہی تھی۔

"یہ سب غلط ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے......" وہ دھڑکتا سینہ میرے سینے میں دھنس گیا۔ گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ میری سانسیں بالکل بے لگام سی تھیں۔ جیسے میں کہیں سرپٹ دوڑا جارہا ہوں۔ پوری قوت سے میں نے اپنی لگام کھینچی اور سانس کے رکتے ہی بول پڑا۔

"تم! تم!!......"

"ہاں میں صبا ہوں۔ چپ رہو، وہ سب کچھ غلط ہے۔ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ ...." میرے سینے میں ایک چہرہ دھنسا جارہا تھا اور گرم گرم آنسوؤں سے میرا سینہ بھیگ رہا تھا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ "لیکن۔ میں۔ میں....."

"ہاں ہاں" تم منظور حسین نہیں ہو۔ مجھے دھوکہ نہ دو۔ میں جھوٹ نہیں ہوں تم بھی جھوٹ نہیں ہو سکتے۔ منظور حسین جھوٹ ہے........"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب منظور حسین یہاں آنے والا ہے۔ میں تم سے بعد میں مل لوں گا۔ وہ اس وقت یہاں آجائے گا تو کیا ہوگا۔؟"

صبا نے آگے بڑھ کر اپنا چہرہ میرے چہرے پر رکھ دیا اور کہا۔ "مجھے پرواہ نہیں۔ منظور حسین کو یہیں آجانے دو۔ تمہارے سامنے میں بات صاف کر دوں گی"

"لیکن کیوں؟"

"یہ مجھ سے نہ پوچھو۔ خدا کے لیے نہ پوچھو۔ میں اس دھوکے سے بچ گئی جو میں اپنے آپ کو دے رہی تھی۔ تم چپ رہو، یہی بس ہے۔" اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور ان میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لیکن مجھے یہی محسوس ہورہا تھا کہ اس کے آنسوؤں میں کسی دکھ یا غم کی تلخی نہیں تھی، بس حرارت تھی ایک ایسے جذبے کی جو اس کے خون میں شاید لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔

صبا بے تحاشہ مجھ سے لپٹ گئی اور پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ میرا یہاں آنا تم کو برا لگا؟"

میں بالکل لاجواب تھا۔ ایک بار مجھے دروازے کے چوکھٹے میں منظور حسین کھڑا نظر آیا اور غائب ہو گیا۔ مجھے لگا اس کا ہاتھ میرے سینے کے اندر کہیں پہونچ گیا ہے اور وہ چاہتا ہے اسے وہاں جو کچھ مل جائے وہ سب نوچ کر مسل ڈالے۔ میں نے اس

اندھیرے میں ایک بار صبا کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی، صبا نے پوچھا۔ "برا لگا نا؟
میں پھر بھی لاجواب تھا لیکن اس بار ایسا محسوس ہوا کہ میرا ہر موئے بدن اس کا جواب بنا ہوا ہے کہ تم نے یہاں آکر مجھ پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے، تمہارے اس طرح آجانے سے مجھے پھر یہ یقین کیوں ہو رہا ہے کہ میں واقعی پوری طرح زندہ ہوں۔ یہ کیسا نشہ میرے ذہن پر چھا رہا ہے کہ میں واقعی میں ہوں۔ جیسے ایک بڑی جنگ کے بعد میں نے فتح پائی ہے۔ اس بات کا احساس ہوا کہ میرے اندر ایک جذبہ انتقام تھا جو تہہ بہ تہہ جما ہوا تھا اور آج وہ پگھل رہا ہے اور میں نے اپنے ایک حریف کو ایک ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ وہ زمین چاٹ رہا ہے۔

ایک فتح مندی کے احساس و یقین کے ساتھ میں نے پہلی بار صبا کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ اس گہرے اندھیرے میں بھی اس کے گرم ہونٹوں کی سرخی میری نظر میں تھی۔ گرمی میرے احساس میں تھی۔ کس قدر اطمینان کے ساتھ میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے، بس جیسے رکا دریا بہہ نکلا۔ ایک عجیب تموج تھا، ہم دونوں ڈوب رہے تھے، ابھر رہے تھے۔ میری نظروں سے اندھیرے چھٹنے لگے اور فضا میں نئے رنگ ابھرنے لگے۔ یہ سب کچھ کیا تھا، کیوں ہو رہا تھا۔ اتنی فرصت نہیں تھی میرے پاس کہ یہ سب کچھ سوچوں اور سمجھوں۔ لمحہ بہ لمحہ رنگوں کا سیلاب بڑھ رہا تھا۔ "یہ سمی ہے۔ کیسے تڑپ رہی ہے۔ یہ صبا ہے، کیسے بہک رہی ہے۔ سمی کے ہونٹوں نے میری اندر آگ لگائی تھی اور میرا سارا وجود پگھل گیا تھا، لیکن پھر بھی میرا وجود میرا وجود تھا۔ لیکن صبا۔! میرا سارا وجود جیسے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا، ہم دونوں جل رہے تھے۔ ان شعلوں میں اندھیرے جل رہے تھے، اندھیرے جل کر اور سیاہ ہو رہے تھے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بس لگتا تھا کہ ایک ناگن مجھ سے لپٹ گئی ہے اور مسلسل ڈسے جا رہی ہے۔ اس کے زہر سے میرا سارا بدن پھنک رہا ہے۔ نہ کوئی ہوش تھا نہ حواس تھے، بس سب کچھ جل رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں ایسا محسوس ہوا کہ اس آگ کی شدت میں کسی دریا کا ایک سیلاب سا آگیا۔ ہم دونوں اس میں کود پڑے ہیں، بنا یہ سوچے کہ موجیں ہم کو کنارے کی طرف لے جاتی ہیں یا گہرائیوں کی طرف ایک بڑی موج سی آئی اور ہم کو ساتھ بہا لے گئی۔ کہیں کوئی سہارا نہیں تھا۔ اس

موج نے ہم کو گہرائیوں کی طرف دھکیل دیا۔ ہم دونوں ڈوب رہے تھے، اتاہ گہرائیوں میں ڈوب رہے تھے۔ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چاروں طرف سے ہم کو موجوں نے گھیر لیا تھا اور ہم تھپیڑے کھا رہے تھے۔ پھر ان موجوں نے ہم کو اوپر اچھال دیا۔ ہم دریا کی سطح پر تھے اور اب ہلکی ہلکی موجیں ہم کو کنارے کی طرف بہا لے جا رہی تھیں۔

اف صبا کی عمر ہی کیا تھی۔ لیکن اس کے پاس سب کچھ تھا۔ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے پاس بے خوفی تھی، ہمت تھی، لاپروائی تھی اور ایک نشہ تھا.... وہ کیسے نشے میں چور تھی۔ اس وقت جو نشہ اتر گیا تھا تو بھی اس کی ہر بات سے لگتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور میں؟ میں تو جیسے آج تک ساری زندگی ہی سے بے خبر تھا۔ بس خیال ہی خیال تھے۔ احساس ہی احساس تھے۔ ارمان ہی ارمان تھے۔ دکھ بھری، سکھ بھری سوچ تھی اور سوچ ہی سوچ تھی۔ اس کی منزل کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ آج کی رات جیسے میرے ہر موئے بدن سے ہو کر گزری تھی اور اس رات کا سارا رس میرے بدن میں ایک نیا خون بن کر دوڑنے لگا تھا۔

صبا کس اپنائیت اور بے پروائی سے مجھ سے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے کے اندھیرے میں اب میں زیادہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس کے کھلے کھلے بدن کو اب رات نے ڈھانک لیا تھا۔

ایسے میں پھر کچھ یوں ہوا کہ لگا کوئی عجیب سی کیفیت جو میرے کمرے کے کسی کونے میں چھپی بیٹھی تھی ہوا کے ہلکے جھونکے کے ساتھ میری طرف بڑھی اور مجھے جکڑ لیا۔ میں سرتاپا ساکت تھا۔ وہ حیرت کی انتہائی شدت تھی یا سکتے کا عالم۔ میں کچھ سمجھ سکوں اس وقت یہ بات ممکن نہیں تھی۔ محسوس تو یہی ہوا کہ میری آنکھوں پر کہیں پپوٹے نہیں تھے۔ آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں اور آنکھ بند کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

بڑی ہی مشکل سے، بڑا ہی سست رفتار، جیسے بہت وزنی ہو، یہی کا خیال آیا اور سینے پر ایک سرد وزن بن کر جم گیا۔ پھر کچھ دیر بعد منظور حسین کی شبیہہ اس اندھیرے میں ابھری۔ اس کی آنکھیں انگاروں جیسی لگیں اور میرے سینے کو داغنے

لگیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں جب کوئی احساس اپنی شدت پر پہونچ جاتا ہے تو وقت اپنی قربت کا یقین دلاتا ہے۔ ایک ہمت سی پیدا کرتا ہے۔ یہ وقت کا ایک بڑا گن ہے، بڑا وصف ہے۔ مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ میری کھلی اور جلتی ہوئی آنکھوں پر اب رات اپنے اندھیروں کے گالے بنا بنا کر رکھ رہی ہے اور وہ گالے آنکھوں کے پپوٹے بن رہے ہیں۔ آنکھیں بند ہونے اور کھلنے لگی ہیں۔ سینے پر جو منجمد بوجھ تھا وہ پگھلنے لگا ہے۔ منظور حسین کی شبیہہ اندھیروں میں تحلیل ہونے لگی ہے۔ اب نظروں کو ایک سمت مل جانے کا یقین ہو چکا تھا۔ اس وقت صبا میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ رات اور کچھ صبح بنی ہوئی۔ سوچا شاید وہ مجھ سے کہنے لگے۔ "مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی" یا "تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا"۔ لیکن میرے اندر تازگی کا ایک احساس جاگ گیا جب اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ میں اس سے لپٹ گیا۔ میں نے کہا۔ "میں تمہارا ہوں۔" اس بات پر پتہ نہیں کیوں میرے اندر ہی اندر کوئی چیز مجھ پر ہنس پڑی۔ اس پر صبا نے کہا۔

"میں تمہاری نہیں ہوں۔ لیکن کل پھر تم سے ملنے آؤں گی۔"

بڑی ہی تیزی سے صبا میرے کمرے سے نکل گئی جیسے رات کی اس گھڑی میرے کمرے سے نکلنے میں اسے کوئی عار نہیں، کوئی خوف نہیں اور آگے اندھیرے ہوں یا اجالے بہر حال وہ محفوظ ہے۔

اس کے باہر چلے جانے کے بعد مجھ میں ایک ہمت سی آگئی تھی۔ اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ منظور حسین دراصل اس رات سے بچ کر کہیں بھاگ رہا ہے۔ بس بھاگا جا رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ رات کی رفتار سے کئی گنا زیادہ تیز رفتار سے بھاگ کر جلد سے جلد وہ صبح تک پہونچ جائے۔ اور اس صبح کے آئینے میں اپنی صورت دیکھے۔ اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرے کہ کہاں کوئی کمی ہے۔ وہ بھاگ رہا تھا اور رات اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس رات کے اندھیرے اس کے لیے جا بجا پھسلن بن گئے تھے اور وہ جگہ جگہ پھسل کر گر رہا تھا۔ اس رات وہ کس طرح سو سکتا تھا۔ وہ جہاں بھی تھا اور جس کیفیت میں بھی تھا اسے یقیناً صبا سے زیادہ صبح کا انتظار تھا۔

ہر رات کی بہر حال صبح ہوتی ہے۔ صبح ہو گئی۔

صبح کی ٹھنڈکوں میں مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ کہیں ایک زخم لگ گیا تھا جو صبح ہوتے ہوئے مندمل ہو گیا ہے، لیکن کوئی ناخن اسے آہستہ آہستہ کرید رہا ہے۔ سمی !! "اف یہ کیسا بیمار ذہن ہے، یہ ذہن تو خیالوں کا تابع ہے حالانکہ خیالوں کو ذہن کا تابع ہونا چاہیے۔ سمی تو ایک رکا ہوا دریا تھی۔ اور صبا! صبا اپنا بند توڑ کر یہ نکلی تھی جانے کون اس کی منزل تھی۔

اس صبح کے بعد نہ پھر کوئی رات آئی نہ صبا۔ دن کی روشنیوں میں منظور حسین اپنی آنکھیں چرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے جلی ہوئی رات کی راکھ ملی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی سیاہی میں اس کی آنکھوں کی سفیدیاں زیادہ نمایاں تو تھیں لیکن وہ اپنے چہرے کی سیاہیوں میں اپنے آپ کو پوری طرح چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔ " تم کو معلوم ہے صبا آج اپنے گاؤں جارہی ہے، اس کے گاؤں سے بلاوا آیا ہے۔"

باب (۱۵)

بدبختی کی طرح بدوقتی بھی شاید کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کا احساس مجھے اس وقت پہلی بار ہوا جب صبا چلی گئی۔ رنگ پور جو دراصل اپنی جگہ بے رنگ تھا، اپنی بے رنگی بھی کھونے لگا۔ وہ اب بالکل ایک ڈھیلا ڈھالا، بدوضع اور بدشکل ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتا تھا۔ بالکل بے جان۔ مجھ پر اس کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں امتحان پاس کر چکا تھا اور اب رنگ پور سے آزاد تھا۔ میری زندگی کا سب سے حیرت انگیز موڑ میں نے طے کر لیا کہ مجھے سیدھے اپنے گاؤں چلے جانا چاہیے۔

گاؤں پہونچا۔ وہاں فصلیں کٹ چکی تھیں۔ کھیتوں کی سبز رنگتیں زرد رنگتوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ مجھے بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ مجھے ان مناظر سے اب لینا کیا اور دینا کیا۔ اپنے گھر سے پہلے میں سمی کے گھر گیا تھا۔ وہاں دیوار سے لگا وہ پیڑ کھڑا تھا جس کی ٹہنیوں سے لٹک کر میں نے ایک رات سمی کے گھر کے اندر پھاندنے

کی کوشش کی تھی ۔ لیکن آج نہ اس پیڑ کے پتے ہرے تھے نہ ان دیواروں میں سانس لینے کا اندازہ تھا ۔ سمی کے گھر کا دروازہ بند تھا اور دروازے پر کچھ مکڑیوں کے جالے پھیلے نظر آرہے تھے ۔ مجھے میری آنکھیں بند محسوس ہوئیں ۔ اپنی آنکھوں میں کچھ اندھیرے کچھ اجالے لیے اپنے گھر پہونچا ۔ بھابی نے بڑے دلار سے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے مجھے میرے امتحان پاس کرنے پر مبارکباد دی ۔ لیکن ان کی آنکھیں مجھے بجھی بجھی سی لگیں ۔ ہونٹ خشک لگے ۔ ویسے ان کا سارا چہرہ ہی بدوضع لگا اور ان کی ہنسی بے رنگ ۔ انہوں نے سمی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ۔ میں نے اشارۃً کچھ پوچھا تو بڑی ہی لاپروائی سے سمی کے بارے میں مجھ سے کچھ کہا ۔ جس میں سمی کا کوئی اتا پتہ نہیں ملتا تھا ۔ گھر کی ساری ہڈیاں نکل آئی تھیں ۔ گھر ایک ویرانہ تھا بڑا ہی بھیانک ۔

سمی چلی گئی تھی ۔ اپنے پیچھے ایک ایسی گہرائی چھوڑ کر کہ میں اس میں اتر بھی جاتا تو شاید اس کی تہہ نہیں ملتی ۔ ایک ایسا گہرا اندھیرا جس میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا ۔ اگر میں زور زور سے چیخ پڑتا تو سوائے میری اپنی آواز کے کچھ اور سنائی نہیں دیتا ۔ میں گھبرائے ہوئے اس اندھیرے میں اس لیے ہاتھ مار رہا تھا کہ شاید کوئی سہارا مل جائے ۔ صبا ہی کہیں مل جائے ۔ لیکن ایسا لگا کہ ان اندھیروں میں گھبرا کر جب ادھر ادھر ہاتھ مارتا ہوں تو ایک ملائم سا لباس ہاتھ لگتا ہے ۔ صبا کی خوشبو ہے اس میں لیکن صرف لباس ہاتھ میں آگیا ہے اور وہ بے لباس ......

مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرے پاؤں کٹ گئے ہیں اور میں صرف اپنے ٹخنوں کی نکیلی ہڈیوں پر آگے بڑھنے کی کوشش میں ہوں اور ان ہڈیوں سے خون رس رہا ہے ۔

کھیتوں کے ہریالے پن پر ایک سیاہی آگئی تھی ۔ شام کی سرخیوں میں چراغوں کا دھواں پھیلا پھیلا لگتا تھا ۔ دن کے سورج کو تو جیسے ہمیشہ کے لیے گہن لگ گیا تھا ۔ گاؤں اور چھوٹی چھوٹی بستیاں ، کھیت ، جنگل سب ایک بے رنگ وادی میں سکڑے سکڑائے نظر آرہے تھے اور میں ایک تیز رفتار ٹرین میں بیٹھا چلا جارہا تھا ۔

باب (۱۶)

میں نے پہلے کبھی اتنا طویل سفر نہیں کیا تھا ۔ اور زندگی میں پہلی بار میں ایک

بڑے شہر کو جارہا تھا۔ مجھے خواہ مخواہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ گاڑی بڑی تیز رفتار سے دوڑ رہی ہے اور شہر کی طرف جاتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک احساس تکبر آچلا ہے کھڑکیوں سے جو ہوائیں آرہی ہیں وہ مجھے زیادہ سرد لگ رہی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ میرے ساتھ سفر کرنے والے سب مسافران ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کیونکہ یا تو وہ سب شہر کے رہنے والے ہیں یا پھر شہر جانے کی ان کو عادت ہے۔

ویسے کتنی ہی بار ٹرین میں چھوٹے چھوٹے فاصلوں کا سفر میں نے بھی کیا تھا لیکن یہ سفر کچھ اتنا طویل لگتا تھا جیسے منزل پر پہونچوں گا بھی تو منزل ایک خوشگوار بوجھ بن جائے گی۔ پھر بھی جی میں ایک ترنگ سی تھی۔ بار بار میں سگریٹ جلا رہا تھا۔ کچھ لوگ مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جن میں ہلکی ہلکی ناپسندیدگی یا ناراضگی کا اظہار تھا۔ یعنی میرے سگریٹ پینے پر ان کو طیش آرہا تھا، اس لیے نہیں کہ میرے سگریٹ کے دھنویں سے ان کو کچھ تکلیف ہو رہی تھی بلکہ میری عمر کے لحاظ سے اس طرح بار بار سگریٹ پینا ان کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس پر تو مجھے بھی ان کے دیکھنے کا انداز یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ یہ کون ہوتے ہیں مجھے اس طرح دیکھنے والے۔ لیکن آج کبھی ان نظروں کا خیال آتا ہے تو ایک یقین سا ہوتا ہے کہ خواہ انسانوں میں ایک دوسرے کے لیے کتنی ہی ناپسندیدگیاں، خصومتیں، دشمنیاں کیوں نہ ہوں، ایک دوسرے کے لیے ایک بنیادی تعلق سب میں ہوتا ہے۔ جب سبھی مسافروں نے مجھے ناخوشگوار انداز سے دیکھنا شروع کیا تو میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ ہوا بہت تیز تھی سگریٹ کا دھنواں سینے میں اترنے کے بعد باہر نکل نہیں پا رہا تھا۔ ابھی شام ہونے والی تھی، سورج مغرب کے ماتھے پر مدھم مدھم سا لگ رہا تھا۔ اچانک سامنے سانپ کی طرح رینگنے والی ٹیڑھی میڑھی ایک ندی آگئی جو تھوڑی ہی دیر میں سانپ ہی کی طرح تیزی سے دوڑنے لگی۔ پھر وہاں سامنے ایک گاؤں آگیا۔ گول گول گاؤں، گول گول جھونپڑے، ان کے اطراف گھومنے والی گول گول زمین، اس زمین پر گھومنے والا گول گول پہاڑ۔ اور پھر اس گھومنے والے پہاڑ کے گھیرے میں لٹو کی طرح گھومنے والا وہ گاؤں، جو تھوڑی دیر گھوم گھوم کر اچانک غائب ہو گیا۔

وہ گاؤں بھی تو گھومتے گھومتے پتہ نہیں کہاں چلے گئے، جہاں سمی تھی، صبا تھی

میرے اندر کہیں کسی جگہ کوئی موہوم سا خیال ہی تھا نہ ہلکی سی امید کہ مجھے وہ کھویا ہوا سب کچھ پھر مل جائے گا۔ بار بار ایک شدید نقصان کا احساس ہو رہا تھا اور جی کے اندر ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی، ایک گھناؤنا اندیشہ، ایک بھیانک یقین ہونے لگا تھا کہ اس نقصان کی اب کبھی تلافی نہیں ہوگی۔ جو گیا، سو گیا۔

تیز رفتار گاڑی نے واقعی ایک تکبر کے احساس کے ساتھ ایک اچھے خاصے اسٹیشن کو نظرانداز کر دیا۔ کھٹاک۔ کھٹاک پٹریاں بدلیں اور پھر اگلے سگنل سے بھی نکل کر جنگلوں میں دوڑنے لگی۔ شہر کی طرف۔ مجھے ٹرین کے باہر کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ قریب آنے والے شہر کا تصور بھی بد وضع سا لگا، جیسے وہ میری منزل نہیں۔ اب شام کافی سرخ ہو چلی تھی، ساری بوگی میں سرخیاں پھیل گئی تھیں، مجھے بہت سے مسافروں کے چہرے نیلے، اودے، کالے لگ رہے تھے۔ اچانک مجھ سے بہت قریب ٹک ٹک سی آواز سنائی دی جو ٹرین کی کھڑکھڑاہٹ کے باوجود واضح سنائی دے گئی۔ ایک خمیدہ کمر بڑھیا اپنی لکڑی ٹیکتی ہوئی میرے قریب آگئی تھی۔ اس کا چہرہ سوکھی ہوئی زمین لگتا تھا اس کی آنکھوں میں تو جیسے کچھ بھی نہیں تھا صرف ایک ہلکی سی التجا کہ "بیٹے ذرا سہارا دے دے"۔ اس کی زندگی کے دن تو اتنے تھوڑے لگے کہ اس ٹرین کی رفتار کا خیال کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ گاڑی دو گھڑی اور دوڑے تو بڑھیا کی زندگی کا فاصلہ طئے ہو جائے گا۔ مجھے ایسا لگا کہ اچانک مجھے میری سیٹ سے کسی نے اٹھا کر کھڑا کر دیا ہے اور میں نے اس بڑھیا کی لکڑی پکڑ لی ہے۔ اس کے پوپلے منہ پر سہارا مل جانے کے یقین کی ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہیں آنے پائی تھی کہ میں نے اس کو سہارا دے کر اپنی سیٹ پر بٹھا دیا۔ وہ اپنی لکڑی کو نیچے کہیں ٹکانے کے لیے جگہ ڈھونڈھ رہی تھی تو میں نے اس کے ہاتھ سے لکڑی لے لی اور لکڑی سنبھالے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھیں کچھ روشن لگیں۔ بوگی میں پھیلی ہوئی شام کی سرخیاں بھی زیادہ روشن لگیں۔ پھر اچانک کچھ ایسا ہوا کہ پل بھر کے لیے مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر جو کچھ میں نے دیکھا بس وہی سب کچھ بنا آنکھیں جھپکائے دیکھتا رہا۔ دو گھڑی پہلے جس جگہ وہ بڑھیا کھڑی تھی اب وہاں ایک بالکل ہی نوعمر لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے رنگ مجھے گلابی گلابی نظر آئے۔ اس کی نازک سی ناک میں لگا ہوا چھوٹا سا نگینہ اور اس کی ہلکی سرخ پیشانی پر

چمکتی ہوئی بندی، دونوں اپنے اپنے انداز سے دمک رہے تھے۔ ان سے کچھ شعاعیں پھوٹ رہی تھیں یا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بھرپور نظر سے دیکھا، اس کی بالی عمر نے مجھے پوری طرح متوجہ کر لیا۔ اس نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور نظریں جھکالیں۔ کچھ دیر مجھے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی لگا کہ اس کو کس نظر سے دیکھوں۔ ایک نظر میں وہ مجھے ایک کھلتا پھول لگی اور دوسری نظر میں ایک بند کلی۔ لیکن اس کے رخساروں کی سرخی میں ایک حدت سی محسوس ہوئی۔ اس کی پلکوں میں بچپن کی شرارت کی بیقراری کے ساتھ جوانی کا ایک تناؤ بھی نظر آیا۔ بس جیسے اس نے ابھی ابھی کچھ دن پہلے دنیا کو ایک بدلی ہوئی نظر سے دیکھنا شروع کیا تھا۔ وہ مجھے جوان بھی لگی کہ وہ اپنی سانسوں پر میری نظروں کا بوجھ محسوس کر رہی تھی۔ ہلکے سنہرے بال چمکتا ماتھا۔ دھیمی دھیمی آنچ دیتے ہوئے رخسار اور گال جیسے چنگاریاں بکھر رہی ہیں اور شعلے لپکنے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ اس کی چھوٹی سی پر کشش ٹھوڑی اور اس کے ہونٹوں پر کچھ ایسی نمی پھوٹ پڑی تھی، جیسے وہ اپنی جھکی پلکوں سے بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہلکا اودا لباس تھا بالکل معمولی سا۔ وہ پوری کی پوری میری نظروں کے حلقے میں آچکی تھی۔ اسے دیکھتے رہنا مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے مکمل ہو رہی تھی۔ جیسے ایک رنگ رنگیلا گیت نامکمل تھا۔ کچھ بول ابھی بولے نہیں گئے تھے، لیکن خیالوں میں شاید کچھ بہکاوے اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ میں نے اس نشیلی کو ایک ایسی نظر سے دیکھا جس میں اظہار تھا کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ جی میں خواہش ہوئی کہ کسی طرح اس کو یہ بات بتادوں کہ میں شہر کو پہلی بار جا رہا ہوں اور میں بھی اس کی طرح گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ شاید اس طرح کچھ قربت سی محسوس ہو، ورنہ گاؤں اور شہر کے مزاج میں تو ایک اجنبیت ہوتی ہے، کچھ دوری سی ہوتی ہے۔ اس نے اس بڑھیا کی طرف جھک کر کچھ کہنے کی کوشش کی، شاید یہ بتانے کے لیے کہ وہاں اس کا بھی کوئی ہے۔ ریل کے ڈبے میں مسافروں کے بیچ اس طرح اپنے آپ کو اندر ہی اندر ایک اضطراب میں مبتلا پا کر میں نے یہ کوشش ضرور کی کہ اس بڑھیا سے میں نے جو ہمدردی کی تھی، اس کی اہمیت کا احساس اس نشیلی کو دلادوں۔ کچھ تو اس میں مجھ میں تعلق پیدا ہو سکے۔ میں نے اس بڑھیا سے بہت آہستہ سے کہا۔

"کیوں ماں جی، تم آرام سے تو ہو؟"

بڑھیا نے بڑی ہی پر تشکر نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ اور بھی قابل رحم لگی۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں تو یہ اظہار تھا کہ زندگی میں پہلی بار اس سے کسی نے اس طرح کی ہمدردی کی ہے۔ اسے کچھ مان دیا ہے۔ زندگی کی مجبوریوں اور محرومیوں کا اظہار پتہ نہیں کن کن کمزور جذبوں کو اتھل پتھل کر دیتا ہے۔ میں نے ان جذبوں کے کرب سے بچنے کے لیے ایک بے معنی سی نظر ڈبے میں چاروں طرف دوڑائی۔ مجھے سارے ہی مسافر ایک سے لگے۔ سب کے چہرے دھندلائے سے تھے، بس، نشیلی کا چہرہ روشن تھا۔ جو مجھے دھیمی دھیمی آنچ میں تپتا ہوا نظر آرہا تھا۔

اچانک گاڑی کی رفتار کم ہو گئی، میرے ذہن کو بھی جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ کھٹاک، کھٹاک گاڑی پٹریاں بدل رہی تھی۔ بس دو ہی گھڑی بعد گاڑی کی رفتار کا شور دھیما پڑنے لگا جیسے اب وہ پٹریوں پر رینگ رہی ہو۔ تھوڑی دیر میں گاڑی رک گئی۔ ایک بہت ہی چھوٹا سا لیکن بہت ہی خوبصورت اسٹیشن سامنے تھا۔ اسٹیشن پر بڑے بڑے اور سرسبز و شاداب پیڑ تھے۔ پیڑوں کا سایہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں سارے پلیٹ فارم پر اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ ہر جگہ ایک رنگ سا بکھر الگ رہا تھا۔ میرے ڈبے کے سامنے پلیٹ فارم پر ایک چھوٹا سا ٹیبل رکھا نظر آیا جس پر چائے کی ایک بڑی سی کیتلی رکھی تھی۔ مسافر بڑی ہی تیزی سے وہاں جمع ہو رہے تھے۔ چائے والا بڑی ہی پھرتی سے ان کو چائے دے رہا تھا لیکن زیادہ پر کشش وہ دو تین بڑے بڑے شیشے کے مرتبان تھے، جن میں کم از کم اس وقت کام و دہن کو اکسانے والی اشیائے خوردنی رکھی تھیں۔ کچھ شیریں، کچھ نمکین۔ میں تیزی سے گاڑی سے اتر پڑا۔ ذہن نے تو جیسے میری بے خبری ہی میں طے کر لیا تھا کہ کچھ کرنا ہے۔ جیسے مجھ سے کوئی یہ سب کچھ کروا رہا تھا۔ جلدی جلدی میں نے چائے کے دو کپ ٹیبل سے اٹھائے اور تیزی سے دوڑ کر بڑھیا کے ہاتھ میں ایک تھما دیا اور دوسرا کچھ دیر اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا۔ اس وقت واقعی لمحہ بھر کے لیے میں اپنے آپ سے جیسے الجھ گیا۔ بڑھیا نے بھی میری مدد کرنے میں کچھ توقف کیا۔ میری زبان سے نکل ہی گیا۔ "ماں جی، اپنی لڑکی کو دیدو" بڑھیا نے وہ کپ تو اپنے کانپتے ہاتھ میں لے لیا لیکن ایک بار سارا پلیٹ فارم میری نظروں میں گھوم

گیا۔ میرا سر چکرا گیا ۔ پھر بڑھیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور اس لڑکی کے ہاتھ میں کپ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے ہی ڈبے کے سامنے پلیٹ فارم پر اپنی جگہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا ہوں ۔ پلٹ کر میں چائے والے سے ایک اور کپ اپنے لیے لے ہی رہا تھا کہ ڈبے کے ایک کونے سے ایک گرج دار آواز آئی ۔ "واہ، بڑے انسان دوست لگتے ہو نوجوان ۔ ہم کو بھی ایک کپ چائے دلوادو۔"

وہ جس کی آواز تھی، اس کو میں نے واضح طور پر دیکھا نہیں ۔ لیکن اپنے آپ پر اس آواز کی گرفت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ایک کپ چائے ادھر بڑھادی ۔ تب وہ آواز میرے سامنے اس کھڑکی کے فریم میں ایک واضح شکل میں ظاہر ہوئی ۔ اسی لمحے میرے ذہن میں یہ الفاظ آہستہ سے گونج گئے ۔

"وہی ۔ بالکل وہی، ہو بہو یہی تو میں نے اکثر دیکھا ہے ۔ یہی سب کچھ تو اکثر میری نظروں کے سامنے ابھرتا رہا ہے ۔ اعتبارِ انسانیت کی ایک وجیہہ شکل ۔ شفقت بھرے تبسم سے روشن ماتھا، افق جیسا صاف سرخ، سفید اور فکر و علم کے خطوط میں، معنوں کا اختصار ۔ پروفیسر ہوگا ۔ اکثر کبھی بے معنی لمحوں میں جانے کس طرح اور کیوں یہی شکل تو میری نظروں کے سامنے آجایا کرتی تھی ۔

گاڑی نے سیٹی دی ۔ میں نے چائے والے کا بل ادا کیا اور گاڑی میں چڑھ آیا ۔ گاڑی چلنے لگی ۔ پلیٹ فارم کے بڑے بڑے سرسبز پیڑ جھوم گئے ۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے ۔ میں اب کچھ ہلکا سا اعتماد اور نشیلی سے رسم و راہ پیدا کرنے کا حق لیے اپنی سیٹ کی طرف چلا آیا ۔ چاہتا تھا کہ اب نشیلی کو دیکھ کر کچھ اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے مسکراپڑوں ۔ وہ بھی یقیناً مسکراپڑے گی ۔ پھر پوچھوں "چائے اچھی تھی؟" لیکن ان الفاظ کے ادا ہونے سے پہلے میری آواز صرف میرے ہی اندر گونج گئی ۔ کیسی گونج تھی وہ ۔ مجھے محسوس ہوا تھا میں خود ایک گونج ہوں ۔ صدائے بازگشت ۔ ہاں کچھ ایسا ہی ہوا ۔ یہی لگا کہ اب میں واپس گاؤں کی طرف جارہا ہوں اور گاڑی اچانک پیچھے کی طرف دوڑنے لگی ہے ۔ زندگی میں پیچھے کی طرف بڑھنا، وہ بھی تیز رفتار سے بڑھنا، کتنا رومان انگیز ہوتا ہے! مجھے لگا اب مجھے آگے کچھ کرنا نہیں ہے بس اپنی زندگی کو دہرالوں گا ۔ ایک بار پھر جی لوں گا ابتدا سے ۔ سبھی سے مل کر وہ ساری باتیں کرلوں گا، وہ

سارے راستے بنالوں گا، جو بس ایک حسرت ہی بنے جا رہے تھے۔ اور پھر صبا سے بھی مل لوں گا، اب پورے ہوش و حواس اور پوری ہمت اور اعتماد کے ساتھ، اس کے ساتھ ایک نہیں کئی راتیں گزار لوں گا اور پھر رنگ پور کے تھیٹر والی سے وہ سب کچھ طے کر لوں گا کہ زندگی میں ہم کو کہاں کہاں ملنا ہے، کس کس طرح ملنا ہے۔ میں تو راجہ اندر بن کر اپنے دربار کو اس کے رقص سے سجاؤں گا۔ میں ہی میں تو رہوں گا۔

جی چاہا کہ اس گاڑی کی رفتار بڑھانے کی کل اب میرے ہاتھ میں آجائے اور میں گاڑی کو تیز سے تیز تر کر دوں۔ تاکہ یہ سب کچھ میرے بس میں آجائے۔ یقین سا ہونے لگا کہ انسان کو ابتدا سے پھر ایک بار اپنی زندگی جینے کا اختیار دے دیا جائے تو وہ اپنی زندگی کے سفر کو کس سوجھ بوجھ اور سلیقے سے طے کر لے گا۔ بھٹکیگا بھی تو کس یقین اور سوجھ بوجھ کے ساتھ، لذت آشنا ہی تو رہے گا۔ ساری ہی منزلوں اور سارے ہی مقامات سے وہ آگاہ رہے گا کہ یہاں مجھے رک جانا ہے، یہاں سے مجھے مڑ جانا ہے، یہاں مجھے آگے بڑھ جانا ہے۔ سبھی کچھ تو معلوم رہے گا کہ کب اور کہاں سمی ملنے والی ہے۔ تھیٹر والی سے مل لینا کتنی معمولی سی جرات کی بات ہوگی۔ صبا کو تو پہلی ہی نظر میں پورے یقین کے ساتھ اپنی سمجھ لوں گا۔ پھر واہ، خوب پڑھ لکھ کر بڑا بن جانا کتنا آسان ہو جائے گا۔ اور بڑا بننا کتنا پسند آئے گا۔

پھر نہیں معلوم کیا ہوا۔ ان خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اب میری نظر کے سامنے کچھ تھا تو صرف وہ پروفیسر تھا۔ اس کے چہرے پر روشن روشن مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہنستی ہوئی روشنی تھی اور وہ روشنی شہر کے تصور جیسی بھاری بھاری لگ رہی تھی۔

گاڑی کی ایک لمبی کوک سنائی دی جیسے آنے والے اسٹیشن کو گاڑی اپنی آمد سے آگاہ کر رہی تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ آگے۔ شاید یہ خیال آیا تھا کہ زندگی صرف ایک احساس ہے، بڑا ہی کرب آمیز۔ ایک بہلاوا ہے، بڑا ہی درد انگیز اور کیا ملتا ہے، سوائے اس بے معنی آواز کے، جسے کہنے والے گاڑی کہتے ہیں، یا زندگی۔ پروفیسر کی مسکراہٹ یہ بتا رہی تھی کہ اس کی نظریں میرے دماغ میں اٹھنے والے ہر خیال کو پڑھ رہی ہیں۔ پروفیسر وہی تو ہوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں

اٹھنے والے خیالات کو پڑھ لیتے ہیں۔ پہلے زندگی کو ایک راز بتاتے ہیں اور پھر اس راز کو عیاں کر دیتے ہیں اور انسان بہل جاتا ہے۔

پروفیسر کی نظریں اس وقت ایک موٹی سی کتاب کے صفحات پر جمی ہوئی تھیں اس کی آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک تھی، جس سے ایک روشنی پھوٹ رہی تھی اور اس روشنی میں ایک ارتعاش سا تھا اور وہ روشنی ساری بوگی میں ایک خواب کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ لگا کوئی بھی تو نہیں بوگی میں۔ میں اکیلا ہوں اور جہاں پروفیسر ہے وہ پروفیسر نہیں ہے وہ دراصل میں ہوں۔ میں کتنا بڑا آدمی ہوں۔! میری آنکھوں سے زیادہ میری وجیہہ عینک کے شیشے روشن ہیں اور وہ ان ہی شیشوں کی روشنی ہے جو اس کتاب کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور نہ صرف ان پر لکھا ہوا ایک ایک لفظ روشن ہے بلکہ اس کے کئی کئی معنی روشن ہو رہے ہیں۔ زندگی کتنی پیچھے رہ گئی ہے! میں کتنا آگے نکل چکا ہوں۔ ہاں ہاں بہت آگے۔ جہاں صرف روشنی ہے، اور ایک خلا ہے۔ بڑا آدمی!! کہاں رہتا ہے وہ۔؟ جہاں صرف ایک احساس رہتا ہے، ایک کرب رہتا ہے اور ایک بہلاوا ...... جی تڑپ اٹھا۔

یہ کیسا کسیلا احساس ہے، زندگی جب اپنے معنی مطلب سمجھانے لگتی ہے تو کس قدر بدمزہ، پھیکی اور سوکھی ساکھی ہو جاتی ہے۔ جیسے سوکھی لکڑی کا ٹکڑا، کِرم خوردہ، دیمک زدہ۔ لیکن جب سمجھ بوجھ کی زد سے محفوظ رہتی ہے تو ایک ہری بھری ٹہنی کی سی لگتی ہے، ہواؤں میں جھومتی ہوئی۔ کتنی لہلہاہٹ ہوتی ہے زندگی میں۔ اور اس کے رس دار ہونے کا احساس، آہ۔ مزہ کیسا ہی ہو مگر بے خبر عمر ہی سب کچھ ہے۔ نہ کچھ آگے کا علم نہ کچھ پیچھے کی یاد۔ ہائے رے عمر کا ایک ایسا لمحہ۔

"وہ ضرور سو گئی ہو گی"۔ تشیلی کی طرف میری نظروں نے پورے یقین کے ساتھ دیکھا۔ وہ بڑھیا کے کندھے پر سر رکھے اپنی آنکھیں بند کیے ہوئی تھی۔ مجھ سے بے خبر۔ دنیا سے بے خبر۔ اس کی بے خبری مجھے خبردار بنائے جا رہی تھی، مجھ سے مطالبہ کر رہی تھی کہ میں اب بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کروں۔ کچھ تو یقین اور اعتماد کے ساتھ اس سے اپنے تعلق کو طے کر لوں۔ اس بارے میں کوئی تو فیصلہ کر لوں کہ اس کے قرب کی ایک شدید خواہش جو دل میں اچانک تھرک اٹھی ہے اس میں کچھ اور

ایندھن جھونک دوں یا پھر دھیرے دھیرے پانی چھڑک دوں اس پر۔ جوانی کی اس سے بڑھ کر ناقدری اور کیا ہوگی کہ عشق جیسے جذبے کو ادھورا چھوڑ دوں۔

میں نے اپنے سارے احساسات اور خیالات کو ٹرین کی کھڑکیوں سے باہر جانے سے باز رکھا۔ میں چاہتا تھا میں صرف اس ڈبے کے اندر ہی محفوظ رہوں، تھوڑی دیر اور۔ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی رک گئی۔ پلیٹ فارم پر دو تین جگہ صاف ستھری قندیلیں سات آٹھ فٹ اونچے کھمبوں پر لگی ہوئی نظر آئیں۔ مدھم روشنی تھی اور ہوا ٹھنڈی۔ اچھا لگا۔ اپنے آپ کو سفر میں میں نے پہلی بار کچھ ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ایسے مشفق و مہربان لمحات بس یونہی چلے آتے ہیں زندگی میں اور تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ زندگی بھی بڑی ہی معمولی سی شئے معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آجاتی ہے، ایک احساس جیسی۔ گاڑی پھر چلنے لگ گئی تھی۔

میری نظر پروفیسر پر پڑی تو میرا ہی ایک احساس پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر پھیل گیا۔ وہ مسکراہٹ مجھے اپنی ہی لگی۔ میں پورے ہوش اور سکون کے ساتھ پروفیسر کے قریب چلا گیا۔ کتنی وجاہت تھی اس کے چہرے پر۔ میں تو دو لمحوں کے لیے اپنے اندر ٹھہر سا گیا۔ اس کے چہرے پر سرخ رنگ اب بھی تازہ تازہ لگتا تھا، چمکیلا۔ اس کے ماتھے پر میری نظر ٹھہر نہیں پاتی تھی، بڑے ہی مشکل اور اونچے قسم کے علم کی چمک تھی وہاں۔ بڑی کٹھن منزل لگتی تھی وہ میری نظر کے لیے۔ پھر اس کے سفید بالوں میں زیادہ چمک تو جوانی کی تھی۔ جسم و جثہ کیا تھا ایک شکل تھی تمکنت و وقار کی۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر لگی عینک کے عدسوں پر طلوع آفتاب ایسے کا سا عالم تھا یا غروب آفتاب کا سا کہ ان میں دنیا کا عکس کہیں روشن روشن تھا کہیں مدھم مدھم۔ تھا نا بڑا آدمی۔ واہ ایسے ہوتے ہیں بڑے آدمی۔ ویسے میں نے کچھ ہی دیر بعد اپنے آپ کو پروفیسر کے قریب بیٹھا ہوا پایا، لیکن اس احساس کے ساتھ کہ دو گھڑی پہلے میرے اندر کچھ تو تھا، لیکن اب کچھ بھی نہیں ہے اور میں اب بالکل خالی خالی سا ہوں۔

پروفیسر کا نرم و ملائم ہاتھ میرے شانے پر تھا۔ میں نے اس کی طرف اس طرح

دیکھا کہ بس ....

ایک بڑی ہی گرجدار، سلجھی ہوئی اور پرسکون آواز میرے کانوں میں گونجی۔
"کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔؟"

اب میری آواز بھی مجھے صاف لگی۔ "میرے دماغ میں تو آپ کے لیے صرف سوال ہی سوال تھے لیکن زبان پر آنے آنے تک اب ایک ہی سوال رہ گیا ہے، نہ پوچھوں تو شاید یہ بھی زائل ہو جائے۔" میں نے بڑی ہی تیزی سے وہ سوال پوچھ لیا۔
"کیا آپ بڑے آدمی ہیں۔؟؟۔"

پروفیسر ہنس پڑا۔ لیکن اس کی ہنسی تو زیادہ ہی مرعوب کیے دیتی تھی۔ اس نے کہا۔ "بس اتنا سا سوال؟"

"نہیں نہیں، میں پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہو کر بھی تھرڈ کلاس میں سفر کیوں کر رہے ہیں۔؟"

پروفیسر زور سے ہنسا۔ لیکن اس کی وہ ہنسی مجھے صاف اجازت دے رہی تھی کہ میں اب پوری طرح اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھوں اور جواب کا منتظر رہوں۔ پروفیسر نے اپنی ہنسی کے مکمل ہونے سے پہلے ہی جواب دیا۔ "میں تو بڑا آدمی نہیں ہوں۔"

"لیکن آپ کو دیکھ کر تو مجھے پہلا خیال یہی آیا تھا اور اب آپ کے قریب آکر بیٹھا ہوں تو آپ اور بھی بڑے نظر آنے لگے ہیں۔" پروفیسر نے اپنی آنکھوں پر عینک کو ٹھیک کیا اور کہا۔

"بہت اونچا پورا ہوں نا؟"

پروفیسر کا جواب مجھے کچھ ہلکا پھلکا تو نہیں لگا، لیکن اپنے ہی سوال میں مجھے کچھ کھوکھلا پن سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے الفاظ سے زیادہ اپنے ہاتھوں میں اندازِ اظہار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں میرا مطلب یہ نہیں" پھر اپنی نظریں جھکا کر بولا۔ "تھوڑا تو سمجھ دار ہوں۔"

اس بار پروفیسر کی عینک کے عدسے مجھ سے قریب آگئے اور ان کی ہلکی روشنی مجھے اپنی آنکھوں میں محسوس ہوئی۔ جیسے مجھے ایک نئی نظر مل گئی ہو۔ میں نے اس نئی

نظر سے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ میں اب اپنے اندر بھی خالی خالی نہیں تھا۔ میں نے سلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرا مطلب ایسے آدمی سے تھا جو علم و دانش سے بڑا بنتا ہے۔
پروفیسر پھر ایکبار ہنسا اور بولا۔ "نہیں، میں بڑا آدمی نہیں ہوں۔"

"آپ تو اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے ہیں۔"

"نہیں، موٹی کتابیں پڑھنے والا بڑا نہیں ہوتا، ان کتابوں کو لکھنے والا بڑا ہوتا ہے۔ ایک کتاب کو پڑھنے والے تو لاکھوں ہوتے ہیں لیکن لکھنے والا ایک ہوتا ہے۔"
پروفیسر نے اپنے قریب رکھی ہوئی ایک موٹی سی کتاب اٹھائی اور اس کے سرورق پر بنی ہوئی تصویر مجھے بتاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، یہ ہے بڑا آدمی۔" میری نظر جب اس تصویر پر پڑی تو میرے کانوں میں آواز آئی "کھٹاک۔" گاڑی نے شاید پٹری بدلی یا پھر مجھے ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اس کتاب کے سرورق پر بنایا ہوا ایک انسانی ڈھانچہ تھا بالکل ڈھانچہ۔ اس ڈھانچے کے ہاتھ میں ایک پتلی سی لکڑی تھی اور اس کے چہرے کی ہڈیوں پر بہت ہی پتلی سی عینک تھی۔ اس ڈھانچہ کا ایک مختصر سا لباس ایک مہین سا کپڑا تھا۔ لپٹا ہوا اور پیروں میں سوکھی ساکھی چپل۔ لیکن چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس کو دیکھنے سے خیال ہوتا تھا کہ ساری تصویر کو مٹا بھی دیا جائے تو شاید وہ مسکراہٹ کتاب پر پھیلی رہے۔ باقی رہے۔

ویسے تصویر تو ایسی نہیں تھی کہ اسے دیکھنے میں اتنی دیر لگ جائے جتنی کہ اس وقت لگ گئی۔ میں نے بنا کچھ زیادہ یقین کیے پروفیسر سے پوچھا۔ "کیا آپ بڑے آدمی اس وقت بنیں گے جب آپ بڑے بنتے بنتے ایسے بن جائیں گے۔؟"

اب پروفیسر بہت زور سے ہنسا اور اس نے میرے ہاتھ سے کتاب لے لی اور اپنے زانو پر رکھ لی۔ پھر کہا۔ "یہ جس کی تصویر ہے، وہ ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ یہ ایک فلسفی ہے، مفکر ہے، سیاستداں ہے۔ ایک بڑی قوم کا بڑا رہنما۔"

میں نے صرف یہی سوچا کہ اس مختصر سے ڈھانچے پر اتنے بڑے بڑے الفاظ کہاں موزوں لگتے ہیں۔ اس پر کہاں چسپاں ہو سکتے ہیں۔ یہ بتانے کے لیے کہ پروفیسر کی بات سے میں کچھ زیادہ ہی متاثر و مرعوب ہو گیا ہوں، میں نے کہا۔ "اف، اتنا بڑا آدمی!!"

پروفیسر نے کہا۔ "ہاں۔ تم بھی چاہو تو اتنے ہی بڑے آدمی بن سکتے ہو"

"اسی لیے تو شہر جارہا ہوں" میں پروفیسر سے یہی کہنے والا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔ پروفیسر سے میں نے کہا۔ "بات ایسی ہے کہ میں بڑا آدمی تو بننا چاہتا تھا، لیکن یہ جان کر کہ آدمی بڑا بنتے بنتے تک اس تصویر جیسا ڈھانچہ بن جاتا ہے، میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

پروفیسر نے ہنستے ہوئے میری پیٹھ پر ایک دھپ لگائی اور کہا۔ "تم ضرور ایک دن بڑے آدمی بنو گے۔"

"بڑے آدمی بنو گے....." پھر کھٹاک سی ایک آواز آئی۔ گاڑی زور کا جھٹکا کھا گئی۔ پروفیسر کے زانو پر رکھی ہوئی کتاب نیچے فرش پر گر پڑی۔ میں نے فوراً وہ کتاب اٹھالی اور پروفیسر کے ہاتھوں میں تھمادی۔ پروفیسر نے وہ کتاب اب اپنے قریب رکھے ہوئے تکیے کے نیچے رکھ لی اور مجھ سے کہا۔

"شاباش، علم کی قدر کرو اور خوب پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ۔"

"شاباش۔ شاباش۔ شاباش۔" ٹرین کچھ ایسی ہی بات کہتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ "شاباش۔ شاباش۔ شاباش۔" وہ آواز تھی اور میں تھا۔ پھر ٹرین کی اس آواز کی تہہ سے ایک ہلکی میٹھی سی آواز بھی ابھر رہی تھی۔ "خوب پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جانا .... ساری دنیا تم کو عزت کی نظر سے دیکھے گی .... اس وقت میں تمہاری دلہن بن کر تمہارے پاس آؤں گی........"

"دلہن ......" اچانک میں نے ڈبے کی کھڑکی سے باہر کچھ اس طرح دیکھا جیسے گھبرا کر باہر چھلانگ لگادی ہو۔ دوڑتی ٹرین کی کھڑکیوں سے باہر کیا کچھ تھا۔ صرف پیچھے بھاگتی ہوئی رات تھی، جنگل تھے یا اندھیروں کے میدان تھے۔ میں نے پروفیسر کی طرف دیکھا، وہ بھی اپنے تکیے پر نیم دراز ہوگیا تھا اور شاید ان اندھیروں میں دوڑتی ہوئی ٹرین سے ہزاروں میل پیچھے بسی ہوئی خوابوں کی دنیا میں کھوگیا تھا۔ اب ساری بوگی خاموش تھی، ٹرین کی اس تیز آواز میں، جو اپنی جگہ ایک سکوت لگتی تھی، اس بوگی کی خاموشی کتنی بھاری بھاری لگ رہی تھی، ساری زندگی پر حاوی۔ پورے اختیارات کے ساتھ چھائی ہوئی۔ برسرِ اقتدار۔

بڑی احتیاط سے میں پروفیسر کے قریب سے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ مجھے اپنے پیر کے نیچے کوئی نرم موٹی سی چیز محسوس ہوئی۔ میں نے ذرا جھک کر دیکھا، وہ ایک لفافہ تھا، دبیز سا۔ شاید اس موٹی سی کتاب کے اندر سے نکل پڑا تھا۔ میں نے آہستہ سے اٹھالیا۔ لفافہ کھلا تھا۔ میں نے پروفیسر کی طرف ایک نظر ڈالی۔ وہ سو چکا تھا پھر لفافے پر نظر ڈالی۔ اندر ایک خط کی طرح بند کیسے ہوئے کچھ کاغذات تھے۔ میں نے پھر ایک نظر سارے ڈبے پر ڈالی، پھر پروفیسر پر۔ پتہ نہیں انسان کی فطرت میں اس طرح کی ایک چبھن، ایک کسک، ایک لذت کس طرح رس بس گئی ہے جو ایسے ایک لمحے پر ہمارے بنائے ہوئے معیار کے لحاظ سے بے ایمانی پر اکساتی ہے۔ بس جان لو۔ پوری طرح جان لو۔ دوسروں کو۔

میں نے وہ لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور وہاں سے اپنی سیٹ کی طرف آگیا اب وہ دبیز سا خط میری جیب میں تھا، اور دل میں ہزاروں وسوسے۔ ایک بڑے آدمی کا خط۔ کیسا ہوتا ہوگا۔؟ کس نے لکھا ہوگا۔ یا کس کو لکھا ہوگا؟ پروفیسر تو خوابوں کی دنیا میں کھو چکا تھا۔ میں نے ڈبے کی ساری ہی روشنی سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ خط کھولا۔ پہلے صفحے پر کچھ ہلکی ہلکی تحریر تھی، کچھ گھبرائے ہوئے یا پُر اشتیاق انداز میں لکھی ہوئی۔ لکھا تھا ....

"جان من، جانانِ من، ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ و بو؟
دل و جان سے عزیز تو اب بھی تم ہی ہو۔ ضبطِ تحریر میں جذبات کو کیسے لاؤں؟

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ تمہاری بتائی ہوئی تاریخ کی صبح میں تمہاری ٹرین پہونچنے سے بہت پہلے اسٹیشن آجاؤں گی، پہچان تو لوگے نا؟ زندگی بھر کی بے چینیوں کے ساتھ۔ صدیوں سے منتظر۔ صرف تمہاری۔

بانو

نوٹ: تمہارا خط یا کہوں تمہاری داستان پارینہ، میں اس مختصر خط کے ساتھ واپس بھیج رہی ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری یہ

داستان ضایع ہو۔ اور کچھ وجوہات کی بناء پر تمہارے یہاں پہونچنے تک اپنے پاس رکھنا اپنے لیے خطرے سے خالی نہیں سمجھتی، تم ساتھ لالینا۔

بس۔ کئی بوسے۔ تشنہ، دوراں
ہمیشہ تمہاری۔ بار بار تمہاری
بانو

اس مختصر سے خط کے ساتھ ایک اور خط منسلک تھا۔ کافی موٹا تگڑا۔ پروفیسر جیسا۔ ایک بار میں نے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ اس کی نیند کا نام سیرابی تھا۔ ایسا سکون تو شاید ہزار تشنگیوں کے بجھ جانے کے بعد ملتا ہے۔ لیکن یہ کیسا ایک غیر واضح سا جذبہ میرے اندر سر اٹھا رہا تھا۔ ایک جلن سی تھی۔ ایک گدگدی سی تھی۔ ایک یقین سا، ایک بے یقینی سی۔ اس خط کا ہر لفظ میرے اپنے جذبے کی طرح، میرے لیے غیر واضح تھا۔ یا پھر بے وجہ، میری بے تعلقی اب پروفیسر سے ایک عجیب تعلق پیدا کر رہی تھی۔ جواں سالی کا اعزاز ہوتا ہے عشق بیتاب۔ ایک عشق جہاں تاب اور وہ عمر ہوتی ہے فخر جنوں۔ لیکن پروفیسر۔؟ جس نے میری عمر جیسی تین عمریں گزار لی ہوں۔ سرتاپا عشق بنا ہوا۔؟ خیال آیا عشق تو عمر ہی کیا، ہر قید سے آزاد ہو کر عشق جواں سال بنتا ہے۔ ایک شباب جاوداں۔ ساری زندگی بس کسی حسن جاوداں کے عشق میں گزر جائے۔ زندگی کے سارے ہی شب و روز حسن و عشق کی لذتوں میں سرشار، جذبہ و جنون کی گہرائیوں میں ڈوبے ڈوبے دھیرے دھیرے وقت کا اٹوٹ حصہ بن جائیں تو بھلا کس طرح احساس ہوسکے گا کہ موت آئی بھی اور گزر بھی گئی۔ سلسلہ عشق تو ہوتا ہی ہے پائیدہ و تابندہ۔

شاید کوئی ایسا ہی عشق ہے جو پروفیسر کی بڑھتی عمر کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا ہو عمر کے ساتھ ساتھ رواں دواں آگے چلتا ہی گیا ہے۔ ایک ندی جو کبھی سوکھی ہی نہ ہو اس کا شیتل دھارا۔ اور دوسری طرف اس کی وہ بانو۔ دلدار، اپنے ہر جذبہء عشق و وفا میں چاق و چوبند، اس کی عمر بھی تو ایک صدی جیسی لگتی ہے لیکن اس کے ہر اظہار میں ایک ایسی تڑپ ہے جو کچی عمر میں مکمل فریفتگی کے پہلے ہی یقین کے ساتھ ہمارے

وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ۔ بدن کے اندر یا باہر ہوتا ہی کیا ہے سوائے آگ کے ۔ لیکن اس تڑپ اور اس آگ کے ساتھ یہ پروفیسر کیسے سکون کے ساتھ سو رہا ہے ۔ بانو تو اس کی ہو چکی ہے، اس کی نس نس میں بس چکی ہے، اس کے اندر بانو کے وجود کا ایک ایک احساس محفوظ ہے ۔ اسی لیے پروفیسر ایک زریں خواب میں کھویا ہوا سفر کر رہا ہے، جو کشاں کشاں اس کو بانو کے قریب لے جا رہا ہے ۔ بانو زندگی بھر کی بے چینیوں کے ساتھ ، صدیوں سے پروفیسر کی منتظر ہے ۔ اور میں ایک حیات مکمل جیسی شکل والے پروفیسر کے مقابل ہوں، اس کا ہم سفر ہوں، میری نظر میں میری کوئی واضح منزل نہیں ہے، جانے میں کہاں جا رہا ہوں ۔ یہ زمینی سفر بڑا خشک اور سرد و گرم ہوتا ہے ۔ وہ تو ضرور کسی نہ کسی منزل پر پہونچاتا ہے، کسی نہ کسی مقام تک لے جاتا ہے ۔ لیکن یہ اندر کا سفر جو رنگ و نور کے بیچوں بیچ طئے ہوتا ہے، جس میں کرب و سرور کی ایک تیز دھار جسم و جاں کو یہاں وہاں کاٹتی رہتی ہے، پتہ نہیں کہاں لے جاتا ہے ۔ کچھ بھی تو یقین نہیں ہوتا ۔ چلو یہی سہی ۔ اس کچی عمر میں یہ غیر یقینی کا احساس ، ایک محرومیت کا احساس تو ہوتا ہے ، لیکن دل کی مجبوریوں کے ہلکے ہلکے سوز میں ایک موہوم موہوم آزادی کا احساس بھی ہوتا ہے، جس سے ایک ایسی انوکھی ترغیب ملتی ہے جو زندگی کو کبھی کبھی لامحدود بنا دیتی ہے ۔

میری نظر پروفیسر پر تھی، پروفیسر مجھے اور بھی بھرا پرا لگا، بہت زیادہ جیتا جاگتا کہ اس عمر میں بھی اس کے خوابوں میں رسیلے ارمانوں کا رنگ ہے ۔ کل ہی تو اس کے شہر پہونچنے کی تاریخ ہے اور کل صبح ہی تو اس کی بانو اس کو سرتاپا آغوش بنی ملے گی ۔ میں بھی تو کچھ دور کھڑا ہوا ان دونوں کو دیکھوں گا، جیسے وہ دونوں ہی میرے کچھ لگتے ہیں ۔ ان کو کچھ خبر ہی نہ ہوگی ۔ پھر .... میں نے بانو کے خط کے ساتھ لگا ہوا خط کھولا پروفیسر کا خط ۔

بنو میری ۔

پہلے ایک ہلکا سا بوسہ اور پھر بے شمار ۔

اچھا لگتا ہے کہ آج پہلے ہی تم کو پیار کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے لہجے میں

"عہدِ رفتہ" کہہ دوں۔

میری ساری زندگی بھی اب صرف عہدِ رفتہ ہی تو ہے۔ اب آگے ہے ہی کیا۔ بس تم ہو اور تمہارے سوا کچھ بھی نہیں ....

سات سمندروں کو پار کرنے کے لیے پہلے سات صدیاں لگتی تھیں لیکن اب تو اظہار محبت کرنے کرنے تک یہ سات سمندر پار کر کے تم تک پہونچ جاؤں گا۔ قریب آنے کی اجازت دو گی نا؟

میری وہی سرخوشی کی سی گفتگو۔ جس پر تم کو بہت ہی کم یقین ہوتا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ تم کو اس لیے یاد ہو گا کہ داغِ مفارقت کبھی کبھی نہیں مٹتے۔ آج زندگی میں شاید پہلی بار اپنے آپ کو بالکل ہی صاف دل محسوس کر رہا ہوں۔ لگتا ہے اب تک میرا دل اور میری زبان صحیح بات کہنے کی لذت سے ناآشنا تھے۔ تم کو آج مخاطب کرتے ہوئے ایک ایک لفظ اس طرح لکھ رہا ہوں جیسے صاف ستھرے قلم سے جو روشنائی نکل رہی ہے، اس کا ایک ایک نقش ایک ایسے پاک جذبے کا اظہار بن رہا ہے، جس کی آسودگی سے میں زندگی بھر محروم رہا۔

ٹھیک (۳۲) سال بعد میں تم کو مخاطب کر رہا ہوں لیکن دل کی گہرائیوں میں یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے کل تم کو دیکھا تھا۔ کیا دنیا بھر کی غلاظتوں سے گزر کر بھی انسانی احساس و جذبہ اتنا پاک اور صاف ہو سکتا ہے۔

میں نے کن طوفانوں کی طرح تم سے پیار کیا تھا، ان کی زد میں تم کتنی بار ڈوب ڈوب کر نکلی تھیں اور ساحل کے رخ سے ڈرتی تھیں۔ تمہارا شباب تو طوفانوں کی دہائی دیتا تھا۔ بانو میری، کچی عمر اور ہری بھری کھیتی لامحدود فضاؤں میں بکھری ہوئی بہاروں کی جان ہوتی ہیں۔ روح ہوتی ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں پگلی، باقی سب کچھ فصل کے کٹنے کے بعد بھوسا برادہ رہ جاتا ہے۔

سب سے پہلے وہ بھاری سِل تمہارے سینے سے اتار پھینکوں جس کو ۳۲ سال کے اس طویل عرصے میں تم نے اٹھائے رکھا۔ تم تو ایک کبھی نہ بجھنے والی آگ میں تپ تپ کر ایسی دھات بن گئی ہو گی، جس کا کوئی رنگ نہیں رہ جاتا۔ میں آج اس جرم کا کس عجز و انکسار کے ساتھ اقبال کر رہا ہوں جس کی سزا میں نے نہیں، تم نے

تنی طویل مدت تک بھٹکتی ہے۔اس بات پر آج میرا دل خون خون ہو جاتا ہے اور آج اس لمحے میں پہلی بار اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہا ہوں کہ مجھ جیسے بے رحم اور بے وفا انسان کو یہ لمحہ نصیب ہوا ہے۔آج میری نظر کے سامنے وہ لمحہ ایک بھالا، ایک نیزہ ایک خنجر بن کر ابھر آیا ہے جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ صداقت و وفا تو دلفریب نام ہوتے ہیں قید و بند اور مجبوری کے۔ عشق، عشق نہیں ہوتا اور زندگی کا نام بھی عشق نہیں، عیش ہوتا ہے جس کے لیے جسم و جاں کا ایک ایک احساس، عمر بھر تڑپتا رہتا ہے۔ عشق عیش نہ بن پائے تو زندگی ساری بید مجنوں بن جائے یا پھر وہ بے ڈھنگے انداز میں پھیلی پھیلی، ڈھیلی ڈھالی، بے رنگ۔بے رس، بالکل ٹھس، فرض جیسی ازدواجی زندگی بن جائے۔اس تصور ہی سے شاید ساری زندگی مفلوج لگتی تھی مجھے۔

زندگی کے ہر موڑ پر مجھے ایک سفید ریش راہبر ملا ہے جو سرتاپا ایک فلسفہ تھا۔ بالکل سیدھا سادا۔اس راہبر کی رہبری میں ساری زندگی کٹ گئی۔اس کا نام تھا فرار "فرار" ایک بہت ہی خوشبودار، خوش ذائقہ اور نشہ آور فلسفہ ہوتا ہے جس کا ایک ایک لفظ بڑا ہی معنی خیز، طرح دار اور دلفریب ہوتا ہے۔

ان ساری باتوں کے باوجود تمہارے حسن و جمال نے مجھے آج تک مارے رکھا۔تمہارے شرپسند بدن کی لذت، میں ہر دوسرے نازک بدن میں ڈھونڈھتا رہا بات بہت صاف ہے نا۔میں آج جی کھول کر اور کھلے ذہن کے ساتھ وہ سب کچھ تم کو کہہ رہا ہوں، جس میں میں تم کو اپنی ایک ایک سانس کا حساب دے سکوں۔کم از کم آج میں تمہارے سامنے اپنے آپ کو بالکل نکھرا، ستھرا دیکھ سکوں۔اور صدق دل کے ساتھ سرنگوں پاؤں۔

ٹھیک ہے عیش کوشی، انسان کو بزدل بنا دیتی ہے، لیکن اس بزدلی میں کیا قرار و سکوں تھا جو میں نے اپنے اندر محسوس کیا تھا، اس وقت۔جب کہ تم نے اپنے کھلنڈرے بدن کی ساری لذتوں کو مجھ پر نچھاور کر دیا تھا اور ایک بار خجل خجل سی، پریشان سی، ہو کر مجھ پر پورا یقین رکھتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم کو اب شادی کر لینی چاہیے۔"

میں نے یونہی پوچھ لیا تھا" کیوں "تو تم نے جواب دیا تھا" اس لیے کہ تم نے اپنی اگلی فصل کا بیج بو دیا ہے۔"

اس وقت میں نے جو کچھ محسوس کیا تھا وہ تم سے کہہ دیتا تو میری وہ بات ٹھیک تمہارے قتل کے مماثل ہوتی۔ لیکن اس لمحے نے میری بہکتی، سلگتی عمر نے میرے مزاج کو ایک ایسی شہ دے دی تھی کہ بے وفائی بھی بڑی بے جگری سی لگی تھی اور مستقبل سارا بڑا ہی آزاد آزاد سا لگا تھا۔ گو کہ۔ بالکل سچ کہتا ہوں، تمہارا سبک رو بدن، دلپذیر بن الفاظ کے چپکے چپکے ہر بات کہنے والا اور اپنی ہر بات میں سازش کرنے والا۔ ہلکی ہلکی آنچ دیتا ہوا۔ دھیرے دھیرے سلگ کر تیزی سے بھڑک اٹھنے والی آگ بننے والا۔ اور اپنی تپش میں مہکنے والا، بڑا ہی مہذب اور لاقانونیت کا دلدادہ، سچ مچ کا بے پروا اور شرمسار بدن بھی۔ میرے سارے وجود کو ہر طرح جکڑے ہوئے تھا۔ مجھے اپنے ایک ایک عضو کو اس کی ہر پر فریب جکڑ سے چھڑانا تھا۔ آزاد کرانا تھا۔ اف میں نے کر لیا۔ پھر مجھے زندگی میں جتنے بھی نرم و نازک بدن ملے، مجھ سے قریب آئے، مجھ میں اتر گئے ان میں وہ ساری چیزیں ایک ساتھ کبھی نہیں ملیں، جو تم میں تھیں، یکجا۔ مکمل۔ ورنہ کسی میں کچھ ملا اور کسی میں کچھ۔ الگ الگ، چیدہ، چیدہ۔ بھلا لطفِ شباب کو، لذتِ وجود کو اس طرح کبھی تقسیم کیا جا سکتا ہے؟۔

حالانکہ وہ بدن بھی خوش شکل تھے۔ رنگا رنگ تھے، آندھی تھے، طوفان تھے۔

آتش بار تھے، چپ چاپ تھے، پر شور تھے، ڈاکو تھے، لیٹرے تھے۔ سب کچھ تھے تب بھی پورے نہیں تھے۔ تشنگی چھوڑ جاتے تھے۔ اور وہ تشنگی، اف بس تمہاری یاد بنی رہتی۔ اس تشنگی کے ساتھ تم کو دور چھوڑ دینے کا احساس ایک عجیب کیفیت بن جاتا۔ میں اسے دکھ نہیں کہتا۔ درد نہیں کہتا۔ بس ایک کیفیت۔ وہ بھی شاید زندگی کے پر عیش لمحوں کا ایک حصہ لگتی تھی۔ کتنی اچھی اچھی شراب پیتا تھا۔ بس صرف آگے بڑھنے کے لیے اور روز روز تم سے دور ہونے کے لیے، تم سے دور بھاگ جانے کے لیے۔ فرار۔ آہ وہ سفید ریش راہبر میرا ہاتھ تھام لیتا اور میں چل پڑتا۔

میں انگلینڈ پہونچ چکا تھا۔ انگلینڈ کے قدیم شہر لندن کی گلُ کاریاں مجھے بڑی دلفریب اور مرعوب لگی تھیں۔ سبھی کچھ بدلا ہوا۔ نہ زمین جیسی زمین نہ آسمان جیسا

آسمان ۔ سوچتا تھا کہ میں اپنی ایک پرانی دنیا سے اٹھ چکا ہوں اور اب ایک دوسری دنیا میں ہوں ۔ میں اپنی جگہ سفاکی اور دغا بازی میں جس طرح یکتا تھا اسی طرح ایک ذہین طالب علم اور جید عالم بھی مانا گیا تھا ۔ لندن یونیورسٹی میں تاریخ پڑھانے پر مامور ہو گیا تھا ۔ اور ادھر ادھر اپنے ملک کی تاریخ پر لکچر بھی دیا کرتا تھا ۔ کتنا کامیاب آدمی تھا میں! جوان، ہنس مکھ، عالم، دانشور، مکار، سفاک ۔ مہذب اور شائستہ ۔ لذت پسند اور دلدادہ عیش ۔

بنو میری ۔ ہمارے قدیم ملکوں میں علم کے ساتھ ایک عجیب بھونڈا سا تصور لگا ہوا ہے کہ علم سے انسان کچھ قدیم جالے دار اخلاق سیکھے ۔ تہذیب و شرافت کے کچھ سبق سیکھے وغیرہ، وغیرہ ۔ یہ تصور کچھ عجیب لگتا تھا وہاں علم کے ساتھ ۔ جیسے کوئی آگے بڑھنے نہیں دیتا ۔ پیچھے کی طرف لے جاتا ہے ۔ میں نے یہاں علم کو ایک عمل کی شکل میں دیکھا تھا ۔ ہر شخص کا عمل، علم کے ایسے پرانے تصور سے بیگانہ بیگانہ سا لگتا تھا ۔ ملنے ملانے میں تمیز و آداب تو جیسے پہلا سبق ۔ خوش لباسی اور خوش نمائی کے سب دلدادہ ۔ رنگ رنگیلا پن اور ہنسنا ہنسانا، خوش خلقی کی پہلی شکل ۔ واضح آزادی روح و بدن ۔ جس کو دیکھو ایسے مسکرائے جیسے وہاں ذہن و دل پر کوئی پابندی نہیں ہے، ہر سانس کو آزادی حاصل ہے ۔ اور کردار کا تصور دھندلا دھندلا کہیں واضح نہیں ۔

چلو ایک دلچسپ قصہ سناؤں اس زمانے کا ۔ گو کہ میری داستانِ عیش و عشرت کا یہ پہلا باب نہیں ۔ لیکن چلو سن لو ۔ تم مجھے اس شفاف پانی کی طرح دیکھ تو سکو جس کی تہہ کی ہر شئے نظر آتی ہے ۔

ایک شام مجھے ایک بڑے کلب میں بلایا گیا تھا ۔ لکچر دینے کے لیے ہندوستان کی دیوداسی کے تصور پر ۔

میں نے اپنے لکچر میں ہمارے ملک کی قدیم تہذیب میں دیوداسی کے بڑے ہی پراسرار اور پر کشش تصور کو شاید بڑے ہی دلچسپ اور جذبات انگیز انداز میں پیش کیا تھا کہ کس طرح کچھ نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں کسی مندر یعنی کسی دیوتا کی سیوا کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتی تھیں ۔ ان کو بچپن ہی سے اعلیٰ معیار کی موسیقی اور رقص سکھایا جاتا تھا ۔ اور وہ ان فنون میں مہارت حاصل کر لیتی تھیں، اس سماج میں

مندر کے مہنت کے بعد کا درجہ دیو داسی کو حاصل ہوتا تھا، وہ روز اپنا سنگھار کرتی، سجتی سنورتی، اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ ۔اس مندر کے دیوتا کی مورتی کو خود اپنے ہاتھوں اشنان کراتی ۔اس کی پوجا کرتی اور دیوتا کے سامنے رقص کرتی ۔یہ سب اس کی زندگی کے فرائض میں شامل تھا۔وہ اس دیوتا کے مجسمے ہی سے بیاہی جاتی اور ساری زندگی اس کی سیوا میں گزار دیتی ...."

اس شام میرا لکچر یقیناً بہت ہی دلچسپ اور اثر انگیز رہا ہوگا۔میں جب لکچر کے بعد بہت ساری تعریف و تحسین کے سرور میں اس ہال سے باہر نکلا تو ہلکے پھلکے لباس میں اپنے بھرے بھرے بدن کو سنبھالے ہوئے اپنے رخِ زیبا پر ایک پُرگو تبسم لیے ہوئے، اور اپنی ہی آنکھوں سے اپنے ہی عشوہ و ناز کی داد دیتے ہوئے ایک ماہ پارہ مجھ سے قریب آئی اور بڑے ہی پرشکوہ اعتماد کے ساتھ مجھے مخاطب کیا۔

"Would you mind helping me a little, O learned man from India, so devout a lover of Devadasis what a passion - so hotted up."

میں رک گیا۔مجھے عادت جو تھی ۔ہنس پڑا، وہ سمجھ گئی، بڑی تیز رفتار تھی ۔ اس نے اپنے لہجے میں ایک رقص کی ہلکی سی تھرک پیدا کرتے ہوئے کہا۔" میں دیو داسی بننا چاہتی ہوں ۔ کس قدر خوبصورت تصور ہے زندگی کا، اس تصور میں تو سبھی کچھ مل جاتا ہے ۔"

میں نے کہا۔" تم اور دیو داسی ؟"

" ہاں میں ...... بالکل میں، ایک دیو داسی ۔ پتہ نہیں میں نے کہاں تک ٹھیک سمجھا ہے ۔قدیم روم کی "وستل ورجنز" (Vestal Virgins) کا خیال آیا مجھے آپ کا لکچر سنتے ہوئے ۔لیکن جو بھی میں نے سمجھا ہے اس کو غلط مت کہیے ۔ درست کہیے ...... ہائے مندر کی تنہائیوں میں، وہ پتھر میں تراشا ہوا بت، سیاہ، صاف، متناسب عمر کی قید سے آزاد۔اور اس سے میرا بیاہ ۔جب انگ لگ جائے وہ تو میں سچ مچ آکاش نگروں میں پہونچ جاؤں اور امر ہو جاؤں ۔ میں تو ناچ ناچ کر باوری ہو جاؤں گی اور پھر ایک نظر بھی اس کالی کلوٹی دھرتی کی طرف نہیں دیکھوں گی ۔ میں آپ کے اس 'سر سنگیت اور نرتیہ کلا میں لپے بسائے دیش کو آؤں گی اور کسی پرانے مندر میں ہمیشہ کے لیے کھو جاؤں گی ۔"

میں نے واضح آواز میں کہا۔ "ضرور آنا۔"

اس نے لپک کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "سچ؟"

میں نے کہا۔ "ہاں"

اس دو گھڑی کی ملاقات میں وہ مجھ سے کچھ اس قدر قریب آگئی تھی کہ اس میں اور مجھ میں صرف ہمارے لبادوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں نے سڑک کے اس پار کے ایک پب کی طرف چلنے کو کہا۔ وہ میرے ساتھ چل پڑی، مجھ سے لگی لگی، جیسے میں ہی وہ پتھر کا بت ہوں۔ پب میں ایک چھوٹے سے کیوبیکل میں بیٹھے ہم کوئی بہت ہی پرانی قسم کی شراب پی رہے تھے۔ گو کہ اس وقت اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور میں شاید اس سوال کی ضرورت سے آگے نکل چکا تھا۔ پھر بھی پوچھ لیا۔ "تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"نام میرا کچھ بھی کہہ لیجئے جناب۔ لیکن میرے ڈیڈی مجھے لوزی کہتے ہیں۔" You Lousy - nut آہ۔ بہت سارا پیار دیتے ہیں میرے ماں باپ مجھے۔ میں ایک بہت ہی چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ایک بہت ہی چھوٹا سا قریہ۔ اوہ، لوزی ویلج۔ اس کے قریب ایک ٹیلا ہے، اونچا۔ ہر طرف اس کے سنہری گھاس اگی رہتی ہے۔ لیکن برف پڑتی ہے تو سب کچھ سفید ہو جاتا ہے۔ میرے ماں باپ بہت محنتی لوگ ہیں۔ کھیتی کرتے ہیں۔ آج وہ دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لیکن اف کتنے مضبوط ہیں۔ پتھر اور فولاد جیسے۔ کتنے موٹے موٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ میرے باپ کے چہرے کی جلد بھی موٹے لبادے جیسی ہے۔ اور داڑھی؟ ہاں بالکل اس ٹیلے پر اگی ہوئی سنہری گھاس جیسی، نکیلی، چبھتی ہوئی۔ جب وہ میرے گالوں پر بوسہ دیتے ہیں نا تو مجھے لگتا ہے زندگی کا سچا مزہ تو مضبوطی اور سختی میں ہے۔" اچانک لوزی نے میری بانہہ پکڑ لی اور اس کو دبا کر دیکھا۔ "ہاں" ہے مضبوط۔ لیکن یہ شہری زندگی کی شہری مضبوطی ہے۔ ٹھیک ہے۔" اس نے اب تک ایک ڈیڑھ پیگ پی لیا تھا۔ اپنی نیم نشیلی نظروں کے حلقے میں مجھے سمیٹتے ہوئے کہا۔ "چلئے جناب، آپ میرے گاؤں چلیے۔ خصوصاً ان دنوں جب برف پڑتی ہے۔ سارا ٹیلا سفید سفید بادل جیسا لگتا ہے اور اس ٹیلے پر ہمارا چھوٹا سا گھر۔ یکا تنہا لگتا ہے۔ ہر موسم کے لیے ہر چیز ہمارے پاس محفوظ ہوتی ہے۔ سردیوں

میں تو بڑا گرم ہوتا ہے ہمارا گھر۔ وہاں سچے پیار اور سچے خلوص کی گرمی ہوتی ہے۔ اس پرخلوص اور پیار بھری گرمی میں سارا وجود بڑا ہی پرلطف اور محفوظ لگتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ ہم تو اس طرح ہزاروں سال جی سکتے ہیں۔ مجھے یہاں شہر آجانا پڑا۔ پڑھنے لکھنے کے لیے۔ سچ بڑی واہیات بن گئی ہے زندگی۔ یہ پڑھنے لکھنے سے، بالکل غیر محفوظ میرے اس مہین سے لبادے کی طرح۔"

چڑھتے نشے سے جلتی ہوئی میری نظریں عادتاً اس کے مہین لبادے کے اندر اتر گئیں۔ وہ بہت تیز گفتار ہوتے ہوئے، فہم و فراست میں بھی بڑی تیز رفتار تھی۔ اس نے میری نظروں پر اپنی نظروں کا بوجھ ڈالتے ہوئے یکلخت پوچھ لیا۔ "آپ جلد باز تو نہیں ہیں نا؟"

لگا میرا سارا نشہ اچانک میرے حلق میں آکر اٹک گیا ہے۔ میں نے بڑی کوشش سے گلا صاف کیا۔ اور بڑی ہی بے معنی سادگی سے پوچھا۔ "کیا مطلب"؟ وہ یکلخت زور سے ہنس پڑی۔ دیکھا میری طرف ایسے کہ اس کی آنکھوں کی سرخیاں زیادہ نمایاں ہوگئیں۔ بولی۔

"اوہ، ہندوستانی ہیں نا آپ۔؟ دیو داسیوں کے دیش کے۔ بڑی وقت شناس تھیں وہ دیو داسیاں کہ وقت کے ساتھ ساتھ ایک دور تک چل کر آئیں اور پھر لوٹ گئیں یا پھر آگے نہیں بڑھیں۔ سب کچھ وہیں ختم۔ بتائیے، اب کیا رہ گیا ہے عورت میں؟ نہ وارفتگی نہ آشفتہ سری ...... نہ نظر بندی، نہ نظر بازی۔ نہ وہ وصال کا تصور، نہ وہ انتظار نہ وہ فراق کی کٹھن گھڑیاں۔ نہ تنہائی نہ محفل، نہ دھیمی دھیمی آنچ، نہ دبی دبی سی تپش و جلن۔ ہائے کیا چیز تھی عورت بھی۔ کسی بھی تھی تو ساری ساری رات شمع کی طرح چپکے چپکے جلتی رہتی۔ اب دیکھیے نا آج کی عورت جیسے ایک دیا سلائی، ذرا سی رگڑ کے ساتھ سلگ اٹھتی ہے اور گھڑی بھر جل کر بجھ جاتی ہے۔ اسی لیے تو پوچھا آپ سے کہ آپ جلد باز تو نہیں ہیں۔" وہ پھر ہنسی۔ میں نے پھر اس بات کا اظہار کیا کہ اس کا سوال میں سمجھ نہیں پایا ہوں۔ لیکن مجھے اپنا یہ اظہار بڑا غیر مہذب لگا۔ بات یہ بھی تھی کہ وہ جو ہر بات اچانک بنا کوئی اندیشہ بنے راست یقین بن رہی تھی اور کتنے ہی ایسے یقین میرے خون میں تیزی سے گردش کرنے لگے تھے، میں ان یقینوں کا پورا

پورا لطف اٹھاتا ہوا ایک احتیاط برت رہا تھا۔ ویسے میں اس طرح تیزی سے در آنے والے یقینوں سے بالکل ناآشنا بھی نہیں تھا۔

میں نے لوزی سے ایک پر یقین لہجے میں کہا۔ "میں بالکل جلد باز نہیں ہوں۔"

لوزی نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے میں اس سے بہت دور ہوں اور اس کی آنکھوں کے چراغ کچھ مدھم سے ہو گئے ہیں۔

"واہ کتنی اچھی بات ہے" اس نے مجھے ان مدھم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ دو گھڑی یونہی مجھے دیکھتی رہی، پھر کہا۔ "میں نے کہا نا کہ میں اپنے ماں باپ کی بہت ہی چہیتی بیٹی ہوں۔ لیکن انھوں نے پتہ نہیں کیوں مجھے اس شہر کے حوالے کر دیا۔ یہ پڑھنا لکھنا کیا ضروری تھا۔ کیا جاتا ان کا جو وہ مجھے اپنے ساتھ ہی رکھ لیتے۔ میں بھی کھیتوں میں کام کرتی۔ دست و بازو میرے کتنے مضبوط اور پر یقین ہوتے۔ میں بھی اس سنہری گھاس سے چمکتے دمکتے ٹیلے پر یہاں وہاں دور تک بھاگتی دوڑتی۔ محنت کرتی شام کو شراب بھی پیتی تو اس طرح ان نازک نازک کانچ کے چھوٹے چھوٹے ساغروں میں نہیں، جن میں شراب کے جرعوں کا حساب کر کے، شراب کی ہتک کی جاتی ہے، جیسے عورت کے شباب کی قیمت چکا کر عورت کی ہتک کی جاتی ہے۔ میں تو اپنے گاؤں میں کھردرے، وزنی مضبوط، کسی دھات کے بنے ہوئے بڑے بڑے پیالوں میں پیتی بڑی ہی تلخ شراب۔۔ نہ حساب نہ کتاب۔ پھر کبھی کسی خاموش اندھیری رات میں یا پھر برفیلی رات میں اپنے سارے بدن میں، اپنی آنکھوں میں جنگل کا مہکتا نشہ لیے اپنے گھر والوں کی نظروں سے بچ کر انتظار کرتی ...... آپ کا ...... اپنے کالے کالے چوبی مکان کے پچھلے دروازے کو لگی کھڑی ہوتی۔ آپ آجاتے تو کس احتیاط سے دروازہ کھولتی۔ اف وہ چوبی دروازے کی آواز۔ "چرچر" کیسی مہم کا اعلان ہوتی ہے ...... بس ...... بس ...... وہ مہم ......" کہتے ہوئے اس نے اپنے گلاس میں جتنی شراب تھی ایک ساتھ ٹانچ لی۔ اور ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ بس۔ وہ مہم ......" اور سامنے ٹیبل پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔ جیسے تھک گئی ہو۔

میں نے کچھ مبہم سے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "لوزی۔"

اس نے ٹیبل سے سر اٹھایا۔ میری طرف اس طرح دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ

رہی ہو۔ پھر مسکرا پڑی۔ میں نے کہا چلو، چلیں۔"

اس نے کہاں۔"ہاں چلیں .... میں جس دنیا میں آج رہتی ہوں نا اس نے مجھے اتنی آزادی دے رکھی ہے .... اتنی آزادی دے رکھی ہے .... اتنا نڈر بنا دیا ہے مجھے کہ اب کسی بھی خوف یا کسی بھی حجاب کی لذت کو میرے بدن کا روم روم ترس گیا ہے .... چلو کہیں بھی لے چلو۔ چلو ...."

پب سے باہر وہ کچھ دیر مجھ سے لگے لگے اس طرح چلتی رہی جیسے اپنے پاوٴں کے سہارے نہیں بلکہ میرے پاوٴں کے سہارے چل رہی ہے۔ کھلے راستے پر اس کی اس سپردگی کے انداز نے مجھے، میرے اندر کچھ اس طرح بے وزن بنا دیا تھا کہ میرے اپنے جسم کے سارے حصے ایک دوسرے سے ربط کھو چکے تھے۔ بس میرے قدم مضبوط تھے۔ ہم دونوں کو سنبھالے ہوئے۔ وہ اپنی ہر ذمہ داری سے دستبردار ہو چکی تھی ...... "چلیے نا ...... کہیں بھی ...... کتنا بڑا شہر ہے مگر .... اس سارے شہر پر تھو۔" وہ اچانک سیدھی کھڑی ہو گئی۔ شہر کی سرخ و سفید ٹھنڈی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ میری طرف بھی اسی طرح دیکھا جیسے میں بھی کوئی روشنی ہوں ......"آپ کو کوئی راستہ نہیں سوجھتا..... تو چلیے..... ہائیڈ پارک چلیں ...... ہائیڈ ...... ہائیڈ یور سلف ...... Hyde ہائیڈ تھو

میں نے اس کا ہاتھ پوری مضبوطی سے تھام لیا۔ اور ایک طرف ہو لیا، ۱۵ منٹ بعد ہم دونوں اس کمرے میں تھے جہاں میں رہتا تھا۔ کمرے میں بالکل پگھلتے موم کی سی گرمی تھی۔ ہلکے ہلکے چرکے لگانے والی۔ اس وقت دنیا میں سچا مقامِ عیش وہی تھا جہاں آتش دان کے سامنے ایک بہت ہی پر شکوہ کوچ تھا۔ اور اس آتش دان میں دہکنے والے شعلوں کی مدھم روشنی میں اطراف کی ہر شے نیم برہنہ لگ رہی تھی۔ ایک چھوٹے سے سِلر سے میں نے تھوڑی سی شراب نکالی، اور اس چھوٹی سی ابونی تپائی پر رکھ دی جو کوچ سے لگی رکھی تھی۔

لوزی بڑے ہی پراسرا انداز سے کوچ پر بیٹھی ہوئی تھی اور آتش دان کو گھورے جا رہی تھی۔ چپ چاپ۔ پھر اس نے اسی بے خبری کے انداز میں کہا۔"آپ کے آتش دان کی تو آگ بھی کچھ اتنی باحیاء ہے کہ بہت ہی رک رک کر دہک رہی ہے

پھر بھی دہکنے کا انداز ایسا ہے کہ جسم کے باہر نہیں، اندر چرکے لگ رہے ہیں۔"
میں نے آہستہ سے کہا۔" اندر کی آگ پر تھوڑی سی شراب چھڑک لو، دیکھو کیسی آہ نکلتی ہے۔ یہ آتش دان ماند پڑ جائے۔"
نوزی نے دو گلاسوں میں شراب انڈیلی۔ شراب بھی انگاروں جیسی سرخ تھی اور دہک رہی تھی۔ دونوں نے گلاس اٹھائے، تب اس نے اپنا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔" بس ایک سپ۔" میں نے ایک سِپ لیا تو فوراً اس نے اپنا گلاس اپنی طرف کھینچ لیا، اور مسکراتی آنکھوں سے اپنے گلاس میں جھانکتے ہوئے بولی۔" دیکھو یہ موج شراب، مشرقی ساحل سے ٹکرا کر لوٹی ہے اور اب جو مغربی ساحل سے ٹکرائے گی نا تو ایک طوفان آجائے گا اور اس طوفان میں ہر دوری اور ہر فرق مٹ جائے گا۔" ایک چٹخارے کے ساتھ اس نے شراب کے ایک دو گھونٹ لیے۔ اس کے چہرے کی رنگت اور اس کی تمتماہٹ سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے سارے بدن سے نشے کی وہ لہریں اُمڈ رہی ہیں، جن کے احساس کے ساتھ لباس پر لگے سارے بٹن ایک پر فریب تہذیب کے بے معنی جبر کے نشان لگتے ہیں۔ میں آہستہ سے کوچ سے اٹھا اور لوزی کے پیچھے جا کر اس پر جھک گیا۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ اس کے برہنہ گداز شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ اس کی زبان سے جیسے ہلکی سی ایک چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ کچھ ایسے چمک اٹھا، جیسے انگارہ۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اب اس کے تپتے گال پر میرا گال تھا اور وہ میرے گال کو اپنے گال سے سہلا رہی تھی۔ پر اس نے اپنے دبے لہجے میں میرے بچے کھچے ہوش و حواس کو جذب کرتے ہوئے کہا۔" جی چاہتا ہے کہ ہم کچھ دیر اور دہک اٹھیں۔ آؤ .... ادھر بیٹھو۔" میں بے قابو انداز میں اس پر آرہا۔ اس نے مجھے اپنی باہوں میں سنبھال لیا اور وحشت زدہ انداز میں میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ ایک شعلہ سا لپکا۔ انگاروں پر انگارے رکھے تھے۔ لیکن اس آگ کی لپیٹ میں اس کا وہ پر سکون لہجہ۔" ذرا ٹھہرو۔" شاید نشہ و سرور اور دوشیزگی کی بے رحمی کا وہ ایک ایسا امتزاج تھا جو مرد کے ایک ایک احساس و جذبے کو بڑے ہی سلیقے سے جلا کر خاکستر کر سکتا ہے۔" دیکھو، یہاں پر ٹھہر کر میں زندگی کو کچھ اور پر لذت سانسوں سے نوازنا چاہتی ہوں۔ جی چاہتا

ہے ہم آتش دان میں آگ، کو کچھ اور تیز کر دیں ۔وقت کو کچھ اور جلائیں اس آگ میں ۔ کتنا اچھا ہوگا کہ ہم رات بھر بس دہکتے رہیں ...... دہکتے رہیں اور صبح ہوتے ہوتے اس طرح دھیرے دھیرے بجھنے لگیں کہ ہلکی پھلکی راکھ بن جائیں ۔"

اس کی ان باتوں پر میں نے بڑے ہی بے معنی انداز میں اپنے گلاس کی ساری شراب پی لی اور مجسم تلاطم بن گیا جو شاید دنیا کے سارے سمندروں کو اپنی لپیٹ میں لے لے ۔ مجھے دیکھ کر وہ بالکل مشرقی کرنوں جیسی رنگت لیے ہنس پڑی ۔ اس کے کسی خیال نے اسے گدگدایا ۔ اس نے کہا ۔ "مرد اگر انتہائی خطرناک اور تباہ کن طوفان بھی بن جائے نا تو وہ اس سمندر کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتا جس کا نام عورت ہے ۔" وہ اپنی اس بات پر زور سے ہنس پڑی ۔ مجھ سے پوچھا۔

"عشق کیے ہیں کبھی تم نے ؟ اور کیے ہیں تو کتنے ۔؟"

میرا سانس اچانک رک گیا اس سوال پر ۔ میں اپنی زبان سے کوئی جواب دینے کے قابل نہیں تھا ۔ میں تو دراصل اس وقت اندر ہی اندر چیخ رہا تھا کہ میرا سارا وجود شعلوں میں لپیٹا ہوا ہے ۔" لیکن اُدھر وہ کس طرح ٹھنڈی ہوا کا ایک بے آواز جھونکا بن گئی تھی ۔ "بولو نا، کتنے عشق کیے ہیں ؟"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بری طرح اسے اپنے سینے سے لگایا ۔ میں نے شاید اس وقت کچھ بھپرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا بھی ۔ "بس صرف ایک عشق ..... اور وہ تم ہو ۔"

" یہ تو بہت بڑی بات ہے " کہتے ہوئے وہ کچھ ہنس پڑی اور کچھ ڈھیلی ڈھالی ہو گئی ۔ اور آتش دان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی ۔ "تب تو تم بالکل بنجر آدمی ہو ۔ میں تم سے چھوٹی ہوں لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ عشق تو زندگی کا ایک سرسبز و شاداب گلشن ہوتا ہے ۔ بہار تو بہار ہوتی ہے ارے خزاں بھی آجائے تو اس کے درد ہرے بھرے رہتے ہیں ۔ اچھے اچھے عشق کرو یار ...... اور دو مجھے شراب ۔ لاؤ، ایک شعلہ سا حلق میں اتر جائے تو شاید اندر اچانک جو سلگ اٹھی ہے آگ ، اس کو یہ شعلہ خاک کر دے ۔ لاؤ نا شراب ۔"

اس کی ان باتوں سے تو میں بھی اور سلگ اٹھا ۔ میں نے اس کے گلاس میں

شراب بھر دی۔ اس نے پھر بڑی ہی تیزی سے شراب پی۔" مجھے دیکھا، مسکرادی اور آہستہ آہستہ وہ میرا ہاتھ سہلانے لگی۔ اچانک اس کا لہجہ ہی بدل گیا۔ کہنے لگی۔

"یہاں سے ٹھیک بائیس (۲۲) میل دور ایک پہاڑی کے دامن میں ایک چوڑی چکلی سڑک سے پرے ایک فارم ہاؤز ہے۔ اور اس سڑک سے لگی لگی ایک چھوٹی سی خوبصورت سرائے ہے۔ راہ چلتوں سے عشق کرنے والی۔ سیدھے ہمارے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیتی ہے۔ بوسوں کی بوچھار کر دیتی ہے، تم اس کے گرم و گداز باہوں کے سہارے چلتے ہوئے اس سرائے میں داخل ہو جاتے ہو۔ کئی سو سال پرانی دنیا میں پہونچ جاتے ہو۔ کتنے پرسکون، کتنے پرلطف، خوشیوں سے لبریز، صحت مند، ترو تازہ، ہنسوڑ، ساری دنیا کو اپنی جاگیر سمجھنے والے تھے ان دِنوں کے لوگ۔ سب پتہ چل جاتا ہے۔ ہر طرح محسوس ہو جاتا ہے، پورا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ سب کے سب، پورے جوش و خروش کے ساتھ اب بھی زندہ ہیں۔ اس شراب و کباب کی خوشبو میں لپٹے ہوئے، بڑے ہی دِلگداز اور گرما گرم ماحول میں ان مضبوط اور آرام دہ نشستوں پر بیٹھے ہوئے۔ لمبی لمبی بڑی بڑی سائز کی کرسیوں پر نیم دراز، بے حساب شراب پیتے ہوئے اور مرغ و ماہی کی سوگند میں اپنی سانسوں کو بسائے ہوئے، قہقہوں پر قہقہے اڑاتے ہوئے۔ قہقہے بھی کیسے، جیسے ان کے ساتھ کچی کچی فصلوں کی بہار ہے، محنت و مشقت کا شباب ہے۔ اور پھر ایک بڑے لیمپ سے روشن اونچے اور سخت جان شہتیروں سے بنائے ہوئے ہال میں رقص کرتے ہوئے وہ ایک رات کے، ایک وقت کے مسافر ایک دوسرے کو سینے سے لگائے رہتے ہیں۔ پھر اس رات کو، اس کے ہر لمس کو اپنے سینوں میں چھپائے، دوسری صبح آگے آنے والے جنگلوں میں پہاڑی کے ڈھلوانوں سے اتر جاتے ہیں۔ پھر دوسری طرف آگے ہی آگے" چلو میرے مہربان" کہتے ہوئے لوزی نے کچھ عجیب جذباتی انداز میں میرے ہونٹوں کا ہلکا بوسہ لے لیا۔ پھر کہا۔

"چلو، اس سرائے کو چلیں۔ نکل پڑو۔ اسی سرائے میں، میں نے ایک رات ایسا عشق کیا تھا، جیسے ساری زندگی عشق میں گزر گئی تھی۔ اتنی طویل رات اور اتنا لامتناہی عشق۔ بس رات ہی رات اور عشق ہی عشق۔ اس طویل رات کی ایک ہلکی سی صبح کے ساتھ میرا وہ عشق بھی آگے کے جنگلوں کی طرف چل دیا تھا۔ ایک بگھی میں بیٹھا ہوا۔

پہاڑی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے دوسری طرف اتر گیا تھا ...... اس رات کے سارے نشان یہاں اندر محفوظ ہیں۔ دیکھو ...... کھول لو......!" اس نے تیزی سے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا لبادہ نیچے کھینچ ڈالا۔ اُف ایک آتش دان۔ میں نے اس کے لپکتے شعلوں جیسے عریاں سینے کو شاید بالکل نسل اول کے اس وحشی انسان کی بے رحم نظروں سے دیکھا تھا جس نے حملہ کرنے سے پہلے کسی وحشی جوانی کو پہلی بار برہنہ دیکھا ہو۔ شاید وہ آہستہ سے کراہنے لگی۔ کچے درد سے اٹھنے والی ایک آہ کے ساتھ، اس نے مجھ سے کہا۔ "تمہاری ان آنکھوں میں ایک جنگل کی آگ ہے اور یہاں اس جگہ مجھے چرکے لگ رہے ہیں۔ بجھادو اپنی آنکھوں کو۔ بجھادو اور اس وقت تک نہ سلگانا جب تک کہ یہاں فرش پر ہر طرف انگارے ہی انگارے نہ بکھر جائیں"۔ اس سارے ماحول میں شعلے بکھیرتے ہوئے وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ مجھے پتہ نہیں چل سکا میں اس سے کتنا قریب تھا۔ مجھے وہ دور دور لگی، کراہتی ہوئی، مجھ سے بنتی کرتی ہوئی ...... "کرم کرو۔ رحم کرو ...... ہاں رحم کرو۔ آجاؤ ..... نہیں ...... نہیں ......" وہ بے تابیوں کی شاید انتہا تھی جو اس کے بدن کو روند رہی تھی اور اس کا لباس بکھر رہا تھا، یہاں وہاں۔

وہ اپنی بکھری ہوئی سنہری زلفوں کو سنبھالتی ہوئی اچانک اُٹھ بیٹھی تو اس کی سرتاپا برہنگی ایک شعلہ تھی، جس پر ہلکے دھوئیں جیسا بھی لباس نہیں تھا۔ اس کے لہجے میں تھکاوٹ آچکی تھی۔ جیسے منزلوں سے قریب اکھڑی اکھڑی سانسوں میں وہ کہہ رہی تھی۔

"تم تو آتش سیال ہو۔ میرے اندر میری نس نس کو جلادو۔ کہیں کوئی نشان نہ رہے میرا۔ جلادو۔"

ہوا کے تیز جھونکے سے لپکنے والے شعلے کی طرح وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ دونوں کے بدن شاید جابجا زخمی ہو رہے تھے اور زخموں سے خون رس رہا تھا۔ اس کی کراہ پھر ایک چیخ بن گئی۔ وہ پھر میری بانہوں سے اچانک دور ہو گئی۔ وہ چیخ پڑی، "نہیں۔" وہ اٹھ بیٹھی، اس کا سر جھک گیا۔ لیکن پل بھر میں پھر اس نے پوری وحشت کے ساتھ، ایک بھوک کی تڑپ کے ساتھ مجھے دیکھا اور اپنی ساری دہکتی عریانیوں کو ایسے زاویے

دے دیے کہ ساری عیاشیاں ان میں منتقل ہو گئیں ...... "ٹوٹ پڑو مجھ پر۔ حملہ کردو یہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت ہے۔ کر لو اس پر قبضہ ......"

ہر طرف سے حملہ ہو گیا۔ کیسے خطرناک وار پر وار ہونے لگے، خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ ایک چیخ سی اس کے سینے سے نکل گئی ...... "نہیں ...... نہیں ...... نہیں۔" زخمی وحشی کی طرح میں اس پر جھپٹ پڑا۔ بجلی کی چمک بن کر وہ مجھے پل بھر کے لیے اندھا کر گئی۔ پل بھر کا اندھیرا تھا۔ اور پل بھر میں وہ اپنے منہ کے بل میرے قدموں پر اپنی آنکھیں رگڑنے لگی، شاید میں بہت زور سے چیخا۔ چنگھاڑ لگائی۔ "لوزی۔" بے حد خوفزدہ لہجے میں وہ پھر چیخ پڑی "نہیں"۔ اس کے سارے بدن کی آگ شاید اب اس کے آنسوؤں میں تھی۔ لیکن یکلخت میں نے اسے اپنی باہوں میں اٹھالیا اور وہ بھی ایک دیوانگی کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی، چمٹ گئی۔ وہ اپنی آنسو بھری آنکھیں میرے سینے پر رگڑنے لگی۔ جانے وہ کونسا جذبہ تھا جو میرے سینے میں ایک غبار بن کر اٹھا، میں نے لوزی کے گالوں پر دو تین طمانچے لگا دیے، لیکن ...... یہ سمجھ نہیں سکا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لوزی فرش پر ڈھیر ہو گئی ...... وہ اپنے گھٹنوں میں چہرہ چھپائے مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اس کی سسکیاں میرے بدن کو جا بجا ڈسنے لگیں۔ میں کچھ بھی سمجھ نہ سکا کہ لوزی کون ہے، کیا ہے، اور میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ اس کی دبی دبی سسکیوں کے بیچ خاموشیاں، اجاگر ہونے لگیں۔ رات کا سارا طوفان سمندر کی گہرائیوں میں اترنے لگا۔ اور میں صرف یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے سارے وجود سے وہ چیز چھن گئی ہے جسے ذہن کہتے ہیں۔ میں آتش دان کے سامنے بیٹھا ہوا اپنے آپ کو ایک تپتا ہوا پتھر محسوس کر رہا تھا۔

میں کوچ پر بیٹھا ہوا تھا اور آتش دان میں بکھرے ہوئے انگارے مجھے گھور رہے تھے۔ مجھ سے کچھ دور لوزی تھی۔ ہم دونوں چپ تھے، بالکل چپ اور شاید اندر ہی اندر دھیرے دھیرے جلتے ہوئے ہم اب راکھ بن رہے تھے۔ آتش دان کے انگاروں پر بھی اب ہلکی ہلکی راکھ جمنے لگی تھی۔ میں شاید کوچ پر ہی راکھ بن گیا اور لوزی فرش پر۔ جانے وہ کونسا عالمِ بے معنی تھا، وہ کونسی کیفیت بے رنگ تھی کہ بے ذہنی میں بھی آنکھ جھپک جاتی ہے یا اچانک سارے احساس بے معنی ہو جاتے ہیں۔

بس ابھی صبح کی پہلی کرن بھی نہیں پھوٹی تھی کہ میں نے دیکھا گھر میں، میں اکیلا ہوں لیکن فضا میں رات کی خوشبو تھی، نشان تھے، سائے تھے۔ اس ابونی تپائی پر رات شراب کی جو بوتل رکھی تھی، اس بوتل کے نیچے ایک سفید کاغذ دبا ہوا رکھا تھا۔ میں نے کاغذ کھولا۔ کاغذ پر اتنا لکھا تھا۔

"میرے یار۔ مجھے معاف کرو اور یاد رکھو۔ آج کی رات بھی میں نے غلطی سے عشق کر لیا۔ ایک ایسا ہی عشق جیسے زندگی ساری عشق میں گزر گئی۔ اسی لیے ...... اسی لیے میرے یار .... رات میں نے تم سے کہا تھا نا کہ عشق تو زندگی کا ایک سر سبز گلشن ہوتا ہے۔ بہار تو بہار ہوتی ہے، ارے خزاں بھی آجائے تو اس کے درد سدا ہرے بھرے رہتے ہیں۔ اس لیے میرے یار، بس معاف نہ کرنا، سمجھ جانا، میں بیمار ہوں، بیمار .... اب تم بھی زندگی کے جنگل کی طرف چل دینا اور سرائے والی پہاڑی کے ٹیڑھے میڑھے ڈھلوانوں سے دوسری طرف اتر جانا۔ کاش میں ایک دیوداسی ہوتی اور تم ایک پتھر کا بت ....

لوزی

دیکھو میری جان بانو، یہ قصہ میں نے ساری تفصیل کے ساتھ صرف اس لیے سنایا کہ یونہی بار بار ایک یقین ہوتا ہے مجھے کہ اس ایک قصے کی تفصیل، میرے زندگی کی ساری تفصیل سے زیادہ طویل ہے۔ ویسے تو میں نے کتنی ہی شب ہائے زلف دراز، شب ہائے مشک و عنبر، شب ہائے نور و نار و تیرہ و تار گزاری ہیں ان کے ایک ایک لمحے کا رس چوس چوس کر، لیکن ان کی صبح ہونے ہونے تک تشنگی بڑھ گئی اور آنے والے دن کا ہر حصہ ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کا ڈھانچہ سا لگا۔ ہر رات بالکل ادھوری ادھوری سی لگی۔ بالکل نامکمل لگی۔ سچ مانو بنّو میری (تم کو یہاں ایک پیارئ کس دلگداز انداز میں سن رہی ہو) اس لوزی کے ساتھ گزری ہوئی وہ ایک رات مجھے ہمیشہ پوری پوری، مکمل مکمل سی لگی۔ پتہ نہیں کیوں میرے سارے احساسات پر اس رات کی تکمیل کی ایک چھاپ اب بھی ہے، بڑی گہری، مٹتی ہی نہیں۔ اس رات

کے بعد لوزی سے میں آج تک کہیں نہیں مل سکا، لیکن محسوس ہوتا رہا کہ اس رات کی سیاہی سچی سیاہی تھی جو ہمیشہ، ہر لمحہ، ہر جگہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہی، بس ایک کھوج، ایک تپش، ایک پیاس، جس سے جینے کی تمنا کی تعمیر ہوتی ہے۔ شدید تمنا' اتنی شدید کہ میں تو بھول بھی چکا تھا کہ اس تسلسلِ حیات میں موت بھی کوئی آنے والی گھڑی ہوتی ہے۔

مجھے ضرور کسی کی تلاش تھی، کھوج تھی، شاید تمہاری۔ سچ مانو بنّو، تمہاری اس لیے کہ میں نے تمہیں کھو دیا تھا، وقت کی منجدھار میں تمہیں بے سہارا چھوڑ دیا تھا اور کناروں پر پتہ نہیں میں کیا کھوج رہا تھا۔ بار بار ایک خیال، ایک زہریلے سانپ کی طرح پھن اٹھائے سامنے آجاتا کہ پہلی محبت میں اگر بے وفائی کر بیٹھو تو عمر ساری نئی نئی محبتوں کی تلاش میں گزر جاتی ہے کہ کہیں پہلی محبت کی شکل میں کچھ مل جائے بس ایک مسلسل تشنگی۔ پیاس۔ جو وقت کے ساتھ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

میں تو نگر نگر گھوما۔ یورپ کے سارے ممالک دیکھ ڈالے۔ بڑے سے بڑے شہر میں، سوتے دن اور جاگتی راتیں گزاریں۔ شہروں میں تو زندگی کا ہر حصہ بڑا سجا سجایا، پرلذت اور قیمتی لگا، لیکن بازار سا۔ جہاں عیش نام کا وقفہ۔ حیات شروع ہوتا ہے دیوانگی سے اور ختم ہوتا ہے ایک آگاہی سے۔

اس طرح دیکھو میری داستان بھی کتنی برہنہ برہنہ دیوانگیوں سے گزر کر ایک پرسکون ہوشمندی پر ختم ہو رہی ہے، ڈھکی چھپی باخبری۔ ہوشمندی۔ اب صرف تم ہو گی اور میں۔ اب دنیا کچھ اور بے خبر اور بے نیاز ہو جائے گی ہم سے، جیسے نہ ہم اس دنیا میں ہیں نہ دنیا ہم میں۔ دنیا جب تک کسی کی رقیب و دشمن بنی رہتی ہے وہ اس پر اپنی پوری توجہ رکھتی ہے، کڑی نظر رکھتی ہے، لیکن جب یہ رقابت، دشمنی ختم ہو جاتی ہے تو وہ ہم سے بالکل بے خبر ہو جاتی ہے۔ بے نیاز ہو جاتی ہے اور یہ بے نیازی، بے خبری، بے توجہی دنیا کا سب سے بڑا ظلم ہوتی ہے جو دنیا کسی پر اس طرح کرتی ہے جیسے وہ اس کا آخری وار ہو اور اس آخری وار کے بعد اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ انسان مر گیا اور اب اس سے دنیا کو کوئی خوف ہے نہ کوئی تعلق۔ انسان سے دنیا کا تعلق صرف اس ڈرپوک دنیا کے اندر لبے ہوئے ایک خوف کی پرچھائیں

ہوتا ہے اور کچھ نہیں .... اس گھڑی کے بعد جب کہ دنیا کسی انسان سے بے خوف اور بے تعلق ہو جاتی ہے، انسان زندہ بھی رہتا ہے تو اس طرح جیسے ایک معّرا کتبہ، جو قبر کے باہر ہو یا اندر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

واقعی اب جب میں ہزار ہا گناہوں کی دھنک سے گزر کر زمین کی طرف آرہا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں بھی ان رنگتوں کی بھیگی لذتوں کا ایک قطرہ ہوں۔ صاف، شفاف اور پھر دھرتی کی کوکھ کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ ان گھنے بادلوں سے نکل کر آرہا ہوں، جو بڑی ہی رنگ رنگیلی تہذیبوں کی طرح اس دنیا پر چھائے رہتے ہیں۔

یہ آخری برسات ہوگی اور ان گھٹاؤں سے برسنے والی برسات کا ایک ایک قطرہ بالکل نتھرا، نتھرا اور پاک ہوگا۔ پورا بھروسہ کر لو۔

تم چاہو نہ چاہو، ضروری تو نہیں۔ لیکن جی چاہتا ہے ایک ارمان سا ہے دل میں کہ ہم شادی کر لیں۔ میری اس بات پر تمہاری اس عمر میں بھی یقیناً تمہارے دل کے قریب ایک ایسا ہلکا پھلکا دھکّا سا محسوس ہوگا جس سے ایک دوشیزہ کا سارا وجود اندر ہی اندر تہس نہس ہو جاتا ہے، جیسے ایک جھکڑّ سا آگیا ہو۔ لیکن اس کے رخِ زیبا پر تو بس ایک ہلکا سا، مہین سا سرخ سرخ احساس ابھر کر ایک ہلکی سی آنچ بن جاتا ہے، جس کے بجھنے میں بڑی دیر لگتی ہے۔

دیکھو، مجھے کتنا یقین ہے اور میں اس یقین سے کتنا سرشار ہوں کہ اسٹیشن پر تم مجھے لینے ضرور آؤ گی اور خدا کرے تم مجھے اس پیڑ کے سائے میں کھڑی ہوئی ملو، جو آج پھل پھول کر چھتنار ہو گیا ہوگا۔ ہماری اگلی نسل کا وہ پیڑ۔

میں آرہا ہوں .... بس اتنے ہی بوسے جتنے میں ان (۳۲) سالوں میں تمہارے لے سکتا اور اپنی زندگی کو تمہارے وجود کی ساری لذتوں میں بسا کر اس مقام پر پہونچ جاتا جسے سیرائی حیات کہتے ہیں۔

پہچان تو لوگی نا مجھے؟ چہرے پر سرخی تو ہے لیکن اس خون کی نہیں جو ایک عمر کی لذتوں کو لیے ہوئے بس یونہی بے مقصد تیز تیز سارے بدن میں دوڑتا رہتا ہے۔ یہ سرخی تو اب اس جلے بجھے خون کی ہے جس کی بے رنگی ایک بار چہرے پر چھا جاتی ہے تو پھر کبھی رنگ نہیں بن پاتی۔ ہاں اب بھی اونچا پورا ہوں اور بڑا آدمی لگتا ہوں

کیونکہ میرے سر کے بالوں میں اور میری وضع دار ڈاڑھی میں بڑی ہی باوقار، سنجیدہ، پرفریب اور روشن سفیدیاں ہیں۔ بس ٹماٹر کے ہلکے رنگ کا سلیک اور سفید پتلون پہنا رہوں گا۔ ایک بڑی ہی شاندار بلکہ نایاب قسم کی چھڑی میرے ہاتھ میں ہوگی اور موزوں زاویوں پر موزوں انداز میں دمکنے والی کالی عینک ہوگی میری آنکھوں پر اور چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوگی جو میرے اندرونی طوفان کا ایک پرسکون عنوان ہوگی ...... بس ......

تم کو پہچاننے میں مجھے تو کوئی دِقت نہیں ہوگی کیونکہ زندگی کا ہر لمحہ تم کو دیکھتا رہا ہوں ...... ہر طرح ...... دیکھ لینا کس اعتماد اور یقین کے ساتھ تمہاری طرف تیزی سے بڑھ آؤں گا! اس طرح کہ تم یہی محسوس کروگی کہ زندگی کا وہ حسین اور جواں لمحہ واپس لوٹ آیا ہے جب کہ ہم پہلی بار ہم آغوش ہوئے تھے۔ آہ ...... دیکھو، وہی ولولہ سینے میں اٹھ رہا ہے، ایک لاوا سا۔ اس لاوے کے مقابلے میں ہم اب بھی صرف خس و خاشاک ہیں۔ بہت جلد تم تک پہونچ جاؤں گا۔

بنّو کا باورا

باب (۱۸)

خط سے نظر اٹھا کر مجھے فطرتاً پروفیسر کی طرف دیکھنا پڑا، لیکن مجھے کسی بھی رخ پر ٹھیک سے کچھ نظر نہیں آیا۔ بس ایک شور سا تھا میرے کانوں میں۔ میرے وجود کے ایک ایک گوشے میں گونج رہا تھا۔ شور و غل کی بھی تو حدود ہوتی ہیں، وہ حدود سمٹ کر چاروں طرف سے میرے قریب آرہی تھیں۔ آوازوں کی حدود ...... پھر وہ آوازیں ایک واضح طول و عرض میں ڈھلنے لگیں۔ اور میں محسوس کرنے لگا کہ میں کہیں ان معین حدود میں ابھی موجود ہوں۔ دھیرے دھیرے وہ شور وہ آوازیں ایک ہلکی ہلکی روشنی میں تبدیل ہونے لگیں اور اس روشنی میں مجھے کچھ نظر آنے لگا۔ ہاں دنیا بھر کی روشنی اپنی بصارت ہی تو ہوتی ہے۔ اب وہ روشنی مجھ سے کچھ کہنے بھی لگی ہے۔

"تم کونسے دوسرے آدمی ہو، تم بھی تو وہی ہو۔ تمہاری وہ تڑپ، وہ بے چینی جس کو

نہ تم کوئی مفہوم دے سکے ہو نہ کوئی تصور بنا سکے ہو۔ صاف صاف چھ کہنے والی آواز نہ واضح طور پر سمجھ میں آنے والی خاموشی۔ لیکن ایسا ضرور لگتا ہے کہ وہ فرار ہی تو تھا، جذبہ، فرار .... صدیوں پرانی، زندگی کی بے رنگیوں سے، بے راہ رویوں سے، بے معنی پابندیوں اور بندشوں سے، عہد و پیمان کی تہذیب سے .... فرار، جس نے پروفیسر کو انتہائی پرتلذذ بد مستیوں اور بے خبریوں سے نواز کر کوئی پچھتاوا نہیں دیا بلکہ ایک پرامید اور ہرے بھرے گھنے پیڑ جیسا پرسکون مستقبل دیا ہے .... ایسے ہی تو ذی حس تھے وہ سب، ذی روح و ذی فہم تھے، دانا و دانشور تھے جنھوں نے وقت کی راہوں کو حسین سے حسین موڑ دیے، اس طرح کہ چلتے چلتے ان جلوہ افروز حقیقتوں کی طرف زندگی کی باگ موڑ دی جہاں کہ حق و لطافت کے اسرار ان پر کھلے۔ زندگی کی شوخیوں اور عشوہ طرازیوں کے رنگ میں ایک عشق رواں دواں ملا، کتنے ہی عیش فسوں ساز ملے۔ وہ ان کا ایک جذبہ، بے اختیار تھا۔ جذبہ۔ فرار تھا۔ جس کا پرشکوہ نام تھا بغاوت۔ اب لگا وہ روشنی جو میرے اطراف پھیل رہی تھی وہ اسی جذبے کی جوت تھی، اس کا تیج تھا، اس کا نور تھا ....

کھٹاک۔ کھٹاک۔ کھٹاک۔ کتنی زور سے پٹریاں بدلیں، ایک جھکولا سا لگا۔ میں نے اپنے سارے وجود کو اپنے اندر ایک عجیب کرب میں مبتلا پایا کہ اب ساری ہی حقیقتیں میری نظر میں تھیں۔ زندگی کے جھولے میں ہولے ہولے جھولتا ہوا پروفیسر کس سکون اور یقین کے ساتھ اپنے برتھ پر سویا ہوا تھا۔ اب وہ آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی روشنی بوگی کی ہلکی زرد روشنی میں تبدیل ہو رہی تھی، سارے مسافر سو رہے تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا لیے ہوئے ایک دوسرے پر ڈھیر تھے۔ ایسے میں میں نے نشیلی کو دیکھا، وہ اس تیز رو گردشِ روزگار سے بے خبر، اپنے آپ سے بے خبر بڑھیا کو لگی لگی ایک پہلو پر سو رہی تھی۔ اس کے چہرے کی وہ بے خبری مجھے پتہ نہیں کس موہوم سی حقیقت سے باخبر کر رہی تھی، میرے دل کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب اس رات کے گزرتے گزرتے اس میں اور مجھ میں ایک تعلق سا قائم ہو گیا ہے اور اس تعلق پر میں نازاں ہوں .... ٹرین کی رفتار اب زیادہ تیز لگی اور اب ہوائیں بھی تیز ہی چل رہی تھیں، ان کا رخ بدل چکا تھا۔ بجائے مخالف سمت کے اب وہ

ہوائیں گاڑی کے ساتھ ساتھ تیزی سے چل رہی تھیں، جیسے گاڑی کو اڑا لے جا رہی ہیں
ان میں اب ایک ایسی ٹھنڈک سی آگئی تھی جو ہر مسافر کو آہستہ آہستہ جگا رہی تھی۔

میں نے پروفیسر کا وہ طویل خط مالِ غنیمت کی طرح اپنی جیب میں چھپالیا تھا یہ سوچ کر کہ رات جو چوری کی ہے میں نے اور اس میں جو مال ہاتھ لگا ہے شاید زندگی کے اگلے سفر میں کبھی کہیں کام آجائے۔ اور اب پروفیسر کو اس خط کی ضرورت ہی کیا ہوگی۔ اس کی اس داستان کے مکمل ہونے کے لیے تو بس چند گھڑیاں رہ گئی ہیں۔ اس کے بعد شاید پروفیسر اور اس کی بنّو ایک پرسکون ندی کی طرح کچھ دور تک بہہ کر وقت کے گہرے سمندر میں مل جائیں گے۔ پھر نہ پروفیسر رہے گا نہ اس کی بنّو۔ نہ وہ قصصِ رنگ و نور، نہ وہ حادثات شور و شر۔ نہ وہ وفاجوئی، نہ جفاخوئی، نہ وہ ضمیر شوریدہ نہ وہ خیالِ جرم و سزا، نہ حالات کی بدخوئی، نہ وہ جذبہ فرار کی خوش خلقی۔ زندگی کبھی کوئی ٹھوس تصور تو بن نہیں سکی۔ زندگی تو وہ سب کچھ کبھی بن ہی نہیں پاتی جس کو ہم زندگی سمجھتے ہیں اور شاید کبھی وہ بالکل ویسی ہی بن جائے تو پھر اس کا نام زندگی نہ ہو۔

انسان جی لیتا ہے، ایک عمر گزر جاتی ہے، پھر ایسا ہی لگتا ہے کہ زندگی جس کا واقعی وجود ہے وہ تو اس سے ہر گھڑی دور دور ہی رہی اور اپنے آخری لمحے پر بھی ایسی ہی لگی جیسے وہ صرف آنے والے انسان کا انتظار کر رہی ہے، کچھ دور کھڑی ہوئی۔

اس مختصر سے سفر میں کتنوں ہی سے میرا ایک تعلق ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کیا بات تھی، سبھی مجھ سے بے تعلق لگ رہے تھے۔

بڑھیا کی پتھرائی بے جان آنکھیں آگے کا کوئی منظر نہیں دیکھ رہی تھیں۔ پیچھے کی طرف نہ جانے وقت کا کتنا طویل فاصلہ طے کر کے، بھولے بسرے ماضی کے کسی موہوم سے لمحے پر اس کی نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ اسے جو کچھ بھی دیکھنا تھا، وہ تو جیسے پیچھے ہی رہ گیا تھا اس کے بعد، اس کے ساتھ، اس کی گود میں لیٹی ہوئی وہ نوخیزہ، اب جاگ اٹھی تھی وہ بھی مجھ سے اب بے تعلق لگتی تھی۔ پروفیسر تو شاید بھول بھی چکا تھا کہ اس کے ساتھ رات کا مسافر میں بھی رہا تھا۔

جانے کیا ہوا اچانک ہر طرف سے ڈبے میں روشنی ہی روشنی در آئی پھر ہر شئے

مجھے مدھم مدھم سی دکھائی دینے لگی اور میرا کوئی ہم سفر میری نظروں کے سامنے نہیں تھا نہ وہ بڑھیا، نہ وہ نشیلی، نہ پروفیسر۔ روشنی ہی روشنی زمین کے ساتھ گھومتے ہوئے، پہاڑوں تک پھیلی ہوئی۔ اب نظروں میں ایک نئی صبح کے نئے افق تھے۔

بس ایک شور ہی شور۔ آواز ہی آواز۔ میری نظروں کے سامنے سرعت سے بدلنے والے مناظر کی آواز۔ ایسی آواز اور ایسا شور شاید میرے کان پہلی بار سن رہے تھے۔ وہ زندگی کا ایک بالکل ہی بدلا ہوا لمحہ تھا، اور زندگی ایک ایسی زبان تھی جس سے میں آشنا نہیں تھا۔ اور یہ مناظر ایک سے دو، دو سے دس اور پھر پتہ نہیں کتنے اور کہاں تک پھیلے ہوئے پٹریوں کے جال، پٹریوں کے نیچے بنے ہوئے پل اور اوپر بھی بنے ہوئے پل۔ ایک ساتھ دوڑنے والی دو تین ٹرینیں۔ ان گنت سگنل۔ ہرے ہرے لال لال۔ اونچے اونچے، آسمانوں کو چھوتے ہوئے تاروں کے کھمبے۔ پھر آگے اونچی اونچی عمارتیں۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے باغات۔ پھر کہیں گندی بستیاں۔ سڑاند بھری۔ کئی عالیشان محلات، کئی مسجدیں، کئی کلیسا، کئی مندر۔ اچانک جیسے ہماری ٹرین سے کوئی دوسری ٹرین ٹکرا جائے، کچھ ایسی ہی تیزی سے مقابل سے آنے والی ٹرین، تیزی سے کوک بھرتی ہوئی نکل گئی۔ یہاں تو کوئی کسی گاڑی کو دیکھتا ہی نہیں۔ یہ ان گنت چیخیں ہی چیخیں، کچھ اس طرح میرے دماغ کے ایک ایک گوشے میں گھستی ہوئیں، جیسے کئی سوئیاں ایک ساتھ چبھوئی جا رہی ہوں۔ یہ سب کیا شور ہے، کیا ہنگامہ ہے۔ یہاں تو سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہوئی جاتی ہیں۔ مجھے تو یہ بھی ہوش نہیں کہ رات میں نے سفر کیا ہے اور میری منزل بہت ہی قریب آ گئی ہے۔ یہی تو ہے۔ جب ٹرین ایک بہت ہی بڑے پلیٹ فارم پر رکی تو مجھے صرف آدمی ہی آدمی نظر آئے، جو ہرگز مجھ جیسے آدمی نہیں تھے۔ بالکل مختلف تھے۔ اس شور و غل کے لہجہ میں ایک ساتھ بولنے والے۔ بے وجہ بھاگنے والے۔ بالکل عجیب اور بڑی ہی اجنبیت اور رعونت لی ہوئیں، کٹے پھٹے لبادوں میں بڑی ہی پرکشش عورتیں۔ لباس بھی ایسے کہ عمر کا فرق نظر ہی نہ آئے۔ یہ کون ہیں؟ یہ ...... اور یہ ......؟ ساری دنیا مجھ سے بے خبر تھی، یا میں ساری دنیا سے بے خبر ...... مجھے کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ میں ٹرین سے کب اور کس طرح اترا۔ اور کچھ دیر مجھے یہ بھی محسوس ہوتا رہا کہ اب وہاں

آکر شاید میں ختم ہوجاتا ہوں ...... اور آگے کچھ بھی نہیں ہے۔

باب (۱۹)

میرے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں چھپے ہوئے میرے ایک روشن و تابناک مستقبل کے تصور کی طرح آج سورج گہرے سیاہ رنگ کے بادلوں میں صبح ہی سے پوشیدہ سا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور میں اپنا سب سے اچھا لباس پہنے، ہر طرح بارش سے محفوظ رہنے کی کوشش میں ایک پان کی دکان کے شیڈ میں سکڑا سکڑا کھڑا ہوا تھا اور بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہا تھا، میری نظروں کے سامنے شہر کی ایک بڑی شاہراہ پر کئی موٹریں تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ بارش کی وجہ سے پیدل چلنے والے تو راستے پر نظر نہیں آرہے تھے، البتہ بسیں اور کچھ اور سواریاں گزر رہی تھیں۔ لیکن میری نظریں آج ہر گزرتی ہوئی کار کو بہت زیادہ غور سے دیکھ رہی تھیں بعض بعض کاروں میں کالج اور اسکول کو جانے والے لڑکے نظر آجاتے تھے۔ کاروں کے اندر کھڑکیوں کے شیشوں کے پیچھے ہنستے ہوئے چہرے، سنجیدہ چہرے اور زندگی کا سکون لیے ہوئے چہرے تھے۔ ان کی نظریں مجھ پر پڑجاتیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کل وہ مجھے پہچان جائیں گے اور ان کو یہ منظر یاد رہے گا کہ وہ تیزی سے اپنی قیمتی کاروں میں بیٹھے کالج کو جارہے تھے تو میں پان کی دکان کے ایک شیڈ میں کھڑا ہوا بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ دو بہت ہی شاندار لمبی چوڑی موٹریں ایک دوسرے سے بہت ہی قریب قریب دوڑتی ہوئی میرے سامنے آگئیں، پچھلی گاڑی کا ڈرائیور مسلسل ہارن بجا رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ سامنے والی گاڑی سے آگے نکل جائے، میں نے دیکھا دونوں گاڑیوں میں دو حسین و جمیل شوخ چہرے گاڑیوں کے بند شیشوں میں سے ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑے ہی شرارت آمیز انداز میں ہنس رہے تھے اور اپنی اپنی گاڑی کی رفتار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گھڑی بھر میں دونوں گاڑیاں بڑے ہی امیرانہ انداز میں میرے سامنے سے گزر گئیں۔ لیکن پچھلی گاڑی میں بیٹھی ہوئی شوخ و طرار

حسنیہ اپنی سیٹ کی پشت پر کچھ جھول گئی۔ اس کے کٹے ہوئے بال اس کی گوری گوری گردن پر لہرا گئے۔ ایسے میں شاید اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی، اس نے اپنی گردن کو ایک جھٹکا دے کر گاڑی کے پچھلے شیشے سے میری طرف دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ شاید میں اپنے سب سے اچھے لباس میں اس وقت کچھ نمایاں اور پرکشش لگ رہا ہوں گاڑی نظروں سے دور ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں جلتے ہوئے سگریٹ کا ایک بہت لمبا کش لیا اور محسوس کیا کہ شاہراہ پر دوڑنے والی گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ میں بھی میں اپنے دل کی دھڑکن صاف طور پر سن رہا ہوں۔ مجھ سے تھوڑی ہی دور دوسری طرف جانے والی ایک پتلی سی سڑک کی موڑ تھی، اس موڑ سے ہوتے ہوئے اس پتلی سی سڑک پر مجھے جانا تھا۔ میں نے سوچا تھا، ہو سکتا ہے یہ میری زندگی کی ایک بہت ہی اہم موڑ ہو۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا، بارش تھم رہی تھی اور شاہراہ پر کھڑی ہوئی بلڈنگوں کی چھتوں پر سورج کی ہلکی ہلکی روشنی نظر آرہی تھی۔

میں شیڈ سے باہر آگیا اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اس موڑ سے ہوتے ہوئے اس پتلی سڑک پر آگیا۔ جب میں کالج ہاسٹل کی بلڈنگ کے قریب پہونچ گیا تو سورج کی شعاعیں سارے میں پھیل گئی تھیں۔ میری نظروں کے سامنے ہاسٹل کی گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے گل مہر کے دو پیڑ اپنی سرخیوں میں نہائے ہوئے مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے نظر آئے۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے مجھے ایک جھجک سی محسوس ہوئی۔ لیکن ہاسٹل کی بلڈنگ کو چور نگاہوں سے دیکھتا ہوا میں سیدھے ہاسٹل وارڈن کے گھر کی سیڑھیوں کی طرف چل دیا جو گیٹ کے بالکل مقابل تھا۔ وارڈن کے مکان کے ورانڈے میں لکڑی کے ایک اسٹینڈ پر لگے ہوئے آئینے میں میرا عکس مجھے نظر آیا۔ مجھے اپنا چہرہ روشن لگا۔ اس اسٹینڈ کے قریب ہی ایک ہیٹ اسٹینڈ تھا۔ اس سے کچھ ہٹ کر ورانڈے کی ایک کھڑکی کے شیشوں سے جھانکتا ہوا ایک پیڈسٹل لیمپ کا خوبصورت شیڈ نظر آیا۔ میں نے ایکبار اس کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانک کر دیکھا، مجھے اپنی وہ حرکت کچھ عجیب سی لگی لیکن اندر سلیقے سے آراستہ کیا ہوئے ڈرائینگ روم کا فرنیچر مجھے بہت اچھا لگا۔ میں پیچھے ہٹ آیا، ایکبار پھر اپنے آپ کو میں نے ورانڈے میں لگے آئینے میں دیکھا۔ میرے چہرے پر ہلکی سی تشویش تھی۔ میں نے رومال سے اپنے چہرے کا

پسینہ صاف کیا۔ اور اپنے ہاتھ صاف کیے اور آگے بڑھ کر کال بل کا بٹن دبا دیا۔ بل کی آواز کے ساتھ میں اس طرح پیچھے ہٹ گیا جیسے مجھے شاک لگ گیا ہو۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اس گھر میں رہنے والے شخص کا سارا بدن تو ہندوستان کی کالی مٹی سے بنا ہوا ہے لیکن اس کی زبان اور اس کے دماغ سے وہ مٹی جھڑ چکی ہے۔ اور اس جگہ انگلستان میں اس نے ایک مغربی دماغ اور مغربی زبان فٹ کروالی ہے۔ پکی عمر کے اس کالی مٹی کے تودے کے تصور نے مجھے وقت سے پہلے ہی بے حد مایوس کر دیا تھا۔ دو گھڑی انتظار کے بعد میں نے پھر کال بل کا بٹن دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ اندر سے آواز آئی۔

" Who is there?"

میں کوئی جواب تو نہیں دے سکا۔ لیکن جب دروازہ کھلا اور اس کالی مٹی کے تودے نے اپنی پتلی مٹیالی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے اپنے آپ کو بالکل ساکت و جامد پایا۔ اس کے کالے ہونٹوں میں پھنسے ہوئے ایک آبنوسی رنگ کے پائپ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی خوشبو نے میرے ذہن کو اور زیادہ منتشر کر دیا۔ اس کے چہرے کی سیاہی پر، اس کے ہلکے گلابی رنگ کے قیمتی گون کا عکس پڑ رہا تھا اور اس گون کے روئیں روئیں سے ہلکی گلابی روشنی پھوٹ رہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا میں اس روشنی کے ہالے میں پھنس چکا ہوں۔ جب اس نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھ سے کچھ سوال کیے تو ایسا لگا کہ اس کی خالص انگلستانی زبان سے کچھ الفاظ پھسل کر وہیں زمین پر گر پڑے، مجھ تک نہ آسکے۔ میرا جواب نہ پا کر اس نے بڑے ہی غور سے دیکھا مجھے۔ مجھے محسوس ہو گیا کہ میں ایک غیر مہذب ار ناشائستہ آدمی ہوں اور میرا سب سے اچھا لباس جو میں نے اس وقت پہن رکھا تھا وہ بے حد قدیم طرز کا لباس ہے۔ اور اس میں چھپا ہوا میرا بدن کسی پچھڑے ہوئے ماحول کا پروردہ ہے۔ میری سانسیں مجھے بھاری لگیں۔ اور محسوس ہوا کہ مجھے ایک نئے معیار تک پہونچنے کے لیے ابھی اپنے سینے سے بڑا بوجھ ہٹانا ہے۔ وارڈن کی نظروں نے مجھے ایک بار بڑے ہی تحقیر آمیز انداز میں کہہ دیا کہ میں اس ہاسٹل میں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ لیکن پتہ نہیں میں نے کس لہجے میں اور کس انداز میں ہاسٹل میں اپنی شرکت کی درخواست

کی کہ اس نے کہا۔" ٹھیک ہے۔ہاسٹل کیپٹن سے مل کر بات کر لو۔ میں نے جانے کس انکساری سے اس کا شکریہ ادا کیا، وہ مسکرا پڑا۔ میں پلٹ کر ہاسٹل کی طرف چل دیا۔

ہاسٹل کے کمروں پر جب میری نظر پڑی ، جن کے دروازوں اور کھڑکیوں پر خوبصورت رنگوں کے پردے لہرا رہے تھے تو مجھے ایک شدید احساس کمتری نے دبوچ لیا۔ بڑی ہی شدت سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہاں آنے کے لیے تو بڑا ہی شائستہ ، معیاری اور خوش نما سامان ساتھ ہونا چاہیے ، جیسے ایک دو قیمتی قسم کے سوٹ کیس ، ایک اٹیچی کیس ، نئے قسم کے ہولڈآل ، ایک آدھ خوبصورت ٹفن باسکٹ ، بڑا ہی شاندار فلاسک تاکہ یہاں کے رہنے والے امیر گھرانوں کے لڑکوں پر میرا پہلا ہی اثر اچھا پڑے۔ لیکن جب میں نے اپنے سامان کا خیال کیا جو ایک چھوٹے سے ٹرنک اور ایک دری میں بندھے ہوئے بستر پر مشتمل تھا، تو میرے پسینے چھوٹ گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنا سامان لیے کوریڈور سے گزر رہا ہوں اور ہاسٹل کے لڑکے مجھے دیکھ کر ہنس رہے ہیں، بلکہ سامان اٹھا کر لے جانے والے ہاسٹل بوائے کے پاس بھی میری وقعت نہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ میں شام کے جھٹپٹے میں، جب کہ سارے لڑکے باہر بازار میں وقت گزارنے کے لیے چلے جائیں گے ، چپکے سے اپنا سامان لیے یہاں منتقل ہو جاؤں گا۔

باب (۲۰)

اس شام میں اپنے پروگرام کے مطابق ہاسٹل میں منتقل ہو گیا۔ کمرے میں اکیلا تھا۔ میرے کمرے کی ایک کھڑکی باہر سڑک کے رخ پر کھلتی تھی۔ کھڑکی کے مقابل ایک شاندار مکان تھا۔ مکان کے ورانڈے میں اس وقت ایک مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دروازوں پر بڑے ہی قیمتی اور خوش رنگ پردے لٹکے ہوئے تھے اور صحن میں کچھ اس سلیقے سے چمن بندی کی گئی تھی کہ صاحب مکان کی رہائش کا انداز دیکھنے والوں کو مرعوب کرتا تھا۔ مں اپنے منتشر دماغ کے ساتھ اپنے نئے کمرے

کی کھڑکی میں کھڑا ہوا اس مکان کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میری نظروں میں کچھ چمکیلی پر کشش توقعات کی ایک دمک تھی اور اس دمک کے پیچھے وہ گہرا اندھیرا تھا، میرے پچھڑے ہوئے ماحول کا اندھیرا جس سے نکل کر میں ان نئی روشنیوں میں قدم رکھ رہا تھا۔ میں نے ایک ایسے کالج میں داخلہ لیا تھا جہاں نواب اور امیر خاندانوں کے لڑکے پڑھتے تھے، لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ جہاں نہ صرف نئے نئے اور قیمتی ملبوسات کا خاموش مقابلہ ہوتا تھا بلکہ اکثر لڑکے روز اپنی نئی نئی کاروں کی نمائش بھی کرتے تھے۔ بڑے ہی دلفریب انداز میں انگلش بولتے تھے اور کالج کے سامنے بنے ہوئے مِلک بار کے خوبصورت لان میں، رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے بیٹھ کر قسم قسم کے ٹھنڈے مشروب، آئس کریم، کافی اور کٹلیٹ اڑایا کرتے تھے۔ مجھے یہ بات بھی محسوس ہو رہی تھی کہ ان کے ساتھ مل جل کر رہنے کے لیے کتنے مال کی ضرورت ہوگی اور یہ مال میرے پاس کہاں سے آئے گا۔ یہاں میرے ساتھی ہوسکتا ہے میری کم مائیگی کا مذاق تو نہیں اڑائیں گے لیکن یہ مجھے نظر انداز نہ کر دیں۔ ہوسکتا ہے میرے ہاسٹل کے ساتھی مجھے میرے کمرے میں ایک دری میں بندھے بستر اور وزنی ٹرنک کے ساتھ ہی نہ چھوڑ دیں۔ ان خیالات سے اور ان خدشات نے میرے ذہن میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار کو بہت سست کر دیا۔ میں نے ایک سگریٹ جلالیا۔ ایک بھرپور کش لیا۔ ایک سکون سا محسوس ہوا۔ ٹھیک اس وقت مقابل کے مکان میں ورانڈے کی مدھم روشنی میں مجھے ایک سایہ سا نظر آیا۔ بڑا ہی دلفریب سایہ۔ ریشمی لباس میں ملبوس سایہ .... اس مدھم روشنی کے مہین سے پردے کے پیچھے چھپا ہوا سایہ۔ شام کی خاموشی میں لپٹا ہوا سایہ۔ میں چونک پڑا۔ میرے ذہن کی رگوں میں رکا ہوا خون دوڑنے لگا۔ اس مدھم روشنی میں امید کی ایک سیاہ لکیر نظر آئی۔ کتنا موزوں قد۔ ہلکے سرخ رنگ کا ریشمی لباس۔ کیسی ٹھنڈی آگ کا شعلہ تھا وہ۔ پل بھر میں وہ سارے خیالات جو اب تک میرے ذہن میں وقت سے پہلے رات کی تاریکیاں پھیلا رہے تھے، میرے وجود کی سرحدوں سے باہر نکل گئے۔ اس تاریک لمحے کی کوکھ سے ایک حسین پیکر ابھر چکا تھا۔ اس دل آویز قد والی لڑکی نے جھک کر فرش پر پڑی ہوئی کوئی چیز اٹھائی ایسا کرنے میں اس کے شانوں سے اس کی اوڑھنی ڈھلک گئی۔ اس نے اوڑھنی

ٹھیک کی اور جب اپنی گردن پر پھیلے ہوئے بال اپنے ہاتھ میں سمیٹ کر اس نے ٹھیک کیے تو اس کے کانوں میں لٹکے ہوئے بوندے دمک گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس لڑکی نے مجھے اس طرح کھڑکی میں کھڑا ہوا دیکھ لیا ہے۔ وہ میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے میں اسے ٹھیک سے نظر نہیں آرہا ہوں۔ مجھے دیکھ کر بھی اس نے نظریں نہیں جھکائیں۔ پھر ایسا لگا جیسے وہ دیکھ تو مجھے رہی ہے لیکن اس کا دھیان میری طرف نہیں ہے۔ شاید پچھلے سالوں میں اس کھڑکی سے اس کو کوئی دیکھتا رہا ہو اور اس سال بھی اس کھڑکی میں اس کے نظر آجانے کی اسے توقع ہو۔ آس ہو۔ یا میری شکل میں نیا مشغلہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ یا پھر میرے لیے ایک دلچسپ مشغلے کا سامان ہو رہا ہو۔ بالکل ہی بے ترتیب خیال میرے ذہن میں ابھرنے لگے۔ لیکن گھڑی دو گھڑی اس طرح میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ لڑکی ایک مطمئن چال کے ساتھ گھر میں چلی گئی۔ میں پھر بھی اس مدھم روشنی میں کچھ کھوجتا رہا اور پلٹ کر جب میں نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا تو پلنگ پر میرا بستر ابھی بندھا پڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کے دروازے کی چٹخنی لگادی اور واپس آکر اپنا بستر کھول دیا اور بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میں چاہتا تھا میری زبان کی طرح میرا دماغ بھی چپ ہو جائے اور اس وقت کچھ نہ سوچے۔ کوئی خیال نہ آئے۔ کسی قسم کا احساس نہ جاگے، میں چپ چاپ لیٹا رہوں۔ اس لڑکی کے نظر آنے سے پہلے میرے خیالات نے میری آنکھوں کے سامنے کتنے گہرے اندھیرے پھیلا دیے تھے۔ میرے شانوں پر کتنا بوجھ لاد دیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میرا کمرہ پل بھر میں قیمتی اور آرام دہ سامان سے آراستہ ہو جائے۔ بڑے ہی قیمتی اور خوشنما لباس ہینگروں پر لٹکے نظر آئیں تاکہ میں جب اپنے کمرے کا دروازہ کھولوں اور ہاسٹل کے ساتھی آکر دیکھیں تو ان کی آنکھیں چکاچوند ہو جائیں اور وہ سب میری خاندانی امارت سے مرعوب ہو جائیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں، سامنے میرا اوزنی ٹرنک پڑا تھا۔ میں نے پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دماغ پھر منتشر ہو گیا۔ لیکن ایسے میں ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا، میرے بدن کو چھوتا ہوا گزر گیا اور ساتھ ہی جانے کیوں ایک سکون افزا، میٹھے سروں میں بجنے والی لے کی طرح ممی کا خیال میرے ذہن سے ہوتا ہوا میرے سارے وجود پر چھا گیا۔ "تم خوب پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جانا۔ ہر بڑا

آدمی اپنے ذہن کی، اپنی زندگی کی ان ہی تاریک گلیوں سے گزر کر شاہراہ تک پہونچا ہے اور پھر زندگی کی بڑی سے بڑی شاہراہ نے اس کا شاندار استقبال کیا ہے۔ یہ سارے وسوسے جھوٹے ہیں۔ تمہارے اپنے ذہن کی بے معنی تخلیق ہیں، ان کا کہیں وجود نہیں۔ اس عمر میں، اس جواں عمری میں، انسان کی صلاحیتیں جاگنے لگتی ہیں، دریاؤں کے تیز و تند بہاؤ کی طرح آگے بڑھتی ہیں اور اونچے اونچے کوہساروں سے آبشاروں کی شکل میں گر کر بڑی بڑی چٹانوں کو توڑ کر ناقابل تسخیر سیلاب بن جاتی ہیں۔ دیکھو، میں بھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں کہ تمہاری صلاحیتوں کا سیلاب مجھ سے ٹکرا کر مجھے بھی اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔" ان سرگوشیوں میں عجیب سا جوش تھا۔ سینے میں جذبات اتھل پتھل ہو رہے تھے۔ ان سرگوشیوں میں ایک یقین تھا، اعتماد تھا۔ میری رگ رگ میں دھیمی دھیمی آگ سلگ رہی تھی۔ "دیکھو، آنکھیں کھولو۔ تمہارے ساتھی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ تم سب میں ایک ہی خصوصیت نمایاں ہے اور مشترک ہے، وہ یہ کہ تم سب جوان ہو۔ اور اس عمر میں اس خصوصیت کے سامنے دوسری ہر خصوصیت بے معنی ہوتی ہے، ہیچ ہوتی ہے۔ جواں عمر لوگ صرف ہنسنا چاہتے ہیں، کھیلنا چاہتے ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اٹھو تم بھی ہنستے ہوئے، کھیلتے ہوئے اور آگے بڑھتے ہوئے مجھ تک پہونچ جاؤ۔ میں تمہیں زندگی کی ایک حسین موڑ پر مل جاؤں گی۔"

یہ ایک خواب کی سی کیفیت تھی جو میرے سارے وجود کو جھنجوڑ کر گزر گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرہ مجھے زیادہ ہی روشن نظر آیا۔ بستر کی چادر کیسی بھک سفید تھی، تکیوں میں کیسا گداز پیدا ہو گیا تھا۔ میرے ٹرنک کے کونے کس قدر خوبصورت اور دل آویز زاویے لیے ہوئے تھے اور اس کمرے کی چار دیواری میں اپنے پہونچ جانے کا یقین کس طرح ایک تبسم بن کر میرے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا۔

میرے کمرے کے بند دروازے کے باہر کوریڈور میں کچھ لڑکوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی کسی نے سیٹی بجاتے ہوئے ایک انگلش دُھن چھیڑ دی۔ وہ سیٹی بجائے جا رہا تھا اور کچھ لڑکے شور کر رہے تھے۔ ابھی سیٹی کی آواز آ ہی رہی تھی کہ کسی نے ماؤتھ آرگن پر ایک دوسری دُھن چھیڑ دی۔ بڑی ہی چلتی

ہوئی دھن تھی، مجھے ایسا لگا اس دُھن پر کچھ لڑکے ناچنے لگے ہیں ۔ ہی ہا ۔ ہی ہا .... ہی ہا، ہیا ۔ پھر کچھ اتنا شور مچا کہ ماؤتھ آرگن کی دُھن مدھم پڑ گئی ۔ پھر اچانک کوریڈور کے دوسرے کونے سے کوئی زور سے چیخا " You Bloody Swine, "I Will Kill You" اس چیخ کے ساتھ ہی ماؤتھ آرگن کی آواز رک گئی ۔ اور ایسا لگا کہ سب اس چیخ مارنے والے کی طرف بھاگ رہے ہیں ۔ پھر وہی آواز اور شدت کے ساتھ بلند ہوئی ۔ "I Will Kill You" ۔ میں اپنے پلنگ سے اٹھ بیٹھا اور تیزی سے دروازے کے پاس جاکر رک گیا ۔ معلوم ہوتا تھا کوئی جھگڑا ہو رہا ہے ۔ لیکن اس سے قبل کے میں دروازہ کھولتا، کوریڈور میں کئی قہقہے سنائی دیے اور ان قہقہوں میں کسی نے چیخ کر کہا ۔" سالے کو بہت چڑھ گئی ہے، بند کردو کمرے میں اسے ۔" ایک دوسری آواز آئی ۔" نہیں اسے ادھر لے آؤ، اسے اور پلاتے ہیں ۔" پھر آواز آئی ۔ " نہیں، نہیں جانے دو ۔" پھر دوسری آواز آئی ۔" ارے پلاؤ یار، اور پلاؤ ۔ تھوڑی سی Chilled Beer پلاؤ ۔ بالکل ٹھنڈی ۔" میں نے آہستہ سے اپنے دروازے کی چٹخنی کھول دی اور دروازے کے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھا ۔ پانچ چھے لڑکے ایک لڑکے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے، ہاسٹل کے باتھ روم کی طرف بھاگ رہے ہیں اور گالیاں بک رہے ہیں ۔ گھڑی بھر کے لیے کوریڈور میں سکوت چھا گیا ۔ میں وہیں مبہوت سا کھڑا رہ گیا ۔ جی چاہا بھاگ کر جاؤں اور باتھ روم میں ہونے والا تماشہ دیکھوں ۔ لیکن اتنی دیر میں وہ سب باتھ روم سے واپس ہو رہے تھے ۔ اور ایک لڑکا پانی میں شرابور دوسرے دو لڑکوں کے شانوں پر جھولتا ہوا آرہا تھا ۔ سب ہنس رہے تھے ۔ اس لڑکے کا قیمتی لباس پانی میں تربتر تھا اور اب بھی وہ دبی دبی آواز میں کہہ رہا تھا ۔" I Will Kill You, You Bloddy Swine, I Will Kill You" ان لڑکوں نے اسے اس کے کمرے میں چھوڑ کر دروازہ بند کر دیا ۔ پھر ان میں سے کسی نے ایک ایسی ننگی بات کہہ دی کہ سب جی کھول کر ہنسنے لگے ۔ اور اسی طرح ہنستے ہوئے وہ سب کوریڈور میں آگے کی طرف چل دیے ۔ میں نے پھر اپنے دروازے کی چٹخنی لگادی ۔

باب (۲۱)

وہاں سے جب میں لوٹ کر اپنے بستر کی طرف جا رہا تھا، مجھے لگا کہ بغل کے کمرہ کا دروازہ کھل گیا ہے اور کچھ لڑکے زور زور سے باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ ان دو کمروں کے بیچ کی دیوار میں ایک بند دروازہ تھا اور اس دروازے میں شٹرز کا ایک چھوٹا سا حصہ ٹوٹا ہوا تھا، جس میں سے دوسرے کمرے میں، دیکھا جا سکتا تھا بس ایک چھوٹا سا سوراخ تھا، میں نے اس سوراخ پر اپنی آنکھ رکھ دی۔ اس کمرے میں بھی سڑک کی طرف کھلنے والی ایک کھڑکی تھی، جس کے قریب وہاں ایک ٹیبل رکھا تھا اور ٹیبل کو لگی ہوئی تین چار کرسیاں تھیں۔ ٹیبل پر بے ترتیبی سے بکھری ہوئی کتابوں کے ڈھیر تھے، جن پر بہت ساری گرد اٹی ہوئی تھی۔ ان کتابوں کے بیچ بہ مشکل پھنسایا ہوا ایک گرد آلود ٹیبل لیمپ تھا۔ ٹیبل سے کچھ ہٹ کر ایک پلنگ پر ایک آرام دہ بستر پڑا تھا۔ دو تکیے پلنگ کے دو کونوں میں مُڑے تڑُے پڑے ہوئے تھے۔ بیڈ کور کچھ اس طرح بکھرا بکھرا لگتا تھا جیسے کچھ دنوں سے ٹھیک سا بچھایا نہیں گیا ہے۔ ایک ریشمی چمکیلی رضائی فرش پر جھول رہی تھی۔ مچھر دان کے فریم کے کونوں پر قمیض اور پاجامے لٹکے ہوئے تھے۔ فرش پر ادھر ادھر جوتوں کے جوڑ بکھرے پڑے تھے۔ دیوار پر دو بڑے کیلنڈر بہت ہی نمایاں انداز میں لٹکے ہوئے تھے۔ میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا، ایک کیلنڈر پر انقلاب روس کا منظر تھا جس میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع کے سامنے لینن کھڑے ہوئے دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے بتائے گئے تھے اور دوسرے کیلنڈر میں ہندوستان کے کسی گاؤں کی ایک حسین دوشیزہ کی تصویر تھی جو ایک پر سکون ندی کے کنارے ایک چٹان پر اپنے بدن کی ساری رعنائیاں لیے، پانی میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اس حسین خطہ، زمین پر وہ بالکل تنہا ہے اور اسے وہاں کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ وہاں پہاڑیوں تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ پگڈنڈی تھی۔ پتہ نہیں کیوں کسی سرسبز و شاداب پگڈنڈی کو دیکھیے تو لگتا ہے کہ دل میں بھی ایک ایسی ہی خوبصورت سی رہگزر ہوتی ہے اور ایک حسین وجود اس سے گزرتا ہوا قریب آتا ہے۔

ایک بار پھر میری نظر اس دوسرے کیلنڈر پر پڑی، جس میں لنین کو تقریر کرتا ہوا بتایا گیا تھا۔ اس وقت تک میں نے شاید یہاں وہاں کہیں لنین کا نام سنا تھا اور شاید کبھی کہیں لنین کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ لیکن نہ کبھی اس پر غور کیا تھا نہ اس کو کوئی اہمیت دی تھی۔ یہاں اس کیلنڈر میں میں نے لنین کی جو تصویر دیکھی تو مجھے یاد ہے کہ اس کے چہرے پر مجھے ایک چمک نظر آئی تھی اور میں نے اس کے گنجے سر کی چمک میں بھی اپنی آنکھوں کی چمک دیکھی تھی۔ بہرحال یہ ایک پل کی بات تھی لیکن اتنا ضرور محسوس ہوا تھا کہ لنین میں اور مجھ میں ضرور کوئی تعلق ہے کہ وہ ایک بڑا آدمی ہے اور میں بھی بڑا آدمی بننے والا ہوں۔ اس تصویر کو دیکھ کر، خیال آیا تھا کہ پتہ نہیں لنین اپنی تقریر میں وہاں کیا کچھ کہہ گیا تھا کہ سننے والے ہزاروں لوگ بے چین بے چین سے لگتے تھے۔ میرے ذہن و دل میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات و جذبات ایک ہلچل سی پیدا کر رہے تھے جو دراصل کسی علم یا شعور کے مرہونِ منّت نہیں ہوتے بلکہ زندگی کی وہ تخلیق ہوتے ہیں جو زندگی کے غم اور خوشی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ عام سے خیالات جو کچّے سے ذہن پر بھی رقم ہوتے رہتے ہیں اور ایک کتاب ہر ذہن میں مرتب ہوتی رہتی ہے۔ جس کو پوری طرح نہ کوئی عالِم پڑھ سکتا ہے نہ کوئی جاہل پوری طرح اس سے بے خبر ہوتا ہے۔

وہ کیسی گھڑی تھی، ایک زور کی آواز آئی، پتہ نہیں کس کی آواز تھی۔ وہ در آیا، جیسے دروازہ توڑ کر گھس آیا ہو، اس کمرے کا دروازہ نہیں جس میں وہ سب بیٹھے ہوئے تھے بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس نے وہ دروازہ توڑ دیا ہے جس کے شٹرز سے میں چوری چھپے بغل کے کمرے کا نظارہ کر رہا تھا۔ میں چونک پڑا تو لگا اس نے زور سے کہا۔ "پکڑا چور کو۔" اور سیدھے مجھ سے لپٹ گیا وہ مجھے اتنا ہی بھلا لگا پہلی ہی نظر میں ..... لیکن دراصل وہ اس کمرے میں چیخ پڑا تھا، جہاں وہ لڑکے بیٹھے ہوئے تھے "ارے ذلیلو۔" وہ ان سب لڑکوں سے مخاطب تھا۔ "ارے حرام زادو۔ کب بنوگے میری طرح انگریز۔ انگریز ..... انگریز ..... ارے دیوانو۔ انگریز ..... ارے بدبختو، تم تو عمر بھر مغلئی بنے رہیں گے مغلئی۔ واہ، کیا لفظ ہے، مغلئی۔ زبان بالکل کچھوا بن جاتی۔ کچھوا۔ سب کچھوے ہیں سالے۔" وہ زور سے ہنس پڑا۔

جب وہ ساری باتیں بڑی ہی اونچی آواز میں کہہ رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آواز اپنی جگہ ایک روشنی ہے۔ آواز جتنی زیادہ اونچی ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ روشنی پھیلتی ہے۔ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا، لیکن مجھے ایسا بھی تو محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں دراصل میں کھڑا ہوا ہوں اور وہ سب کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ اور میں روشن روشن ہوں۔ جسارت ہی تو زندگی کا نکھار ہے۔ نور ہے۔ اس کا نام رفیع تھا۔

اس نے سارے کمرے پر نظر ڈالی اور تمسخرانہ انداز میں پھر ان لڑکوں سے مخاطب ہوا۔ "ارے بے شرمو، مرجاؤ۔ اس طرح جینے کو بھی بھلا کوئی جینا کہتے ہیں۔ ارے جاہلو، یہ بھی جینے کا کوئی سلیقہ ہے؟ نہ کپڑوں کا ہوش نہ کتابوں کا۔ کمرہ کیا ہے، شاعروں، فنکاروں کا مزار ہے۔ ہر طرف جیسے ان کی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں۔ تھو۔" اس کی نظر کیلنڈر میں لینن کی تصویر پر پڑی۔ "دیکھو اس کو، یہ لینن بھی بڑا مغلئی تھا۔ مغلئی۔ لباس مغربی، دل مشرقی ...."

وہ لڑکے جو اس کی باتوں کو صرف ایک آواز سمجھ کر سن رہے تھے، ان میں سے دو چپ چاپ اس کے قریب پہنچے۔ ایک نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور دوسرے نے دونوں پاؤں، اور اٹھالیا اس کو۔ وہ چیخ پڑا "ارے حرامزادو، کیا کر رہے ہو؟" یہ کہتے کہتے تک وہ پلنگ پر چت تھا اور اپنے جوتوں سمیت اس بستر پر پڑا ہوا تھا ان لڑکوں کی طرف اس نے دیکھا اور کہا۔ "سالو، دونوں مل کر کیوں آتے ہو۔ ایک ایک آؤ۔ ایسا ہاتھ جماؤں گا کہ پھر کبھی اٹھ نہیں سکیں گے۔ اور اٹھیں گے تو صرف قیامت کے روز۔ اللہ کیا اعمال نامہ ہوگا۔ ان گنہگاروں کا!"

اس کے ساتھی اس کو پلنگ پر پٹخ کر اپنی اپنی جگہ اس طرح بیٹھ گئے تھے جیسے انہوں نے ابھی ابھی جو کچھ بھی کیا ہے وہ ان کا روز کا معمول ہے۔ ان میں سے ایک نے ایک ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں لگایا تو رفیع نے ڈبیہ کی طرف بڑی حقارت سے دیکھتے ہوئے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور اپنے جوتوں کو بستر کے بیچ گھسیٹتے ہوئے اُٹھ بیٹھا اور پھر اپنا ہاتھ اپنے منہ پر اس طرح رکھا جیسے اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر بولا۔ "ارے بدذوقو کیا گرا ہوا ٹیسٹ رکھتے ہو۔؟" پھر زیادہ حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ " ارے چارمینار تو نظام پیتے ہیں ۔ تمہارے بادشاہ۔ ارے

جب زندہ ہی رہنا ہے تو صرف اچھے کام کرو۔ اچھے سگریٹ پیو۔ اچھی شراب پیو اور بہت ساری اچھی اچھی لڑکیوں سے پیار کرو۔"Be a class flirt" سالو۔ یہ چارمینار پی پی کر دو دن میں خالی ڈبّہ بن جاؤ گے۔ تمہارے ماں باپ بھی نہیں پہچان سکیں گے تم کو۔"

اس کی باتیں سن کر اس کے ساتھی صرف مسکرا رہے تھے اور ان کے چہروں کے تاثر سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس کی وہ ساری باتیں اس کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہیں اور اس کی باتیں سن سن کر وہ سب خود بھی صحت یاب ہو رہے ہیں۔

مجھے بھی ایسا لگا تھا کہ وہ تو دن کے اجالوں کی طرح میری نظروں کے سامنے چمکنے دمکنے لگا ہے۔ اس قدر تیز و طرار اندازِ سخن، توبہ۔ اس کی ہر بات دل کے خون میں ایک حباب بن کر اٹھ رہی تھی اور وہ حباب ہوا کے ہلکے جھونکوں کے ساتھ اُڑا جا رہا تھا اور غائب ہو رہا تھا۔

ایک چھلانگ لگائی اس نے اور بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تو سب کھڑے ہو گئے۔ سب نے اپنی اپنی جیب ٹٹولی۔ اور سب کمرے سے باہر چلے گئے۔

مجھے کسی بات پر ہنسی نہیں آئی، لیکن آئی تو اس بات پر کہ ان میں سے کسی نے سوچا بھی نہیں کہ جاتے جاتے اپنے کمرے کا دروازہ بھیڑ دے۔

مجھے یہ احساس ہوا کہ میری تنہائی کوئی تنہائی نہیں ہے، بس ایک اضطراب ہے، اندر اندر ایک آرزو کی شدت کو اُکساتا ہوا کہ ہائے میں بھی ان سب کے ساتھ ہو جاؤں۔

پھر ایکبار میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا تو کچھ ایسے خیال آنے لگے کہ کمرے میں اگر کوئی جماؤ ہوتا تو وہ جیسے زندگی کی ناقدری بن جاتا۔ اس میں کہیں کوئی سجاوٹ ہوتی تو جوانی جیسی عمر کی تضحیک ہوتی۔ کمرے کی فضاء میں کہیں ہلکی سی بھی سوجھ بوجھ ہوتی تو ہر سلیقۂ حیات کی کسمپرسی کا منظر بن جاتی۔ زیادہ دلکش کمرے کی اس پروقار اور مرعوب کر دینے والی بے ترتیبی میں جوانی کے بہکے ہوئے خیالات اور جذبات کا عکس تھا، ان کے سائے تھے اور لگتا تھا کہ اس کمرے کی ہر چیز ہر طرح زندہ اور بے تاب بے تاب سی ہے۔

وہ ایک خیال تھا یا جی میں دھنسنے والی ایک پھانس کہ کاش میرا کمرہ بھی اس طرح سج جائے کہ جس میں سلیقے کی فکر یا فکر کے سلیقے کا کہیں نشان نہ ملے ۔ وہ کتنی کھلی کھلی فضا ہوتی ہے جہاں نہ کوئی چھت ہی نظر آئے نہ کمرے کی دیواریں ۔ جدھر نظر اٹھے ادھر نکل جاؤ ۔

ہاسٹل میں کچھ دن تو ایسے گزرے کہ نہ دن ہی دن لگتا نہ رات رات ، نہ ذہن ہی کبھی کوئی سکون بنتا ، نہ اپنا وجود ہی کوئی واضح احساس بنتا ۔ ملنا جلنا تو جواں عمری کی عین رغبت ہوتی ہے ۔ کالج میں بھی کچھ ساتھی ملتے رہے اور ہاسٹل میں تو اب گلے لگے بیٹھے ہوئے اکثر ساتھی اپنی بے تعلقی کا ہی مذاق اڑانے لگتے ، قہقہے لگاتے اور اب تو ہر لمحہ ایک شکل اختیار کرنے والے قرب کا احساس جاں گزیں بننے لگ گیا تھا ۔ کیسے کیسے پھول کھلنے لگے تھے ، غنچے چٹکنے لگے تھے ۔

جواں عمری کا مشغلہ ، اول تو ہوتا ہی یہ ہے کہ دوسروں کے راز افشا کر دے ، وہ بھی جلد از جلد ۔ اور جب وہ عمر کسی کا راز افشا کر چکتی ہے تو ایک عجیب عالم مستی میں جھوم جھوم جاتی ہے ۔ بس کچھ ہی دنوں میں کتنے ہی اسرار حیات ، اسرار کا بازار بن گئے ۔ ہر طرف قہقہے ہی قہقہے ، موسیقیت ، ننگی باتوں میں جیسے فن کار پناو ۔ ہنگامے ہی ہنگامے ، تماشے ہی تماشے ۔ جی کھول کر ہنسو تو جان بخشی ، سنجیدہ ہو تو قابل گردن زدنی ۔

کیا بے رحمی ہے ، بے حسی ہے ، جو نہ کسی شاہ نے گدا سے نہ کسی گدا نے شاہ سے روا رکھی ہو ۔ انسیت اور ہمدردی کے اظہار کی تو جیسے چمڑی ادھیڑی جاتی ۔ دو گھڑی میں ۔ احساس ہو جاتا کہ یہ کمبخت انسان پیدا ہی ہوا ہے کچھ غلط سلط احساسات کے ساتھ ۔ بہرحال ایسی ہی بدخیالیوں میں اپنے پرانے ، قدیم یقینوں اور عقیدوں کے بخیے ادھیڑتے ادھیڑتے ، اپنے منہ کے بل لیٹے ہوئے یا چھت کو تکتے ہوئے میں نے کتنے ہی دن گزارے اور کتنی ہی راتیں گزاریں ۔

باب (۲۲)

اچھی عمر کے اچھے پھلوں کے گدرانے پن میں جو رس ہوتا ہے اس کو شاید آپ

حیات کہتے ہیں، لیکن ملتا کہاں ہے۔ بس بوند بوند کہیں مل بھی جائے تو ہوتا یہ ہے کہ زندگی کی پیاس اور شدید ہو جاتی ہے۔ اُف ری وہ تشنگی اور ہر لمحہ لگائے ہوئے محرومیوں کے چرکے۔ سارا بدن پھُنکنے لگتا ہے .... وہ اپنی جگہ شاید ایک ایسا ہی وجود تھا ..... وہ اپنی جگہ ایک سناٹا تھا جو دراصل ایک چیخ لگتا تھا، کہیں سنائی نہ دینے والی چیخ ..... اس کا نام تھا فرزی۔ نہ رنگ و روغن سے دلکش نہ جسم و جاں سے دلبر مگر کیا طوفانی عشق کیا تھا، کسی پیکرِ حسن و وفا نے اس سے، پتہ نہیں اس حادثۂ عشق سے پہلے ہی اس کے لاغر لاغر جسم کے اندر دھیرے دھیرے اسے پگھلانے والی کوئی آگ تھی یا اس کے وجود کے سارے خول کو اندر اندر روشن کرنے والی کوئی روشنی تھی، جو اس کی آنکھوں میں چمک اٹھتی تھی یا پھر ریگزاروں کی تپتی ہوئی ہوائیں تھیں۔ یا پھر اس کی نوخیز جوانی جلتے موم کی طرح دھیمے دھیمے پگھل رہی تھی اور ایک ایسی شکل میں ڈھل رہی تھی جس کی حدت ایک جنوں پسند حُسن کو عشق کی لذتوں سے سرشار کر دیتی ہے۔

لیکن اس کا وجود تو ایک بندھا ٹکا معمول سا لگتا تھا۔ وہ سب کچھ تھا اس میں جو ایک جینے کی کوشش کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ خوش خلقی، خوش مزاجی اور قہقہوں کی بلندی میں کہیں کسی غم کی سطحیت نہیں۔ کھلنڈرے پن کے سارے لوازمات موجود پھر ہاسٹل کی ساری ہڑبونگ میں آگے آگے۔ کتابوں سے دلچسپی اور علم سے عشق، فنون سے لگن۔ ایک رغبتِ شدید۔ اُف ری وہ لاپراوئی، نہ یقین امروز نہ فکرِ فردا۔ میں نے پھر بھی سوچا تھا کہ اس نے وہ عشق نہ کیا ہوتا تو اس کی حیات دروں کی وضع داری سے کون واقف ہو سکتا تھا۔ لگتا تھا وہ تو کچھ بھی نہیں ہے، لیکن اس کے اندر ایک سلسلۂ کوہکنی جاری ہے اور جذبۂ دشت نوردی گرمِ سفر ہے۔ یہ شہر اس کے لیے شہر ہے اور اس کے جذبہ دروں کے لیے صحرائے نجد۔

ایک بے باک قہقہہ لگا کر اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "پیارے یہ عشق وشق سب واہیات سی باتیں ہیں۔ اس عشق یعنی اس جذبہ کی نہ کوئی وقعت ہے نہ یہ درد کوئی درد ہے، پہلے بھی کبھی اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ وہ اگلے زمانوں کا عاشق بھی تنہا تھا، آج بھی تنہا ہے۔ یہ عشق اگر غم بھی بنتا ہے تو دنیا کے سامنے اس کے اظہار کی

ضرورت کیا ہے؟ کیوں کوئی قصّہ بنے، کوئی کہانی بنے یا کوئی تماشہ بنے۔ اگر کسی سے عشق کیا ہے تو کیا بڑا کام کیا ہے اور اس لیے تو نہیں کیا کہ دنیا سے کہتے پھرو کہ، دیکھو میں غم زدہ ہوں، غم کا مارا ہوں، اپنی حرماں نصیبی کی بات کر کے دنیا کو اپنے آپ سے کیوں دور کرتے ہو۔ یہ غم صرف تمہارا ہے، اور اس غم میں کوئی وقار نہیں، یہ تو ایک عام جذبہ ہے، پتہ پتّہ، بوٹا بوٹا، باغ میں اس راز کو جان گیا ہے۔"

یہ کہتے کہتے جیسے اس کا حلق خشک ہو گیا، ہونٹ خشک ہو گئے، اپنی زبان سے وہ ہونٹوں کو تر کرنے لگا۔ وہ مسکرا پڑا اور ذرا اپنی نظریں نیچی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ہاں، بس یہ بات ہے، یہ جذبہ ہوتا ہے ایک شرر جیسا۔ اور پھر اس کا رقص یعنی رقصِ شرر۔ اُف کیا تب و تاب ہوتی ہے اس کی، مجھے بار بار یہ خیال آتا رہتا ہے کہ خدا یہاں وہاں حسن کی ساری صفات کو ایک شکل دیدیتا ہے اس لیے نہیں کہ حسن حسن رہے بلکہ اس لیے کہ سلسلۂ عشق جاری رہے۔" بس دو ہی پل میں اچانک وہ مجھے ایک جلا ہوا پیڑ لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بجھتی سی روشنی تھی۔ میں نے بڑے ہی دھیمے لہجے میں کہا۔ "تو کہتا جا۔ کچھ اور بول نا، تیری باتیں میرے دل میں ٹھیک اس جگہ اتر رہی ہیں، جو ہمیشہ خالی رہی ہے۔"

وہ اچانک جیسے اپنے اندر سے باہر لوٹ آیا۔ بولا۔ "ارے، یہ بڑی گھسی پٹی باتیں ہیں، کرم خوردہ واقعات ہیں، جن کا برادہ ہوا میں اُڑتا رہتا ہے۔ چھوڑ۔ میں کون بڑے کردار کا آدمی ہوں؟ اور پھر یہ کردار کا تصور بھی دیمکوں کی غذا بنا ہوا ہے"

پتہ نہیں کیوں اس کے چہرے پر ایک تمسخر کا سا انداز آگیا۔ وہ بولا۔ "چل"

میں نے کہا۔ "کہاں؟"

"پیارے بڑی خواہش ہوتی ہے جی میں کہ شراب پئیں اور کوٹھے پر جائیں۔ اور وہاں حسن و شباب والی اچھی اچھی غزلیں سنیں۔ ارے لذت تو اس جذبہ میں ہوتی ہے جس کی تم جی جان سے پاسداری کرو اور بے دریغ اس کو سیراب کرو۔ اُٹھ چل۔"

اس کی اس قسم کی باتوں کے باوجود میں نے اس کے غم سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور کہا۔" میں خوب جانتا ہوں تو یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہے۔"

میری اس بات پر غضب کی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا۔ " ارے تو تو سچ مچ اپنی جگہ ایک پسماندہ قوم ہے، پوری ایک قوم ہے تو۔ Backward' دیکھ یہ غمخواری اور ہمدردی تو کسی اجڑے ہوئے تمدن کے کھنڈرات کے نام ہیں۔اب چل میرے ساتھ۔"

اس کی اس بات پر مجھے جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے ہلکا سا پسینہ آگیا۔اور خیال آیا کہ شاید میں خود اپنا ہی ایک کھنڈر ہوں۔لیکن میں نے فوراً اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مجھے سنبھل جانا چاہیے۔پھر جیسے میں نے اس دیوانے کو ہوش میں لانے کے لیے کہا۔" چل۔ کوٹھے کو جائیں گے۔ لیکن وہ، وہاں جانے کے لیے تو کچھ مال چاہیے نا"

فرزی پہلی بار بڑے ہی پر سکون انداز میں مسکرا پڑا اور بولا۔" ارے تُو تو کسی مردہ مہاجن کی روح لگتا ہے۔ بھٹکی ہوئی روح۔ ٹھیک ہے، میں بھی ایک بھٹکی ہوئی روح ہوں، مگر قارون کی روح ہوں۔چل آ میرے ساتھ"۔

مجھے اپنے ساتھ لیے اس نے بغل کے کمرے کا دروازہ کھولا۔وہ کمرہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔بڑی مدھم روشنی تھی اور کمرے کی فضاء میں ہر قسم کی خوشبو گھلی گھلی سی تھی۔اس کمرے میں دو نواب زادے رہتے تھے ان کو لینے کے لیے بڑی ہی لمبی چوڑی یا بہت ہی چھوٹی چھوٹی رنگدار کاریں آیا کرتی تھیں۔وہ دراصل آزادئی کام و دہن کے لیے ہاسٹل میں اپنے شب و روز گزارتے تھے۔ وہاں ان کے قیمتی اور موڈرن قسم کے لباس اکثر ہینگرز پر لٹکے ہوئے ہوتے تھے یا کرسیوں اور ٹیبل پر لاپروائی سے پھینکے ہوئے، اور کتابیں سوٹ کیس میں بند۔ان نواب زادوں سے ملنے کے لیے اکثر سرمئی شاموں کو کچھ تراشیدہ زلفوں اور نئی نئی تراش خراش کے لبادوں والی اور بے وجہہ چخ چخ کرنے والی جوان جوان سی چڑیاں آتی تھیں جو زیادہ تر ٹوٹی فروٹی اور آئس کون جیسی تہذیبوں میں پلی ہوئی لگتی تھیں، وہ

دونوں نواب زادے فخر اور بدر بھی خوبرو نوجوان تھے اور ان کی آنکھوں کے جو رنگ تھے وہ ان کی نظر کی امارت لگتے تھے۔ بڑے دل والے، ہنس مکھ، بے تعلق بے تعلق اور بے ضرر سے لگتے تھے۔ زیادہ تو وہ باہر ہی رہتے تھے اور ہاسٹل کو جیسے ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ غائب تھے۔

فرزی نے وہاں ایک قیمتی سوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "دیکھ اس سوٹ کا رنگ شام کے لیے کتنا سوزوں لگتا ہے۔ پتہ نہیں اس سالے فخر کی روح گندی ہے یا اچھی۔ مگر اس کا جسم بالکل میرے جسم ایسا ہے لاغر لاغر ہے نا؟ میں یہ سوٹ پہن لیتا ہوں۔ اور وہ دوسرا سوٹ جو پلنگ پر پڑا ہوا ہے نا، وہ بھی تازہ بہ تازہ لگتا ہے، تیرے سارے جسم کو اس طرح ڈھانک لے گا کہ تیرے جسم کے سارے ضروری حصے بڑی خوبصورتی سے نمایاں ہو جائیں گے۔ واہ کیا سوٹیڈ بوٹڈ شام رہیگی۔ امریکن کٹ سوٹ پہن کر جب ٹھاٹھ سے ہم کوٹھے پر پہونچیں گے نا تو وہ کھوٹھے والی گھبرا جائے گی اور سمجھے گی یہ تو کوئی انگریزی غزل سننے آئے ہیں۔ چل چل تیار ہو جا۔"

میرے اندر سے ایک مری ہوئی آواز آئی۔ "یہ تو چوری ہے"۔ لیکن فرزی نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور ذرا اونچے لہجے میں بولا۔ "اب جلدی سے پہن لے۔ اور بھاگ چل۔ ورنہ وہ دونوں نواب زادے آگئے تو ہم دونوں کو مادر زاد ننگا کر دیں گے اور جب ہم کوٹھے پر جائیں گے تو کوٹھے والی کہے گی "ارے، یہ تو اصلی سوداگر ہیں وہ زور سے ہنسنے لگا۔ پھر کچھ ہی دیر میں ہم دونوں بالکل ٹائیٹ فٹ بڑے ہی رنگ رنگے بادلوں میں ملفوف ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا احساس بڑا ہی مخملیں ہو گیا ہے اور میرا احساس بڑا ہی قیمتی بھی ہے۔ میں نے فرزی سے کہا۔

"یار انسان تو دشت و صحرا میں بستی و شہر میں لاکھوں کروڑوں بستے ہیں لیکن اصلی انسان تو اچھے کپڑوں میں بستا ہے۔ لگتا ہے آج پہلی بار ہم اصلی انسان بنے ہیں۔"

"میں پہلے بھی بن چکا ہوں" فرزی نے فوراً کہا۔ تیرے آنے سے پہلے ایک بار بڑے ہی مزے کی بات ہوئی۔ ہائے کیا پرلطف حادثہ تھا۔ کالج میں اس دن MOCK U.N.O سیشن ہوا تھا جس میں مجھے امریکہ کے نمائندے کی حیثیت سے

شریک ہونا تھا اور اس نواب زادے فخر کو روس کے نمائندے کی حیثیت سے۔ دوسرا نواب زادہ بدر بھی شاید کسی ملک کا نمائندہ تھا۔ لیکن میرا مقابلہ فخر سے تھا اور سب سے زیادہ مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک ہیلن تھی کالج میں، بلکہ ہیلن آف ٹروئے، اور اس کے لیے ان دنوں باضابطہ جنگ ہو رہی تھی۔ وہ تھی بھی بڑے ہی اونچے گھرانے کی۔ بڑی ہی لمبی چوڑی کار میں آتی تھی اور اپنی کار سے زیادہ جگمگاتی تھی اور اپنی امریکن کار سے زیادہ امریکن لگتی تھی۔ مر رہے تھے حرامزادے سب کے سب اس پر۔ لیکن مجھے بار بار اور کئی زاویوں سے اس نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا تھا کہ مجھے ایک عجیب یقین سا ہو گیا تھا کہ وہ جو بڑی ہی خوبصورتی سے کٹے ہوئے لونیک Low Neck والے بلوز سے ابھرتے ہوئے سینے کے بیچ ایک مہین سی لکیر ہوتی ہے ناوہاں اس نے مجھے بسا لیا ہے۔ بس ایسا لگتا تھا، یقین سا ہوتا تھا۔ اور وہیں جا کر میرا وجود ٹھہر جاتا تھا۔ یار پتہ نہیں کیوں ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نہیں، کئی بھوکے پیاسے مجنوؤں کی روحیں ہیں میرے اندر۔ کیا شہزادہ بن کر گیا تھا میں اس کالج فنکشن میں اس دن۔ سب سے زیادہ قیمتی اور دلفریب لباس میرا تھا۔ نرم گرم، کرارا اور اس لباس کے احساس کے ساتھ امریکن نمائندہ ہونے کی حیثیت سے میرا کروفر۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا، سب مجھے دیکھ رہے تھے اور میں کسی کی طرف نظر نہیں اٹھاتا تھا۔ یار اس ملک کی خوش حالی اور اس کے تکبر کی نمائندگی نے مجھے بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ لگتا تھا میرے لباس ہی میں نہیں بلکہ میرے اندر بھی میرا اپنا کچھ بھی نہیں تھا اور تھا بھی تو بالکل بے معنی سا۔ خیر بات تو پر لطف یہ تھی کہ فنکشن شروع ہو گیا لیکن وہ نواب زادہ فخر، یعنی روس کا نمائندہ نہیں آیا۔ میں اپنے دل ہی دل میں کئی اندیشوں کا شکار ہونے لگا۔ اندر کھُد بُد بھی ہونے لگی اور ہلکی سی گھبراہٹ بھی، ویسے فخر کے آنے میں جتنی دیر ہو رہی تھی میں خوش ہو رہا تھا، یہ سوچ کر کہ فنکشن بس یونہی ختم ہو جائے گا اور میں اپنی ساری تمکنت کے ساتھ محفوظ و مامون واپس ہاسٹل چلا جاؤں گا۔ لیکن دو گھڑی بعد سب کچھ بھول بیٹھا۔ وہ جو ہیلن تھی نا ہیلن۔ اُف اس دن وہ نیلے نیلے پپوٹوں اور جگمگاتی پلکوں والی آنکھوں کے ساتھ آئی تھی اور پھر ان آنکھوں کے سرخ ڈورے پناہ اللہ کی۔ اس نے کچھ اس شدتِ احساس کے ساتھ ان لال ڈوروں

والی آنکھوں سے مجھے دیکھا کہ اس کے پپوٹوں پر جو نیلا نیلا زہر تھا وہ میری نس نس میں اترنے لگا۔ اس نے تقریر کی۔ وہ اس دن بڑی ہی زرق برق لگ رہی تھی۔ نظروں میں سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ میں نے بھی تقریر کی جس میں گونج تھی، تاریخ کی سفاکی کی، فلسفے کی بے معنویت کی، سیاست کی، جس کی گردن پر ہر انسان کا خون ہوتا ہے۔ میں شاید پورے جوش و خروش کے ساتھ امنِ عالم کے لیے ایک آخری جنگ لڑنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اب میری آواز اور میرے خیالات مجھے آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑائے جا رہے تھے کہ اچانک یہ کیا ہو گیا؟ ...... میرے سامنے جنگ کا بھیانک دیو مُتشکّل ہو گیا۔ اُف وہ منظر۔ وہ نواب زادہ فخر اچانک ہال میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی، وہ بھی ننگی تلوار اور اس کی آنکھوں یا چہرے ہی سے نہیں بلکہ اس کے سارے وجود سے آگ کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ وہ یو این۔ او (U.N.O.) کے صدر سے مخاطب ہوتے ہوئے گرجا۔

"جناب صدر، اس امریکن نمائندے کو ذرا باہر بھیجیے"۔ ہال میں سب لوگ دنگ اور صدر جو تاریخ کے پروفیسر تھے، چونک پڑے اور فخر سے مخاطب ہو کر بولے "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

فخر نے تلوار اٹھائی اور کہا۔ "امن عالم کے لیے مجھے امریکہ سے ایک قطعی جنگ کرنی ہے۔ اس امریکن کو باہر بھیجیے۔"

پروفیسر نے ذرا زور سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"اس لیے کہ اپنے ملک کی طرح یہ بھی بہروپیہ ہے۔ دس بہروپ بدلتا ہے، پہلے کبھی آپ نے اس کو ایسے زرق برق روپ میں دیکھا ہے ..... ؟ کچھ جانتے ہیں آپ؟

پروفیسر نے کہا۔ "کیا؟"

فخر نے کہا۔ "دیکھیے! آج سر بازار میں اس کو ننگا کر دوں گا۔ ننگا۔ ہاں" یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف آگے بڑھا۔ تو مجھے واقعی محسوس ہوا کہ میں ننگا ہو گیا ہوں۔ اُف! اس نے گرج کر کہا۔ "یہ شخص جو امریکی نمائندہ ہے نا، مکار ہے، دھوکے باز ہے، چور اُچکّا ہے، قزاق ہے قزاق۔"

پروفیسر نے کچھ غصے میں کہا۔ "کیا بکتے ہو؟"

فخر بھی گرجا۔ "آپ جانتے نہیں، یہ خوبصورت لباس، جو یہ شخص پہنا ہوا ہے، وہ اس کا نہیں میرا ہے۔ میرا۔ آج کے فنکشن کے لیے کل ہی میں درزی سے لے آیا تھا اور صبح ہی صبح استری کرواکر ہنگر پر لٹکایا تھا۔ جب میں باتھ روم سے نکلا تو میرا سوٹ غائب تھا۔ یہ ننگا شخص میرا سوٹ پہن کر یہاں اکڑ بتا رہا ہے۔ کر دو اس کو ننگا۔"

میں نے واقعی سب کے سامنے اپنے آپ کو ننگا محسوس کیا۔ مادر زاد، کیونکہ وہ سوٹ تھا تو اس کا، لیکن میں پہنا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ وہ تُلا ہوا تھا کہ مجھے ننگا کر دے، میں بھی ننگے پن پر اتر آیا۔ میں نے چیخ کر کہا "یہ روس کا نمائندہ جھوٹ کہتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔"

تب فخر نے واقعی تلوار اٹھائی اور کہا۔ "دیکھ ایک سوٹ کی خاطر تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

تو ہال میں سب کہنے لگے۔ ٹھہرو ٹھہرو، امن عالم خطرے میں ہے۔"

میں نے بلند آواز میں کہا۔ "اس کی ذمہ داری روس پر ہے۔"

فخر چیخ پڑا "نہیں۔ بھائیو، اس سے پوچھیے کہ وہ سوٹ میرا ہے یا نہیں۔"

تو سب نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا جواب ہے تمہارا۔ سچ سچ بتادو"

میں نے کچھ سنبھل کر جواب دیا۔ "ہاں یہ سچ ہے، یہ سوٹ اسی کا ہے، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ سوٹ اس سے زیادہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ بتایئے یہ بات سچ ہے یا نہیں؟ اور کچھ اس جوشیلے انداز میں میں نے یہ سوال کیا کہ جواب کے لیے اچانک میری نظر ہیلن کی طرف اٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بجلی کی طرح چمک گئیں اور اس نے سر جھکا لیا۔

میں واقعی ڈھیر ہو گیا۔ سارے ہال میں ہر طرف قہقہے گونج رہے تھے۔ تالیاں بج رہی تھیں جیسے ایک بہت ہی دلچسپ ڈرامہ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ میں ندامت سے اندر ہی اندر پاش پاش ہو گیا۔ اسٹیج سے کود کر ایک طرف کو جانے لگا تو سب کے سب ہنس رہے تھے۔ میں نے سوچا اب اس جانِ جہاں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ لیکن ہائے رے عشق کی بھول بھلیاں۔ دوسرے دن سنا کہ ہیلن کو جب یقین ہو گیا تھا کہ میں نے اس دن وہ سوٹ چرا کر پہنا تھا تو اپنی ساتھی لڑکیوں میں میری اس بات کا ذکر

کر کر کے ہنسی سے نڈھال ہو گئی تھی اور ہزار جان سے مجھ پر فدا ہو گئی تھی، میں تو اس کے بعد شہزادہ گلفام بنا پھرتا تھا۔

دیکھ اس دن کے بعد آج پھر ضرورت پڑ گئی تو تجھے بھی ساتھ لے آیا۔ بڑے مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ جو سوٹ تو نے آج پہنا ہے نا وہ وہی سوٹ ہے جو اس دن میں نے پہنا تھا۔ وہ زور سے ہنسا۔ اس کا قہقہہ ایسا چمک اٹھا جیسے اس نواب زادے کی ننگی تلوار اب میری طرف لہرا گئی ہے۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔

فرزی کی ہنسی کچھ اس قدر پسند تھی مجھے خصوصاً اس کا قہقہہ۔ کچھ اتنا کھلا، صاف جیسے اس کے بدن کے سارے حصوں سے ایک لذت سمیٹ کر نکل پڑا ہو۔ کم از کم میں نے اتنا پر لذت قہقہہ پہلے کہیں نہیں سنا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ہنس وہ رہا ہے اور میرا سارا وجود کھکھلا اٹھا ہے۔

کچھ ہی دنوں میں وہ کچھ اس تیزی سے مجھ سے قریب ہو گیا تھا لگتا تھا جیسے اس کی ساری پچھلی زندگی میں نے گزاری ہے اور میری ساری اگلی زندگی وہ گزارنے والا ہے

پتہ نہیں اس کا وہ الم نصیب عشق اس کے سینے میں کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا تھا، ایک سیاہ داغ بن کر۔ بالکل اندھیرے جیسا۔ اور اس اندھیرے سے کتنی روشن کرنیں پھوٹتی تھیں، اس کی ہنسی بن کر، قہقہہ بن کر۔ لیکن وہ لہو جس کی حدّت و لذت کا نام شباب ہے، وہ شباب جس کا کوئی جسم نہیں ہوتا، جو صرف ایک شکل ہوتا ہے، مچلتی ہوئی روشنیوں سے بنا ہوا، اضطراب سے آگے نکل جاتی والی خوشیوں سے بنا ہوا جو احساس کی مستیوں کو افق تا افق یونہی پھیلا دیتا ہے، وہ شباب اس کے سارے وجود کو ایک پر فریب قہقہہ بنائے ہوئے تھا۔

فرزی نے ایک بھرپور نظر مجھ پر اور میرے سوٹ پر ڈالی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے کوٹ کے کالر پکڑ لیے اور آنکھ مار کر بولا۔

" وہ کوٹھے والی تجھے آج اپنے پکھوے میں دبوچ لے گی اور پھر کبھی نہیں چھوڑے گی۔ بڑا ہی سچا پیار کرتی ہیں یہ کوٹھے والیاں۔ تو مرا۔"

" میرے مرنے سے پہلے، میں تجھے وہیں کہیں دفن کر دوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ فوراً بول پڑا۔ "میرا مزار تو کہیں بن چکا ہے۔" اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کو پوری طرح محسوس کر سکتا، اس نے کہا۔ "اچھا بتا، کچھ نقدی ہے تیرے پاس؟"

میں نے کہا۔ "میرے پاس؟ ہاں، ٹھہرو۔ کالج کی فیس کے ۱۲ روپیے ہیں۔"

وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "بارہ روپیے!! اتنے سارے پیسے۔! ابے تو نے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا۔ اب تک تو دو چار غزلیں سن لیتے کوٹھے پر۔"

میں نے کہا۔ "۱۲ روپیے کافی ہیں؟"

"بالکل۔" اس نے کہا۔ "ارے ہم طالب علموں کو وہاں بھی تو کنسیشن Concession ملے گا۔ دراصل ہم جیسوں کو تو کالج کی طرف سے کوٹھے کا پاس ملنا چاہیے۔" پھر وہ ہنسا۔ اس کی بات پر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اس نے کہا۔ "دیکھ سن۔ تیرے پاس ۱۲، میرے پاس ہیں ۷، ہوئے نا اُنیس۔ ہم تو اس لحاظ سے وقت کے امیر ہیں امیر۔ لیکن ایک کام کرتے ہیں۔ رئیسوں کی طرح جانا چاہیے، کوٹھے پر .... بھئی یہ بھی کیا بات ہوئی کہ انڈا خریدنا ہے، اور ۱۲ پیسے جیب میں ہیں، اور سمجھا انڈا خرید لیا۔ ہر جگہ ایک ہی ریٹ کا ہلکا پن نہیں چلتا، پیارے قارون۔ چل وہ کمرہ نمبر ۱۲ ہے نا، اس میں ایک رئیس زادہ رہتا ہے۔ اس کی رئیسی ساتھ لے کر جائیں گے۔"

وہ تیزی سے ادھر چل پڑا۔

باب (۲۳)

ہم دونوں اس رئیس زادے کے پاس پہونچ گئے۔ کمرے کا دروازہ نیم وا تھا، لیکن اس پر کچھ اس قدر پرکشش اور قیمتی پردہ لٹک رہا تھا کہ لگتا تھا کہ اس پردے کو یونہی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ بڑا ہی دبیز تھا اور ایک بڑا ہی شائستہ انداز اور ایک تکبر لیے ہوئے تھا، لیکن عجیب بات یہ تھی اس وقت اس پر تازہ تازہ پھولوں کی لڑیاں بھی لٹکی ہوئی تھیں اور وہاں کچھ دلچسپ اسرار لی ہوئی ایک خوشبو تھی۔ ایسی خوشبو جو کمیاب ہی ہوتی ہے، خصوصاً ایسی جگہ پائی جانے والی جہاں بے وجہ اپنی رسائی مشکل معلوم ہوتی ہے، جیسے کسی حسن مغرور کی کمین گاہ ہو۔ اس لیے کہ ان پھولوں کی لڑیوں کی جو

خوشبو تھی اس میں ایک اور بھی خوشبو گھلی ملی لگتی تھی جو ذرا مہنگے داموں ہی خریدی جاسکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی بات ہو گی یا پھر اس رئیس زادے کے کمرے میں جانے سے پہلے میرے احساسات میں کچھ ایسی خوشبو پیدا ہو گئی تھی۔ وہ پردہ، اس کے رنگ، اس پر پھولوں کی لڑیاں دراصل وہ پورا دروازہ ہی مجھے بڑا گھمنڈی لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ فرزی کو پیچھے کھینچ لوں اور وہاں سے چل دوں۔ لیکن پردہ ہلا تو سامنے ایک خوش پوش نوجوان پھولوں کی خوشبو جیسی پراسرار مسکراہٹ لیے ہم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا لباس بھی ان پھولوں جیسا سفید تھا۔ فرزی اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نوجوان نے جس کا نام ہی رئیس تھا، اسی مسکراہٹ کے ساتھ فرزی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولا " تم دونوں بہت وقت پر آئے، بس اتنا یاد رکھو، تم دلہا والے ہو۔"

" دلہا والے !! " فرزی چونک کر میری طرف پلٹا۔ تب رئیس نے اس کی بانہہ دبائی۔ اور کچھ رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔" بس گھڑی بھر کی بات ہے۔ آجاؤ نا اندر۔ تم سب سمجھ جاؤ گے۔"

فرزی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور مجھے اندر کھینچنے لگا۔ ہم دونوں اس کمرے میں کیا داخل ہوئے، ایک شہر طلسمات دیکھا وہاں۔ ہاسٹل کا ایک کمرہ اور ایسا ؟۔ سفید چاندنیوں کا فرش۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے، دو رنگوں میں رنگی ہوئی روشنی اور ہر طرف پھول۔ کمرے کے ایک کونے میں سجی سجائی مسہری، مخملی بیڈ کور Bed Cover اور تکیے، پھر پھول کی سیج۔ روشنی کے رنگوں میں لٹکا ہوا مچھردان اور اس پر پھولوں کی لڑیاں۔ ان پھولوں کی لڑیوں میں لٹکتا ہوا ایک بہت ہی خوش رنگ لائٹ سوئچ، جس کو دبا کر کمرے کے رنگ بدلے جاسکتے تھے اور پھر روشنیوں میں بھی ہلکی ہلکی خوشبو۔ چاندنی کے فرش پر ایک طرف بڑے ہی سلیقے سے سجائی ہوئی سرخ سرخ مسند اور انسانی تاریخ کا ایک عجوبہ یہ کہ اس مسند سے قریب بیٹھا ہوا، زندگی میں پہلی بار سنجیدہ نظر آنے والا رفیع !! اس کی خاموش آنکھیں اس وقت آبائی متانت اور شرافت کا ثبوت بنی ہوئیں۔

رئیس نے ہم دونوں کو وہیں مسند کے قریب بیٹھنے کو کہا۔ جب ہم وہاں بیٹھنے پر کچھ ہچکچائے تو رئیس نے باضابطہ ہم سے التجا کی، سرگوشی میں " بس میرے لیے

دو منٹ بیٹھ جاؤ۔"

فرزی نے اس کی التجا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے کان میں کہا۔

"ہم کو بہت جلدی ہے، ہم کہیں اور جا رہے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ کچھ دیر ٹھہر جاؤ یار۔" رئیس نے کہا۔

"کس لیے۔"

"میں ابھی بتاتا ہوں۔ بس دو گھڑی۔"

فرزی نے اس پراسرار فضا میں جیسے کچھ سونگھ لیا۔ بولا۔

"نہیں یار رئیس بڑی مشکل ہے۔ اگر تم کو اس وقت ہماری ضرورت ہی ہے تو ایک کام کرنا پڑے گا۔"

"بولو"

"تم کو ہمارا وقت خریدنا پڑے گا۔"

"ریٹ؟"

"ایک روپیہ، ایک منٹ۔"

اس نے جلدی سے کہا۔ "منظور۔" اور مسکرا پڑا۔ وہ بہت خوش تھا۔ "دیکھو، یہ سالہ رفیع ہے نا وہ آج قاضی ہے قاضی۔ اور قفصات کے پچاس روپیے لے رہا ہے۔"

"قاضی؟ قفصّات؟۔" میرے ساتھ فرزی کا بھی سر چکرا گیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ رفیع اب بھی بالکل خاموش اور سنجیدہ بنا اس مسند پر بکھری ہوئی کلیوں کو دیکھ رہا تھا جیسے ہم میں سے کسی سے وہ واقف تک نہیں تھا۔ مسکراتا تک نہ تھا۔ اس کا سارا وجود پراسرار لگ رہا تھا۔

اچانک اس پردے میں جو مسند کے پیچھے ڈریسنگ کے لیے لگایا گیا تھا، ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔ رئیس فوراً سنبھل گیا۔ اس پردے کے پیچھے سے ایک ماہ لقا نمودار ہوئی، دلہنوں جیسا زرق برق لباس پہنے۔ گہنوں کی چمک۔ چوڑیوں کی ہلکی ہلکی چھنک۔ جھکی جھکی پلکیں، کچھ کچھ کھلی ہوئیں۔ جسم تو جسم، اس کے سارے لباس کو شرم و حیا کا احساس جکڑے ہوئے تھا۔ لیکن ایکبار اس نے پلکوں کو تھوڑا اٹھا کر جو کمرے کا جائزہ لینا چاہا تو مجھے ایسا لگا یہ تو کوئی جنگل کی ہرنی ہے۔ چونکی ہوئی، بس ذرا

سی آہٹ ہوئی اور وہ غائب ۔اس کے دلہن پن اور چہرے کی ملاحت کے باوجود، اس کے حجاب میں وہ غیر ضروری شائستگی نہیں تھی جو عام دلہنوں کے لیے ایک بوجھ سا بن جاتی ہے ۔اس کو دیکھتے ہی پتہ نہیں کیوں میں نے اور فرزی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ہماری آنکھوں میں حیرت تو بے حساب تھی لیکن جلن زیادہ محسوس ہو رہی تھی اس ہرنی کی آنکھیں ماحول سے جتنی باخبر لگ رہی تھیں، اتنی ہی اپنے آپ سے بے خبر۔ ایسا بھی لگتا تھا کہ اس کے لیے اس کا وہ لباس بھی کچھ اجنبی سا ہے، اور وہ اس لباس سے بھی خائف خائف سی ہے ۔جیسے اس لباس میں اس کو کوئی آسودگی محسوس نہیں ہو رہی ہے ۔پھر بھی گھونگھٹ کھینچ کر وہ مسند پر بیٹھ گئی ۔اب کچھ اس کی فطری شرم و حیا نے اس کا ساتھ دیا۔وہاں اس کی کوئی ہم جنس نہیں تھی ۔لیکن لگتا تھا، ان ساری باتوں کا اس کو علم تھا کہ وہ اس کی اپنی زندگی کے ایک اہم ترین لمحے پر بالکل تنہا رہے گی اور آنے والی زندگی کا اس کے پاس ایک بڑا ہی معتبر اور رنگا رنگ تصور ہے، جس نے اس میں یہ ساری ہمت پیدا کر دی ہے اور وہ پوری طرح تیار ہے ان حیران کن اور کبھی سمجھ میں نہ آنے والے لمحات میں ہنسی خوشی بس جانے کے لیے ۔وہ سنبھل کر مسند پر بیٹھ گئی ۔

اُف رے وہ وقت کے تیور ۔! یا تو رفیع نے وقت کو یا وقت نے رفیع کو کچھ اس طرح بدل کر رکھ دیا تھا کہ اس وقت میں یہی دیکھ رہا تھا کہ ابھی ابھی ایک بزرگ، اپنی سفید ریش کے ساتھ سبز سبز چغہ پہنے منبر سے اترے ہیں اور اپنی سال خوردہ آنکھوں میں بے پناہ شفقت لیے چاروں طرف دیکھا ہے اور دنیا پر نظر پڑتے ہی مسکرا اپڑے ہیں ۔شفقت و حلاوت کے ساتھ ۔مجھے تو اس وقت رفیع دراصل سرتاپا ایک ریش باجمال نظر آرہا تھا۔کس احساس نیکوکاری کے ساتھ، کس کمال تقدس کے ساتھ اس نے دلہن کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دیں زندگی کی مسرتوں اور خوشیوں کی اور تقدس بھری پلکوں سے رئیس کو دلہن سے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔رئیس کے چہرے کی سادگی اور مسکینی کچھ ایسی تھی جیسے اس سے زیادہ معصوم اور اپنے بزرگوں کا فرمانبردار سپوت کہیں شاید ہی ہو۔قریب ہی ایک طشت میں رکھے پھولوں کے ہار رفیع نے اٹھائے اور دلہا دلہن کو پہنائے ۔پھر اپنی جیب سے اس نے ایک دستاویز نما

کاغذ نکالا۔ اس پر دلہا دلہن کے دستخط لیے اور ہم سے نظر ملائے بنا وہ کاغذ ہماری طرف سرکا دیا۔ تب بڑی ہی دھیمی آواز میں رئیس نے ہم سے کہا۔

"آپ دونوں ہماری شادی کے گواہ ہیں، دستخط کر دیجیے۔" فرزی کے حلق تک کوئی چیز آئی، وہاں گھڑی بھر اٹکی رہی اور پھر واپس نیچے اتر گئی۔ ساتھ ہی اس کی پھیلی پھیلی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ہم دونوں نے اس کاغذ پر دستخط کر دیے۔

میں نے دیکھا دلہن اپنے لباس میں پہلی بار کچھ سنبھل گئی ہے۔ رئیس سے پہلے اس کو یقین ہو گیا کہ اس کا عقد ہو گیا۔ شادی ہو گئی۔

رئیس سب سے پہلے اٹھ کر بڑے ہی مودبانہ انداز میں رفیع کے سامنے جھک گیا اور آداب بجالایا۔ رفیع نے اسی متانت اور پیرانا وجاہت کے ساتھ رئیس کے سر پر ہاتھ رکھا تو دلہن بھی آداب بجالائی، رفیع جب اس حسینہ کے سر پر ہاتھ رکھ رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ہلکا سا رعشہ تھا۔ اس لیے کہ دلہن کے کھلے کھلے چہرے کی تب و تاب کو اور اس کے پر شباب بدن کے شعلوں کو وہ اپنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ ویسے بھی اس کی آنکھوں کی سرخی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑی دیر سے نارِ نمرود میں جھلس رہا ہے اور اب وہاں ٹھہرنے کی اس میں تاب نہیں ہے وہ اٹھ کر سیدھے دروازے کی طرف چل دیا تو رئیس بھی اس کے ساتھ ہو لیا تاکہ بزرگِ وقت کو ادب و آداب کے ساتھ رخصت کرے۔ ان دونوں کے پیچھے، مجھے اور فرزی کو لپکنا پڑا اس لیے کہ دلہن کی ہرنی جیسی آنکھیں ہم دونوں کو دیکھ کر کچھ پریشان نظر آئیں۔ کمرے سے ہم جو باہر پہونچے تو منظر ایسا تھا۔

رفیع اپنا سینہ تانے رئیس کے سامنے کھڑا تھا اور بول رہا تھا۔

"چل نکال جلدی"

"کیا؟" رئیس نے پوچھا۔

"کیا؟ ہم سے یہ بات، بول دوں سب کچھ اندر جا کر؟"

"نہیں، نہیں۔ ذرا ٹھہر۔"

"اب ایک منٹ نہیں ٹھہروں گا۔ پورے پچاس۔"

"اچھا" کہہ کر رئیس نے پورے پچاس روپیے رفیع کو دیے۔ پیچھے ہم دونوں

کھڑے تھے، فرزی نے رفیع سے کہا۔"چچا جان، ہم آپ کے ساتھ چل رہے ہیں۔"

رفیع نے ایک قہر بھری نظر ہم پر ڈالی اور بولا۔"میں کسی حرامزادے کا چچا نہیں ہوں۔" اور تیزی سے ہاسٹل کے باہر چل دیا۔

رئیس نے ہم دونوں کو اپنے گلے لگالیا اس طرح جیسے اس کا نہیں ہمارا نکاح ہوا ہے۔ہم دونوں کو بھی بڑی عجلت تھی۔ گو کہ ابھی ابھی ہم جس مرحلے سے گزر کر باہر نکلے تھے۔وہ ایک سوال بن کر ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ محفل عقد کیا تھی، دلہن کیا تھی، دلہا کیا اور قاضی کیا تھا اور گواہ کیا تھے۔ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے شاید رئیس خود بیتاب تھا۔بڑی ہی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ، اپنے جاگیردارانہ لہجے میں بولا۔"ہے ناوقت کی حسینہ، ہمارے گاؤں کی ہے، ہماری جاگیر کی۔بڑی تیکھی ہے مزاج کی۔بڑی مشکل سے ہاتھ لگی ہے، بس اس شرط پر کہ پہلے اس سے نکاح کرنا ہوگا۔" اس نے کچھ اور کھلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔"اس کو مجھ پر پورا بھروسہ ہے۔ سمجھ گئی ہے کہ اب زندگی بھر میری بیوی بن کر رہے گی۔ ہے نا یار چیز! کیسی قاتل لگ رہی ہے عروسی لباس میں۔! یہ سارے ڈریس اپنی بہنوں اور بھابیوں سے مانگ کر لائے ہیں میں نے۔دیکھو کیسے سج رہے ہیں اس کے بدن پر واہ! تین دن کے وعدے پر لے آیا ہوں وہ سارے ڈریس۔تین دن رکھوں گا اس الھڑ جوانی کو اپنے پاس۔ پھر آزاد کردوں گا۔گاؤں میں وہ دوسری شادی کرلے گی۔ تھوڑا رولے گی، اپنا سر پیٹ لے گی۔ چھوڑو۔ مگر یار جوئے شیر لانے سے کم نہیں عیاشی کرنا بڑے جوکھم ہیں زندگی میں۔کیا ظلم ہے ہم پر دنیا کا، مرضی سے جینے بھی نہیں دیتی ...."

رئیس شاید اور کچھ کہتا لیکن اس کمرے سے نکلتی ہوئی سلگتی خوشبو اور اس دلہن کے رس دار جسم کا تصور اذنِ آوارگی دے رہا تھا۔اس سے پہلے کہ ہم رئیس کو اس کا ہم سے کیا ہوا معاہدہ یاد دلاتے اس نے جلدی سے ہمارے ہاتھ میں تیس روپیے رکھ دیے اس طرح کہ وہ معاہدے کی رقم نہیں بلکہ ہمارے وہاں سے جلد سے جلد دفع ہوجانے کی لاگت دے رہا ہو۔ان تیس روپیوں کو دیکھ کر ہم دونوں کی آنکھوں میں روشنی سی آگئی اور اس روشنی میں ہم نے صاف صاف دیکھا۔

باب (۲۴)

ایک طلسم ہوشربا۔ محفل رقص وسرود، منظر جام وسبو، اُف! وہ رنگ ہائے بہار۔ رات بھی پھولوں میں بسی۔ ہائے وہ شب کا تابندہ لہو۔ درس نظر، عشوہ و ناز و ادا۔ رات کچھ عریاں عریاں۔ ہوش لپٹے ہوئے اس در کے گداگر سائے۔ میں نے پہلی بار ایک جہان ترغیبات لحن ولحم میں قدم رکھا تھا۔ گو فرزی میرے ساتھ تھا، لیکن میرے ہوش مجھ سے سرگوشی کر رہے تھے، ہم یہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ یہ سرحد سرخوشی و بد مستی ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ حقیر سے ہوش وحواس میرے سامنے گڑگڑانے لگے ہیں تو مجھ میں ایک عجیب احساس تکبر پیدا ہو گیا۔ یہ کس کی اقلیم ہے، دشمن ہوش، جو ایک احساس خودسری سے نوازتی ہے۔ اس محل سرا کے پہلے ہی زینے پر جب میں نے قدم رکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں دراصل میں نہیں ہوں، میں تو کوئی مغل شہزادہ ہوں اور وہاں میں کتنے ہی غلاموں کو شرف خدمت بخش رہا ہوں۔

یہ اس ماہ لقا کا دربار ہے، جس کی روشنیوں میں وہ اسرار ہیں جن میں چھپ جانے کی خواہش ہر دل کے نہجوں پیچ ہوتی ہے۔ وہ ایک نقطہ جو مرکز احساس نشاط ہوتا ہے۔ وہ درودیوار، وہ رنگ ہائے فسوں۔ کس قدر تازہ تازہ تھی وہ روح شباب! کیسی لچک دار تھی وہ ہری ہری ڈالی پھولوں سے لدی ہوئی! میں کتنا پیاسا ہوں۔! تشنگی سے سرتاپا ایک کانٹا بنا ہوا۔

اور فرزی! اس وقت اس کی آنکھوں میں دور تک چلی جانے والی ایک رہگزر تھی جس سے ہو کر شاید ابھی ابھی ایک آندھی چلی گئی تھی اور اب اس لمحے وہاں کچھ ہلکی ہلکی ہوائیں تھیں اور موہوم سی گرد سفر۔ اس رہ گزر سے ہوتے ہوئے ٹھیک اس کے وجود تک کسی کے آجانے کی ایک وحشت زدہ آس تھی۔ اس احساس کا کیا نام دیں اور اس کیفیت جنوں کو کون سمجھے۔

ایسے میں ایک گھڑی کے لیے پتہ نہیں کیوں مجھے کچھ ہوش سا آگیا۔ اور میں نے اپنے آپ کو دیکھا، فرزی کو دیکھا۔ دو برگ ہائے خشک، طوفانوں کی زد میں۔ کیا کچھ تھا، ہمارے اندر۔ اچانک ایک خوشگوار سا جھونکا آیا اور ان برگ ہائے خشک کو

اُڑا لے گیا۔ پھر اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

وہ کافر ادا محوِ رقص ہو گئی تھی۔ فضا میں ساز کے میٹھے سُر تھے۔ رقص کی چھنا چھن تھی۔ ان سروں میں اس چھنا چھن میں جانے کیسے پھولوں کی خوشبو تھی، اس کے لباس کی جگمگاہٹ میں اس کے نو خیز بدن کی تراش اور اس کے قوس، عیاں عیاں اور نہاں نہاں تھے۔ نظروں کی چشمکوں میں طبلے کی تھاپ اور تال، میرے وجود کو اس سارے ماحول میں اِدھر ادھر بکھیر رہی تھی۔ اُف ری، ان مدہوشیوں کی گہرائیاں۔ ان کی تہہ میں لاشعوری، بے شعوری، پھر کہیں ایک رنگِ شعور۔ جانے یہ کیا نظامِ فطرت ہے۔ کیسی تنظیم عناصر ہے کہ ایک طوفان میں بھی ضبط ہے، ترتیب ہے، نظم ہے۔ کہ ان گہرائیوں میں بھی ایک شعاعِ سرخ میری نظر کو چونکا گئی۔ سہی۔؟ یہ سہوِ ضمیر بھی عین فطرت ہے۔ یہ تسکین بھی ہے اور ایک مہمیز بھی۔ لیکن عنصر شہزور تو حسن نشاط و سرور ہے۔ میرے اندر ایک سرگوشی سی ہوئی۔ ارے "چھوڑو وہ پرانی بات۔" تو گرمیِ خون عود آئی۔ میری نظروں میں صرف رنگ و نور تھے۔ میٹھے سُر ہی سُر تھے۔ اور وہ کافر ادا اب ٹھیک اس شکل میں ڈھل گئی تھی، جو میرے تصور میں تھی اب میں اس کے تھرکتے بدن کا ہر لمس محسوس کر رہا تھا جو ہلکی ہلکی عریانیوں کی دین ہوتا ہے۔

اب میرے سامنے بھی ساغر شراب تھا۔ فرزی کو دیکھا تو اس کے جام سے زیادہ اس کی آنکھیں شراب سے لبریز تھیں۔ مجھے یہ یقین سا ہوا کہ ہم دونوں کے اندر ہماری شر پسند عمروں کا احساس ایک شور برپا کیے ہوئے ہے۔ فرزی نے بڑی ہی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "کہوں تجھ سے کچھ۔؟"

"کہہ دے" میں نے کہا۔

اس نے اس سیم تن کی طرف اپنا ہاتھ اٹھایا اور جھوم کر گویا ہوا۔

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

یہ سن کر اس کافر ادا نے اپنے بدن کے کچھ ایسے رچاؤ کے ساتھ سارے ماحول میں ایک تبسم کا رنگ بکھیر دیا کہ ہم دونوں کے چہرے سچ مچ رنگ دار اور روشن

ہوگئے۔فرزی نے تو ایک رندِ خراب کی طرح اپنا جام خالی کر دیا اور بڑھ کر میرا جام اٹھالیا اور اس نازنین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"یہ شراب تم پی لو۔یہ ہے نا میرا یار، یہ شراب سے زیادہ تم کو پی رہا ہے۔" تو اس محوِ رقص بدن میں ایک لچک سی آگئی۔اور وہ ٹھیک ایک تال پر گھنگھروؤں کو چھنچھناتی ہوئی مجھ تک پہونچ گئی۔اور اپنی ساری مستی بھری عریانیوں کو مجھ سے قریب کرتے ہوئے فرزی کے ہاتھ سے وہ جام لے لیا اور اپنے چُلّو میں تھوڑی سی شراب انڈیل کر ہنستے ہوئے مجھ سے بولی۔"لو، اس میں ڈوب مرو۔" تو واقعی ایک بیتابی کے ساتھ میں نے اس کے چلو سے بہتی ہوئی شراب پی لی۔جب اس کے حنائی ہاتھ کا گداز میرے ہونٹوں کو چھو گیا تو میں نے پلٹ کر فرزی سے کہا۔"اور شراب منگواؤ"۔تو فرزی نے میری طرف جھک کر کہا۔"ہاں، اور شراب منگوالیں گے۔پھر بھی اس کافر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ دل پر رکھا اور دوسرا جیب پر۔تو میں نے کہا۔"یار میرے کوئی فکر نہ کر۔مجھے یقین ہے اپنے ہاسٹل والا رئیس تین دن بعد ایک اور شادی کرے گا۔" ہم دونوں ہنس پڑے۔

وہ سیم تن ایک گلِ آتشیں بن گئی۔فرش پر بکھرے ہوئے پھولوں کے بیچ بیٹھ گئی۔وہ اپنی نوک پلک اِس طرح سنوار رہی تھی جیسے ہم سے بے نیاز ہو۔بے خبر ہو ایسے میں اس شوخیِ بے مہر کو کوئی ایسی زبان دے دیتا ہے کہ ساری خموشیاں متکلم ہوجاتی ہیں اور ایک آواز سی شئے سننے والے کے دل کو برماتی رہتی ہے میں جی مسوس کر رہ گیا۔

"یار میرے، میں تو گیا۔" تو فرزی نے کہا۔"کہا تھا نا میں نے تجھے کہ مجھے ہاسٹل کو واپس اکیلے ہی جانا پڑے گا۔اب بقیہ زندگی تیری اسی تکیے پر گزرے گی رے فقیرے" میں نے کہا۔"ہاں شاید، لیکن بڑی ہی مختصر۔کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔"

فرزی مسکرا پڑا اور بولا۔"کیا مہذب ہو جاتا ہے انسان شراب و شر کے گھل مل جانے کے بعد۔صرف شعر کی سطح پر بات کرتا ہے اور وہ بھی دردمندئ حیات کے ساتھ۔"

فرزی نے اس بت طنّاز پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ "کرم کیجیے۔ اس آگ کو اب ذرا ایک غزل کی خوشبو سے اور بھڑکا دیجیے۔"

تو ایک ہلکی سی چھن سی آواز گونجی۔ اس نے اپنا پہلو بدلا۔ بجلی سی کوندی، پتہ نہیں تان کہاں تک پہونچ پائی تھی کہ ایک مردانہ آواز کی لہر اٹھی اور فضا میں پھیل گئی۔ ؎

اِک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ

تو اچانک وہ سریلی تان رک گئی۔ وہ سرو قد کھڑی ہو گئی اور بول پڑی۔

چہرہ فروغِ مئے سے گلستاں کیے ہوئے

آیئے نواب صاحب، تشریف لایئے۔ ہم تو چشم براہ ہیں کب سے۔ ہم دونوں نے دیکھا، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے ایک وجیہہ شخصیت جس کی آنکھوں میں ڈوبتے سورج کی سی روشنی تھی اور شام کی مستی۔ ایک مسند کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ساتھ دو مصاحبین ہیں۔ اس غزل چھیڑنے والی غزال چشم نے بڑی ہی سحر آفریں نظروں سے نواب کی طرف دیکھا اور آداب بجالائی۔ نواب تو جیسے تھے ہی روحِ تمدن، دلدادہ محفل۔ محرمِ راز، خوگرِ عشوہ و ناز۔ مسند کی طرف بڑھ کر ادھر ادھر نظر ڈالی اور مسند پر بیٹھ گئے۔ ہم نے شراب پی نہیں ہوتی تو شاید اس لمحے ہم کو اپنی بے بضاعتی کا احساس ہو جاتا۔ لیکن جب نواب نے ہم کو ایک نگاہِ خاص سے دیکھا تو ہم دونوں نے ان سے نظریں چار کیں اور ہمسری کا اظہار کر دیا۔ لیکن ہوا یہ کہ نواب نہ صرف مسکرا پڑے بلکہ قدرے جھک کر بڑے ہی پرتپاک انداز میں ہم کو سلام کیا۔ تو شاید اس زمین کو جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ہم دونوں نے بڑی ہی سرعت کے ساتھ جواباً سلام عرض کیا اور پتہ نہیں فرزی نے کیا محسوس کیا، میں کچھ بے آرام سا ہو گیا۔ لیکن شراب آچکی تھی، ساغر بھر چکے تھے، نواب کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جس سے کوئی شخص یونہی اونچا اونچا لگتا ہو۔ اس کے ساتھ ان میں ایک صاف ستھرا انداز تھا، سرخوشی کا۔ اور ان دونوں کے امتزاج میں ایک خلوص کا اظہار تھا۔ سلام کا جواب دینے کے بعد جب ہم نے یونہی، نواب کی شخصیت پر غور کیا تھا تو مجھے گھڑی بھر میں کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا۔ نواب نے پھر ہلکے سے سلام کے ساتھ اپنا سر

اٹھاتے ہوئے ہم کو اشارہ کیا کہ ہم اپنے اپنے ساغر اٹھائیں۔ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی جو صرف ایک شفاف کانچ کی سی لگتی تھی۔جس میں مجھے لگا ایک کھنک تھی اور اس کھنک میں بڑی اپنائیت تھی۔شراب کی ہلکی ہلکی لہروں کی زد میں کچھ ایسے ہی تو سُبک سُبک احساسات ہوتے ہیں، جن سے انسانی رشتوں میں ایک تلذّذ پیدا ہو جاتا ہے۔میں نے جب تیزی سے دو تین گھونٹ پی لیے اور پھر اس مجسم عشوہ و شر کی طرف دیکھا، در و دیوار کو دیکھا، نقش و نگار کو، رنگ و نور کو دیکھا، سنگیت کی لہروں میں فرزی کی قربت کا گداز محسوس کیا تو بے اختیار ایک ہوک سی اٹھی کہ اس سارے منظر کو اس مرقع کو بس جوں کا توں پوری طرح محفوظ محفوظ لے چلوں، اپنی زندگی کے دوش پر۔زندگی کے لمحہ آخر تک لے چلوں۔نہ کچھ ادھر دیکھوں نہ ادھر۔نہ یہاں کبھی کچھ بدلے۔

غزل چھڑ گئی تھی۔غزل کے الفاظ پھولوں جیسے تھے اور غزل کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی تھی۔اس پر اس کافر کی دل فگار ادائیں فضا میں ایک صندلیں رنگ بکھیر رہی تھیں۔وہ خوشبو جس کے رنگ ایسے تھے کہ دل میں ایک ٹیس پیدا کرتے تھے اور احساس پر ایک چوٹ بن کر برستے تھے۔وہ خوشبو خوشگوار بھی تھی اور پُرسوز بھی۔

شراب، حسن اور غزل، یہ کیسی تخلیقات قدرت ہیں جن کا یکجا ہو جانا زندگی کے اختصار کو کتنا معتبر اور دل ربا بنا دیتا ہے۔کچھ ایسا ہی اعتبار تھا سارے ماحول میں۔مستیوں میں جھومنا جسے کہتے ہیں، ویسے ہر لمحہ، حیات جھوم رہا تھا۔ادھر ادھر سے سمٹ کر زندگی اگر ان لمحاتِ نشاط میں ضم ہو جائے تو ہو گئی نا زندگی کی ساری تشنگیوں کی سیرابی۔؟شبابِ اصل ہی تو زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔

ایک تان کے ساتھ ساتھ میری نظر بھی اوپر ہی اوپر اڑتی چلی گئی۔وہاں سب کچھ نیلگوں نیلگوں تھا۔زمردیں چمک تھی۔شہابی دمک تھی۔ایک ایسا بھی عالم ہوتا ہے کہیں جہاں بشر اپنے آپ سے باہر نکل کر بکھر جانا چاہتا ہے، صرف اپنے اس اظہار کے لیے جو کبھی وہ اپنے ہوش و حواس کے ساتھ نہیں کر پاتا۔وہ اظہار اپنی زبان سے کرتا ہے نہ آنکھوں سے، بلکہ اپنے روم روم سے کرتا ہے اور یقین کر لیتا ہے کہ وہ

کمال اظہار ہے، تسکینِ اظہار ہے۔

اس طرح سارا وجود اپنا اظہار کرتا رہے اشاروں کنایوں میں، احساسات کی چُبھن میں اور ایک یہاں سے اٹھ کر وہاں غائب ہو جانے والے درد میں۔ اس درد کے ساتھ لمحہ لمحہ شراب اور اس کی لگائی ہوئی آتشِ نرم رو اندر ہی اندر کہیں جلتے موم کی طرح ٹپکتی رہے اور ہم جیسے کسی حیات ناآفریدہ کا انتظار کرتے رہیں۔

عالم نیم شب، پراسرار بھی اور پراظہار بھی۔ نہ صبح قریب تھی نہ شام، اقلیم ہوش تو تاراج ہو چکی تھی، جنونِ دریدہ دہن بھی چپ تھا۔ ہائے کچھ بھی تو نہیں رہا اپنا، نہ عالم سرخوشی نہ عالم غم طلبی۔

"کہاں جا کر کون کس طرح لٹ جاتا ہے، ہائے"۔ ادھر ادھر اپنی بے قابو نظروں سے دیکھتے ہوئے نواب نے یہ بات کہہ دی، ان کی یہ بات سن کر ایک آرزو جاگی کہ بس تھوڑی سی حیات ابھی باقی ہے، چلو وہ بھی لٹا دیں۔ آخر اس محفل سے آگے اس دہلیز سے آگے کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔"

پتہ نہیں کس کیفیتِ جنوں نے ہم کو اپنے ساتھ لے جا کر نواب کے قریب بٹھا دیا۔ نواب کی آنکھوں میں ایک ایسی مسرت کی لہر چمکی جیسے لمحہ بھر میں انہوں نے کچھ فتح کر لیا ہو۔ انسان کا پیار، اپنوں کا پیار .... اور وہ شئے جو حاصل شب تھی، حاصل غزل تھی، سر سنگیت تھی، اپنی رقص کرتی ہوئی نظروں کے ساتھ ہم تینوں کی طرف نگراں تھی، ایسے میں بھی مجھے جانے کیا ہو جاتا ہے، ہوش و حواس کا ایک جھکڑ آ کر گزر جاتا ہے، اس لمحے وہاں سمی کھڑی تھی اور رقص کرتی نظروں کے ساتھ میری طرف نگراں تھی۔ "اور کسی رخ پر نہ جاؤ۔ اسی رخ آ جاؤ۔" ایک ہلکا سبک سا جھونکا آیا شاید نسیم سحر کا اور آ کر گزر گیا۔ اس ایک لمحے میں رنگ محفل ہی بدل گیا۔

شاید فرزی کے وجود کو بھی کھدیڑ کر درد کا ایک طوفان گزر گیا تھا۔ وہ ایک مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر جیسے وہ اندر ہی اندر لرز گیا ہو۔ شاید وہ کسی گزرے لمحے کی یاد تھی جس کے کرب کو وہ اس تبسّم کی شکل میں سارے ماحول میں بکھیر دینا چاہتا تھا۔

جانے کیوں نواب نے ہم دونوں کو اپنے قریب پا کر، کچھ ایسی متلاشی نظروں

سے دیکھا کہ مجھے لگا نواب کی نظریں میرے اندر اتر چکی ہیں اور انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے اور فرزی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس وقت نواب نے اپنے زرتار جیب سے پتہ نہیں کس قسم کا زر نکالا اور اس حسنِ زریں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا کہ وہ شرارہ رقص گھڑی بھر میں بے سرو ساماں وجود بن گیا۔ جیسے اس ستمگر کو کسی بھی ستم سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو جیسے بڑی ہی بے نیاز ہے سیم و زر کے لطف و ستم سے۔

اپنے جنوں میں ہم دونوں بھی تو صاحب دول تھے۔ ہم نے بھی ایک شان کج کلاہی کے ساتھ اس طرح اپنے ہاتھ بڑھا دیے جیسے وہ ہاتھ خوگرِ داد و دہش ہوں۔ نواب نے صدا بلند کی۔ " نہیں آج یہ نہیں ہوگا۔ آج کی رات ہمارے نام رہے گی۔ اور کل کی شب آپ کے نام۔" انہوں نے ایک خسروانا نظر کے ساتھ اس حسن مُجسم کی طرف دیکھا۔ اس نے ذرا سا خم ہو کر اپنے فن کی ساری نوازشوں کو فرش پر بکھیر دیا اور اپنے ایک طلسمی تبسم کے ساتھ ہم کو اس طرح دیکھا جیسے وہ ہماری داد عیش و نشاط کے لیے کل ہماری منتظر رہے گی۔ میں نے اور فرزی نے ایک کمالِ فن سے اپنی کج کلاہی کو ہر جنبش بیجا سے بچا لیا۔ لیکن پتہ نہیں ہم دونوں اندر کہاں کہاں ٹوٹ گئے پھر بھی جی گئے کہ واہ کیا نشہ و غرور تھا شراب کا۔! اور یہ سب کچھ صرف اعجاز جنوں تھا۔

باب (۲۵)

اب ہم سب وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ عجیب عالم تھا، وہ جو سرتاپا ایک حسن فن تھی اس نے کچھ اس طرح ہم کو دیکھا کہ محسوس ہوا کہ وہ اس کی نظر نہیں تھی ریشم کی ایک ہلکی رنگ دار ڈور تھی جس سے میں بندھا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا دیا تو اس کی مسکراہٹ میں مجھے آغاز رقص کی ہلکی سی گھنگروں کی صدا سنائی دی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے فرزی نے کہا۔

" دیکھ اب تھوڑی سی رات رہ گئی ہے، اور یہی تھوڑی سی زندگی ہے، یہیں گزار لے اور مرجا"۔ نواب نے ایک ملائم سا قہقہہ لگایا۔

تھوڑی ہی دیر میں جب ہم اس رقص کدے سے باہر نکلے تو مجھے اپنے اطراف تو کچھ نظر نہیں آرہا تھا البتہ ادھر اوپر بہت ساری روشنی نظر آرہی تھی۔ بڑی ہی پر فریب۔
نواب کی بگھی کے پاس پہونچے تو نواب نے ہم سے کہا۔ "ہم کو بھی نوازیے۔ یک گونہ شب ہمارے ساتھ بھی۔"

میں اور فرزی کچھ ایسی ترنگ میں تھے کہ اس وقت ہم اپنے نہیں تھے اپنی راہوں کے تھے کہ جدھر راہ چلی چلے۔ کیا خوب عالم ہوش تھا، اے واہ۔ سامنے نواب کی ڈیوڑھی کا باب الداخلہ تھا۔ اوپر نوبت خانے میں ہلکی سی روشنی تھی اور سب کچھ چپ چاپ تھا۔ بگھی آگے بڑھ کر جہاں رکی وہاں ایک خدمت گار نے آگے بڑھ کر نواب کے قدم لیے۔ پھر ایک دو خدمتگار اور آئے اور ہم دونوں کو بھی آنکھوں پر اٹھالیا۔ ہوا کی ہلکی ہلکی سنسناہٹ تھی، ڈیوڑھی کے بام و در سے ہو کر ہوائیں ہم تک آرہی تھیں۔ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ ہمارا نشہ اور رات گئے ڈیوڑھی کی وہ ڈھکی چھپی وجاہت! ۔ کس مہر و توقیر کے ساتھ ہم کو لے جاکر وہاں بٹھایا گیا جہاں ہر طرف پھول سجے لگتے تھے۔ چھت پر جو فانوس تھے ان کی روشنی میں اس دبدبے کا انداز تھا جو حاکموں کی نظروں میں ہوتا ہے۔ قابل احترام بھی اور بیگانہ بیگانہ سا بھی۔ یہاں وہاں جو سنگ سیاہ میں بنے ہوئے یا پھر برف جیسے مرمریں مجسمے تھے وہ کچھ اس قدر مکمل، پُر گو و پُر اظہار اور پُر شکوہ لگ رہے تھے کہ لگتا تھا وہ تو صرف اس دور کی دین ہو سکتے ہیں جسے دور شب کہا جاسکتا ہے، جس کے چراغوں کو کبھی کیف مئے نے روشن بھی کیا ہوگا اور بجھایا بھی ہوگا۔

میں اور فرزی بڑی ہی وجیہہ اور آرام دہ نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور بڑے ہی سنبھلے سنبھلے انداز میں ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ مجھے بار بار وہ قالین متاثر کر رہا تھا جو ہمارے قدموں کے نیچے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جب میں اس پر چلتا ہوا اپنی نشست تک آرہا تھا تو مجھے یہی لگا تھا کہ رنگ برنگے ابر پر چل رہا ہوں، ان رنگوں میں پھیلا ہوا تھا کسی تاریخی میدان جنگ کا نقشہ، فاتح سر بلند اور مفتوح سرنگوں، فاتح اور مفتوح دونوں فوجوں کے سپاہیوں کا خون ادھر ادھر پھیلا ہوا، سرخ سرخ ایک جیسا۔ جانے کون تھا وہ قالین باف یکتائے روزگار۔ جانے کیسے کیسے رنگ تھے اس قالین میں

اور کیسی کیسی روشنی تھی ۔ چمکتی دمکتی تلواروں کی ۔ ابھی ابھی کسی تلوار نے کسی کا سر قلم کیا ہے اور خون ہر طرف بہنے لگا ہے ، چمک ہی چمک ، رنگ ہی رنگ ۔

دو خادموں نے جو سرخ و سفید لبادوں میں ملبوس تھے ، دو طشت لا کر بڑے ہی سلیقے اور ادب کے ساتھ ہمارے قریب تپائی پر رکھ دیئے ۔ طشت میں خالی جام رکھے تھے اور ہم سے قریب سامنے بیٹھے نواب ہم دونوں کو ایک شفیق مسکراہٹ کے ساتھ دیکھے جا رہے تھے ۔ بار بار قالین کی طرف جھکتی ہوئی میری نظروں کو دیکھ کر انھوں نے کہا ۔

" یہ کسی تاریخی جنگ کا نقشہ نہیں ہے ، ہر جنگ کا نقشہ ہوتا ہی ایسا ہے ۔ آپ تو خوب جانتے ہیں کبھی کوئی ملک یا کوئی قوم ، کسی دوسرے ملک یا دوسری قوم سے جنگ نہیں کرتی ۔ جنگ تو حکمران کرتے ہیں ۔ اپنی ہوسِ ملک گیری کی خاطر یا دوسرے ملک کے حکمران سے اپنی کسی ذاتی خصومت کے باعث یا پھر اپنی کسی اور ہوسناکی کے سبب ۔ لیکن خون ہوتا ہے صرف عام انسانوں کا ، جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ انسانی تاریخ میں جتنے نعرے سنائی دیتے ہیں وہ سب مُہمل اور کھوکھلے ہوتے ہیں ۔ ایک فریب ، ایک جال ۔ ان میں صرف آواز کی گونج ہوتی ہے ، معنی مقصد کچھ نہیں ۔ سارے ملک اور ساری قومیں ٹھہرے پانی سے بنی ہوئیں فصیلیں ہیں ۔ ان میں بدبُو ہے گندھک کی ، بارود کی ۔ انسانی خون کی سڑاند ہے جو محافظ ہوتی ہے اس خوشبو کی جو وجہ بقا ہوتی ہے حُکمران طبقوں کی آسائشوں کی عیّاشیوں کی ، بے مہریوں اور بے حِسی کی ۔ ہر ملک اور ہر قوم میں ، ہر دور اور ہر زمانے میں ایک ہی نژاد کے ، ایک ہی قماش کے حکمراں پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں ، ان کو الگ الگ ناموں اور الگ الگ اِصطلاحوں سے یاد کیا جاتا ہے ۔ ورنہ انسانی تاریخ کے پہلے حکمران نے وہی سب کیا تھا جو آج کا حکمران کرتا ہے ۔ اور اس پہلے حکمران کے سامنے اس کی رعایا یا عوام نے جس طرح اپنا سر خم کیا تھا ، ٹھیک اسی طرح آج کے عوام کرتے ہیں ۔ فرق ظاہری ہے ، دراصل کبھی کچھ نہیں بدلا ۔ اور نہ بدلے گا ۔ "

نواب پتہ نہیں کیسے مسلسل بولے جا رہے تھے ، جانے وہ نشۂ شراب تھا جس نے ان کے ذہن میں بندھی کچھ مضبوط گرہیں کھول دی تھیں یا پھر اس زوال پذیر

نوابی کی ایک کسک تھی جو ان کو بے چین کیے ہوئی تھی کہ کہیں تو اظہار ہو اور سکون ملے ۔ انھوں نے اپنی پھیلی پھیلی آنکھوں سے اوپر کی طرف دیکھا یہاں وہاں کتنے خوبصورت فانوس جل رہے تھے، آخر شب کی زوال پذیر روشنی کے ساتھ ۔ پھر کچھ تیزی سے ابھر آنے والے خیال کے ساتھ انھوں نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا ۔ پھر کہا ۔

" حکایتیں، شکایتیں تو تاریخ کا خمیر ہیں، صاحبو، تاریخ میں نہ کچھ اصل ہے نہ اصل کا کوئی پتہ ۔ چھوڑیے ۔ ہر تہذیب شراب میں بہہ جاتی ہے یا انسانی خون میں ۔ چلیے کیوں نہ ہم اپنے اپنے جام اٹھائیں .... "

ایک خادم نے آگے بڑھ کر جام بھرے ۔ اس رات کی خاموشی میں وہ ہلکی ہلکی قلقل کی صدا کتنی پر کیف لگی ۔ ساغر میں مئے گلگوں بھری جا رہی تھی ۔ ہم لوگوں نے اپنے اپنے ساغر اٹھائے اور ہونٹوں سے لگا لیے ۔ نسیم صبحگاہی کی سی خنکی تھی اس مئے میں ۔ کام و دہن کی تشنگی یوں بجھی جیسے لبِ شیریں کی ایک گلابی نے ایک ٹھنڈی آگ بھڑکا دی ہو اندر ۔

اچانک نواب ہنس پڑے ۔ اور ہنستے ہوئے وہ اپنا سینہ سہلانے لگے ۔ " ہم کو تو صاحب، شب زادہ کہا گیا لیکن ہم کو شب زادہ کہنے والے آج راندۂ درگاہِ شب ہیں ۔ ہم تو حکمرانِ شب تھے ۔ دیکھیے نا آج اس اقلیم شب میں محکوم سے ہیں ۔ کہنے والا منہہ زور ہو تو اس کی ہر بات تاریخ بن جاتی ہے ۔ اچھا چھوڑتے ہیں یہ باتیں ۔ آپ اپنی سنائیے ۔ آپ صاحبین تو تازہ واردانِ بساطِ شب ہیں ۔ بتائیے کتنی داستانیں بنائی ہیں آپ نے ؟ ۔ " یہ پوچھ کر نواب زور زور سے ہنسنے لگے ۔ میں اور فرزی ایک دوسرے کو کچھ الجھے الجھے انداز میں دیکھ رہے تھے کہ یہ نواب کچھ ہی دیر میں ایسا کیسا ہو گیا ؟ پھر بھی نواب کے چہرے کی رنگت میں اب بھی ایک ایسی ملائمت کا اندازہ تھا کہ نواب بڑا ہی وقیع لگ رہا تھا ۔

نواب کے چہرے کی کیفیت اچانک بدل گئی، پھر جیسے ایک تڑپ جو نواب کے ذہن و دل سے ہو کر گزری تھی، اب ایک نظر آجانے والے احساس کی شکل میں اُٹھ کر فضا میں گھل مل گئی ۔ ہم تینوں نے شراب کے بڑے ہی لذیذ گھونٹ پیے ۔ جام

نیچے رکھے اور ایک دوسرے سے بہت قریب آگئے۔ نواب نے ہم دونوں کو بڑی ہی تیز نظر سے دیکھا اور کہا۔

"ہم آپ کی عمر میں کمندیں پھینکا کرتے تھے، رنگین بام و در پر۔ اونچے اونچے پیڑوں کی سرسبز ٹہنیوں سے لٹک کر کاشانۂ محبوب میں پھاند پڑتے تھے۔ یہاں وہاں ڈیوڑھیوں کے چوکیدار، چوب دار "خبردار، خبردار" کی صدائیں لگاتے تھے اور ہم اپنی ریشمی الجھنوں اور مونس و غمخوار رکاوٹوں سے ہوتے ہوئے آغوش یار میں پہونچ جاتے تھے۔ اے صاحب، لگتا تھا ایک گھمسان کا رن جیت گئے ہیں۔ ہر شب ایک رزم، ہر شب ایک بزم۔ کہیے آپ کی کیسی گزر رہی ہے۔؟"

فرزی نے نواب کے سوال کا جواب اس تیزی سے دیا جیسے دیر سے اس لمحے کا منتظر تھا۔ کہنے لگا۔ "نواب صاحب۔ میں تو نخچیر ہوں، ایک طائر جو برابر اپنے پر پھڑپھڑائے جا رہا ہے، یا سمجھیے قوت پرواز تو ہے، لیکن راہ پرواز نہیں۔"

فرزی کی بات پر نواب پھڑک اٹھے۔ بولے۔ "ہائے واہ، کیا خوب تعریف کی آپ نے اپنے شباب اولیں کی۔ ہے بے بس وہی دور تو ہوتا ہے، مرکز حیات، ہر طرف ایک حسن سیال نظر آتا ہے۔ خواہ فطرت کا ہو، قدرت کا ہو یا محبوب کی الفت کا۔"

"حال زار اپنا کچھ ایسا ہی ہے نواب صاحب۔" میں بھی بہک اٹھا۔

میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرزی نواب سے کہنے لگا۔ "وہ جو غٹرغوں کرتا ہوا کبوتر ہوتا ہے نا، اس کے سینے کو سہلایا ہوگا آپ نے بھی کبھی۔ کیسی گدگداہٹ پیدا کرنے والی حرارت ہوتی ہے اس میں۔ ویسی ہی حرارت سے معمور ہے اس نوجوان کا سینہ۔ ذرا ہاتھ رکھ کر دیکھ لیجیے۔"

نواب کھکھلا اٹھے۔ میری طرف بڑی ہی پُرلطف نظر سے دیکھا اور کہا۔

"صاحبو۔ ہم نے جو دن دیکھے دیکھے۔ لیکن ان کے کچھ عکس آج بھی اس آئینہ خانے میں کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں، ہمارے ہاں دو نوخیز جوانیاں ہیں جن کے نام ہیں گل بکاولی اور انارکلی۔ دونوں رقص و موسیقی کی لہروں سے بنائی ہوئی ہیں۔ سجل سُریلی، تال بند۔ کبھی آپ بھی سج دھج کر آجائیے، ان کے سُرتال سے دل بہلائیں گے۔

ایک تو وفور نشہ۔ اس پر نواب کا یہ رنگین دعوت نامہ۔ مجھے یقین ہے، میری طرح فرزی کی بھی کھلی آنکھیں نواب کی طرف دیکھ رہی تھیں، لیکن ہم دونوں کی نظریں اس آئینہ خانے کے پراسرار گوشوں میں بھی ادھر ادھر لڑکھڑاتی گھوم پھر رہی تھیں۔ جانے کیا شئے ہے یہ حسن شباب یا شباب حسن، برہ میں ہو یا ملاپ میں، ہجر میں ہو یا وصال میں، ہر کیفیت میں جان سے گزر جانے کی دعوت دیتا ہے۔ میری زبان سے نکلا "گلِ بکاؤلی"، تو فرزی بول پڑا "انار کلی"۔ ہم دونوں نے بڑی ہی ملتجی نظروں سے نواب کی طرف دیکھا۔ نواب مسکرا رہے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "اب تو رسم و راہ بڑھ جائے گی۔ فرصت سے آیئے، شب بھر کے لیے آئیے اور سر شام آیئے، اور کھلے بندوں آئیے۔"

ہم نے نواب سے رخصت چاہی۔ نواب بغل گیر ہوئے اور وداع کیا۔

نواب کی بگھی میں بیٹھے ہوئے ہم اپنے ہاسٹل کی طرف چلے جا رہے تھے، آخرِ شب۔ ہر طرف تھوڑی ہی دیر میں پھوٹ پڑنے والا سناٹا تھا۔ بگھی کے گھوڑوں کی ٹاپ کچھ اتنی واضح تھی کہ اس میں ایک تال تھی، ایک سُر تھا اور مجھے ایک نام سنائی دے رہا تھا اس تال میں۔ "گل بکاولی، گل بکاولی۔

فرزی نے مجھے بڑی ہی بوجھل آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "پیارے، سچ بتا۔ کیا یہ آج کی رات کا نواب کوئی زندہ شکل تھا یا پھر وہ کوٹھا، وہ کوٹھے والی اور وہ نواب صرف اپنا ایک دلفریب خواب تھا۔ اُف دیکھو، وہ رہی انار کلی۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند اور نشے نے اسے ایک پرانی تہذیب کا کھنڈر بنا دیا تھا۔ وہ ایسے ہی نظر آرہا تھا۔ مجھے بھی اب اپنا نشہ، نشہ نہیں، ایک جادو سا لگ رہا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں بگھی کا کوچوان نہ سن لے، میں نے فرزی کی طرف جھک کر دبی آواز میں کہا۔ "ارے دیوانے۔ وہ نواب تو تیری میری طرح بالکل زندہ ہے، اور وہ کوٹھا ایک جیتی جاگتی دنیا۔" میں جھوم گیا۔ "فو۔ پیارے کیا چیز ہے یہ نوابی بھی۔ بس اتنی نوابی ہر فرد کو مل جائے نا تو ہر ہر فرد، اندر باہر پوری طرح ایک تہذیب بن جائے۔ پیارے، وہ جو تو بار بار کمیونزم، کمیونزم کہتا ہے نا، شاید اس کا اصلی سمبل بھی نوابی ہی ہے۔ نوابی نوابی ..... واہ۔ فو۔" میرا سر ڈھلک گیا۔ بگھی ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے رک

گئی ۔ ہم دونوں نے اپنے ہوش سنبھالنے کی کوشش کی، مگر تھوڑا پھسل گئے۔
کوچوان نے ادب سے کہا۔ "صاحب، آپ کا مقام آگیا۔"

ہم دونوں کے منہہ سے نکلا۔ "فو۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

کوچوان ہنس پڑا ہوگا۔ ہم دونوں اتر پڑے۔ کوچوان چلا گیا۔ ہم گیٹ کے پاس پہونچے تو عجیب تماشہ تھا۔ کچھ لمحوں بعد صبح ہونے والی تھی۔ ہم کو گیٹ کے پاس ایک ناٹا سا شخص دکھائی دیا۔ میں نے کہا۔ "فرزی، پکڑو اسے، یہ چور ہے۔" اس سے پہلے کہ فرزی اسے للکارتا۔ اس نے ہم سے پوچھا۔ "آپ لوگ کون ہیں۔؟"

میں نے کہا۔ "ہم سے پوچھتا ہے ہم کون ہیں؟ بتا تو کون ہے؟۔"

"دربان۔" اس نے کہا۔

"دربان!" شاید اس دن پہلی بار اسے متعین کیا گیا تھا۔ ہم سے وہ ناواقف تھا اس نے پھر ذرا پراعتماد لہجے میں پوچھا۔ "آپ لوگ کون ہیں؟"

فرزی نے کہا۔ "اندر والے"

دربان نے کہا۔ "اندر والے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ کھولو گیٹ۔"

گیٹ کھولتے ہوئے وہ ہمارے سامنے کھڑا ہوگیا۔ "بابوجی، واڈرن صاحب کا حکم ہے کہ رات میں لیٹ آنے والوں کے نام لکھ کر ان کو بتاؤں۔"

فرزی نے کہا۔ "ہاں، لکھ لو، میرا نام ہے، بلیک نائٹ اور ان کا نام ہے "ریڈ نائٹ" ۔ دربان ہمارے نام دہراتا رہا، ہم دونوں ہاسٹل میں چلے گئے۔ ویسے اب صبح ہونے والی تھی لیکن کمروں کے بند دروازوں سے لگ رہا تھا سب کے سب ابھی ابھی باہر سے لوٹے ہیں۔ کچی نیند ہے سب کی ابھی۔ اور سب کے پپوٹے سوجھے ہوئے ہیں واہ ری عمر، نیند تو کبھی ملتی ہی نہیں، بس جاگتے رہنا ہے سدا۔ جوانی تو نیند کی دشمن ہوتی ہے۔ فرزی اپنے کمرے پر رک کر دروازہ پیٹنے لگا۔ اس کا دروازہ کھلا، وہ اندر ڈھلک گیا۔ لیکن جب میں اپنے کمرے کے پاس پہونچا تو مجھے کمرے کا دروازہ، اپنی باہیں کھولے میرا استقبال کرتا ہوا نظر آیا۔ پوری طرح کھلا ہوا۔ چور اچکوں سے کانا پوسی کرتا ہوا۔ کھلا دروازہ دیکھا تو ہوش کی لہر سی آئی۔ "یہ کیسے کھلا رہ گیا؟ اندر ہلکا

ہلکا اندھیرا تھا۔ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی اور میرے بستر پر کوئی دراز تھا۔

"رفیع !! چاروں خانے چت۔" میں نے کہا۔

"اٹھ۔"

کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اٹھ"

نیند میں ڈوبے ہوئے لہجے میں مجھے جواب ملا۔ "تو نیچے سو جا۔"

میں نے کہا۔ "تو بھی نیچے سو جا۔ میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔"

اچانک اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر پوچھا۔ "کون مہمان؟"

میں نے کہا۔ "گل بکاولی۔"

"حرامزادے" کہہ کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی اسی بستر پر ڈھیر ہو گیا ہم دونوں اس طرح بے فکر سو گئے جیسے کم از کم مجھے اب زندگی بھر کبھی جاگنا نہیں ہے۔

باب (۲۶)

ایک دن اچانک فرزی ۔ مجھے بتایا۔ "ارے وہ سالا گیا۔ رفیع !"

"کہاں" میں نے چونک کر پوچھا۔

"غائب۔" فرزی نے کہا۔ "کوئی اتا پتہ نہیں سالے کا۔ گیا۔"

"لیکن ہوا کیا۔"

"سنا ہے کل اس نے کسی میٹنگ میں سر بازار کمیونسٹ پارٹی کا جھنڈا چڑھایا تھا۔ پولیس تعقب میں ہے اور وہ زیر زمیں۔ دیکھو سالے کو۔ باپ جاگیر دار تھا اور بیٹا نکلا کمیونسٹ۔ یہ بھی چھوڑ یار۔ عمر ہے عشق کرنے کی اور چڑھا رہے ہیں جھنڈا!!" فرزی ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں پیار تھا۔ رفیع کے لیے .... میرے سینے میں ایک ساتھ تین قسم کے درد اٹھے۔ پہلا تو یہ تھا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔؟ دوسرا درد یہ تھا کہ اس کج ادا یعنی اس کے شہرہ آفاق عشق، یعنی شکنتلا پر کیا گزرے گی، اس کی کالج کی ساتھی۔ رفیع کے دو نعرے تھے، ایک شکنتلا اور دوسرا انقلاب، ان دونوں کا وہ روز

منتظر رہتا تھا اور ان ہی دو نعروں کے جوش میں اس نے اپنی کالج کی زندگی کو داغ مفارقت دے دیا تھا۔ اور تیسرا درد جو اس وقت میرے سینے میں اٹھا تھا وہ اپنی جگہ بالکل سچا تھا۔ اس لیے کہ زندگی میں پہلی بار ایک بڑا ہی پر کشش اور پر فریب بش شرٹ، قسمت نے بنوا دیا تھا، سفید سلک کا۔ جو ایک ہی بار میں نے پہنا تھا اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ کسی دوشیزہ کو اتنا دلنواز نوجوان کہاں مل سکتا ہے! ۔ وہی نادر الوجود دلکش شرٹ پہن کر رفیع اس طرح غائب ہو گیا تھا۔ وہی بشرٹ پہن کر اس نے کمیونسٹ جھنڈا چڑھایا تھا اور وہی بش شرٹ پہن کر وہ زیر زمیں چلا گیا تھا۔ اچھا ہوا کہ میرا وہ درد غصہ نہ بن سکا صرف ایک درد ہی بنا رہا۔ شاید یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ رفیع سے میں نے پیار کر لیا تھا۔ حرامزادہ۔!

فرزی نے اچانک کہا۔ "یہ اچھا ہوا، اب تو پیٹ بھر کھانا کھا سکتا ہے" میں ہنس پڑا میری آنکھوں میں روشنی سی آگئی۔ بات یہ تھی کہ کالج سے بے دخل ہونے کے بعد رفیع ایک جرائم پیشہ شخص کی طرح، نہ صرف میرے کمرے میں در آیا تھا بلکہ کمرے پر پوری طرح قبضہ کیے ہوئے تھا۔ مجھ سے کہتا اندر آنے سے پہلے اجازت لے لیا کر۔ اس کے ساتھ انتہا یہ بھی کہ ہاسٹل کے میس Mess میں ان دنوں جو ہم سب کو محدود مقدار میں کھانا ملتا تھا، اس کا ٹھیک نصف حصہ وہ پورے حق و شوق کے ساتھ صاف کر لیا کرتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے اثرات تھے۔ ساری زندگی پر راشن تھا، یاری پر راشن، عشق پر راشن، ہاسٹل میں راشن۔

ہاسٹل سے اچانک اس کے غائب ہو جانے کے بعد کمرے کی تنہائی میں مجھے جب بھی اس کا خیال آتا، وہ خیال میرا سفید بش شرٹ پہنا ہوا ہوتا۔ ان دنوں پہلی بار مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ دوستی اور یاری بھی ایک عجیب جذبہ۔ الفت ہوتی ہے اور یہ دوست اور یار بنتے بناتے نہیں ہیں، یہ تو ہمارے ہی اندر رہتے ہیں، ایک ماحول یا ایک معاشرہ بن کر کہ ان کے بنا زندگی واقعی جنگل جنگل ہی لگتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی نیو شاید دوستی یاری کے جذبہ ہی نے ڈالی تھی۔ عشق و معشوق تو زندگی کے رنگ ہائے بہار کا لطف اصل ہوتے ہیں، لیکن یاری کی لذت و سرشاری تو ایک پھول جیسا جذبہ ہوتی ہے جو شب و روز زندگی کو گدگداتی رہتی ہے۔ یہی یقین

دلاتے ہوئے کہ جس طرح زندگی ایک وفا بھی ہے اور دغا بھی۔ اس طرح دوستی و یاری کی بھی فطرت اصل یہی ہے۔ وفا سے والہانہ پیار تو دغا سے بھی والہانہ عشق کہ یار پھر مل جائے تو سب کچھ بھول جائیں۔ زندگی کی اس لذت میں اک درد سوا ہوتا تھا۔

رفیع سچا فن کار تھا اور اس کا فن تھا فنِ گفتگو۔ اس کا وصف خاص تھا کہ جب محو گفتگو ہوتا تو وہ اپنی آنکھوں سے ہنستا رہتا اور اپنی ہنستی آنکھوں سے اپنے اطراف ایک کیفیتِ جذب پیدا کر دیتا۔ پھر کیا کچھ نہیں کہتا۔ جاگیرداری کے انحطاط نے اس میں ایک احساس بیداری پیدا کر دیا تھا۔ لیکن جاگیرداری کے ماحول نے اس کے شغل و شغف میں بہت ساری نفاستیں بھی پیدا کر دی تھیں۔ اس کے خیال میں کوئی اڑچن تھی نہ پیچیدگی۔ اس کے ستھرے لباس اور اس کی معیار پسندی کی طرح اس کی باتوں میں بڑی ہی دلچسپی کے ساتھ مرعوب کر دینے والی تازگی تھی۔ اپنے لب و لہجے میں اور اپنے اظہار کے دھاروں میں اگر وہ کچھ تھا تو صرف منفرد تھا، ہر طرح سے منفرد۔ وہ اپنے سننے والوں کے بہت سے مضبوط جڑوں والے عقیدوں اور یقینوں کو دوچار پرزور الفاظ کی ضرب لگا کر اکھاڑ پھینکتا اور ان کی جگہ لمحہ، حاضر کے کسی خیال اور کسی یقین کا بیج بو دیتا۔ جیسے آزادی ذہن کا پودا لگا دیا ہو اس نے۔

رفیع کی ایک جان لیوا ادا یہ بھی تھی کہ کالج کی تعلیم کے حصول میں وہ جتنا ناکام رہا تھا اتنا ہی کامیاب وہ حصولِ علم میں تھا۔ اس نے بہت کچھ پڑھا ہو یا نہ ہو، لیکن لگتا تھا کہ اس کے ذہن میں سقراط و بقراط کے علوم نے وراثتاً جنم لے لیا تھا اور مارکسزم جیسے نظریات اور فلسفے تو جیسے اس کی زندگی میں آنے والے موسموں اور شب و روز چلنے والی ہواؤں نے اس کو پڑھا دیے تھے، وہ سب جیسے اس کے لڑکپن کے دلچسپ کھیل رہے تھے۔

اس علم کا اظہار وہ کچھ اس تیز و طرار انداز میں کرتا اور کچھ اس قدر ہلکے پھلکے اور پرلطف انداز میں کرتا جیسے وہ اپنے ہی علم کا مذاق اڑا رہا ہو۔ ایک ہی سانس میں فلسفہ، فسق و فجور کا ذکر، شعر و شراب کا ذکر، حسن و شباب کا ذکر اور اس ساری گفتگو میں اس کے روشن چہرے پر کھلے ننھے پھولوں کی خاموش معصومیت بھی۔

گو کہ یہ اس کا ایک راسخ عقیدہ تھا، لیکن اس کا اظہار وہ یوں کرتا۔ "سنو یارو، مولانا مشرق فرماتے ہیں کہ زندگی ہی جب اپنی جگہ بے وفا ہے تو پھر زندگی سے کیوں وفا کی جائے۔ یا پھر زندگی میں کسی سے کیوں وفا کی جائے .... " یہ کہہ کر وہ ایک بڑا زوردار قہقہہ لگاتا۔

لیکن دھیرے دھیرے اس کا یہ قہقہہ کچھ طویل ہوتا چلا گیا۔ جیسے اس کے آخری سرے پر آکر اس کی لذت و لطافت پھِسل پھِسل جاتی ہے۔ اسے جیسے احساس ہونے لگا تھا کہ اپنے ان قہقہوں کے ساتھ وہ بھی کبھی کہیں پھسل جاتا ہے۔ اس کی عشق و عاشقی نے بھی وقت کی ڈگر پر دیر تک چلتے چلتے اس کے علمی شعور کی خاک چھانک لی تھی۔ ویسے وہ تو لگتا ہی بے گھر اتھا لیکن جیسے جیسے وہ اپنے اندر کی راہوں پر زیادہ چلنے پھرنے لگا تھا اور باہر کی کم کم۔ اسی طرح اس کی ذہنی کشمکشوں نے اس کو تنہا تنہا کر دیا تھا۔

باب (۲۷)

"تو کہاں مر گیا تھا۔" ایک چھوٹے سے میخانے کے سبزہ زار پر بیٹھے ہوئے، اس نے مجھے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر پوچھا۔ میں ایک طویل عرصے کے بعد اس سے مل رہا تھا، ہلکی شام تھی، ہلکی ہوا تھی اور واقعی وہ تنہا تھا۔ وہ کچھ ایسا لگا جیسے لمبی ڈاڑھی ہے اس کے چہرے پر، گردن تک لمبے لمبے بال ہیں۔ بڑی ہی تیکھی ناک ہے، روشن روشن آنکھیں ہیں۔ وہاں ایک پیڑ ہے۔ اس کے نیچے وہاں جانے کیسی کوئی نشست ہے کہ اس پر وہ آرام سے نیم دراز ہے، لمبا لمبا جُھبّا پہنا ہوا اور لانبے لانبے ڈھیلے ڈھالے آستین، سارے وجود پر جادوگری کا سا انداز تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"جانتا ہے تو، یہاں سب مجھے پیرِ مغاں کہتے ہیں اور جیّد عالم سمجھتے ہیں۔ اس طلسمات سے واقف، ساری کائنات سے میرے راز و نیاز ہیں۔" پھر اپنی آنکھوں کی مخصوص ہنسی کے ساتھ کہنے لگا۔ "تو چائے پیئے گا یا شراب؟"

میں نے کہا۔ "آپ عمر بھر تک بدکار رہیں گے۔" تو وہ زور سے ہنس پڑا۔ اس

کی ہنسی کے ساتھ وہ جو ایک تصوراتی پیڑ تھا وہاں، وہ بھی ہنس پڑا۔ اس نے میرے لیے شراب منگوائی اور ساتھ ہی پوچھا۔ "پیارے یہ عجیب میخانہ ہے، یہاں شراب بکتی ہے۔ ہیں تیرے پاس کچھ دام۔"

میں نے کہا۔ "اس بازار مصر میں میں تجھے غلام بنا کر بیچ دوں گا اور پھر عمر بھر شراب پیتا رہوں گا۔"

وہ ہنس پڑا اور پوچھا۔ "بتا اتنے دنوں سے تو کیا کر رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "عشق کر رہا ہوں۔"

"تو اور عشق!!" وہ چیخ پڑا۔ "ارے عشق کے لیے سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ سالا فرزی کہاں ہے، گلی کا دیوانہ۔ حرامزادے سب بھٹک گئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اچانک وہ میری طرف کچھ جھک آیا۔ اور بولا۔

"سن ایک مزے کی بات۔ کچھ ہی دن پہلے مجھے ایک مل گئی۔ بیوہ ہے۔ بڑی ہی صحت مند ہے۔ مجھ سے تھوڑی بڑی ہو گی عمر میں۔ کیا خوب بات ہے۔ میں آج کل جہاں رہتا ہوں نا، وہیں رہتی ہے وہ۔ میری پڑوسن ہے۔ اور ہے بڑی جہاں دیدہ۔ اچانک ایک شام میرے کمرے میں آ گئی۔ میں تو اسے دیکھ کر بھبک اٹھا۔ اس نے سیدھا مجھ پر وار کیا۔ بولی۔ "آپ تو واقعی بڑے ہی سچے اور بڑے ہی شریف انسان ہیں" پھر کچھ دن گزرے تو بولی "آپ تو فرشتہ ہیں فرشتہ"۔ ابھی دیکھ کل کا ذکر ہے، بڑے ہی دلربا انداز میں بولی۔ "آپ تو خدا ہیں" ...... دیکھا، اس کو کہتے ہیں عشق۔ خیر یہ تو عشق کے وہ اعلیٰ رتبے ہیں جو ایک سچا انسان ہی حاصل کرتا ہے ....."

میں نے کہا۔ "او سچے انسان، میری شراب ابھی تک نہیں آئی۔ کن کن سچے اشاروں کے ساتھ آرڈر دیا ہے آپ نے۔"

"مرتا کیوں ہے۔ آجائے گی۔ ذرا مشہور میخانہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ رک گیا۔ پھر بولا۔ "پیارے عشق کی بات تو چھوڑ۔ بہت سارے حرامزادے یہاں وہاں کہتے پھر رہے ہیں کہ میں ہار گیا ہوں اپنی فکر میں اپنی عملی زندگی میں۔ ان ذہیوں کو کیا پتہ کہ فکرِ سلطنت کیا ہوتی ہے۔ میں تو اپنی سلطنت کا حاکم ہوں۔ حاکم سچی چاہتا ہے ان ساری جھوٹی طاقتوں کو واقعی نیست و نابود کر دوں جنھوں نے انسان کو ایک بڑے

پودے کی طرح اکھاڑ پھینکا ہے۔ بس میں جیت جاؤں۔ جیت جاؤں۔ جیت جاؤں گا۔
اچانک وہ اپنی نشست پر کچھ سیدھا ہو بیٹھا۔ اوپر آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ لمحہ بھر بعد
پھر کچھ مجھ سے قریب ہو گیا اور کچھ رازدارانہ انداز میں بولا۔ "لیکن یار یہ کونسی فکر
ہو گی کہ مجھے ایک کچو کا سا لگا جاتی ہے کہ میری یہ جہد حیات میری اپنی بقا کے لیے ہے یا
عام انسان کی بقا کے لیے۔" وہ چپ ہو گیا۔ سر جھکا کر اپنی شراب کی طرف دیکھنے لگا۔
پھر جیسے وہ اپنے آپ سے باہر آیا۔ بولا۔ "ارے واقعی تیری شراب نہیں آئی۔" پیرِ مغاں
کے تیور بدل گئے۔ اٹھ کر وہ میخانے کے اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کچھ ہی
لمحوں میں ایک بیرا میری شراب لے کر آیا۔ میں رفیع کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے
بیرے سے پوچھا۔ "وہ صاحب کہاں ہیں۔" بیرے نے کہا۔ "بل ادا کر کے وہ چلے گئے
صاحب۔" مجھے کچھ عجیب دھکا سا لگا۔

رات کالی ہو چلی تھی۔ مجھے لگا میں نے تو واقعی ایک پراسرار جادو نگری میں
وقت گزارا ہے۔ وہ پیرِ مغاں تو شاید ساری تہذیبوں پر جادو کرنے والا ایک قدیم اور
کہنہ مشق جادوگر تھا۔ وہاں نہ وہ نشست تھی جس پر وہ نیم دراز تھا، نہ وہ گھنا پیڑ۔ بس
کچھ ایسا خیال آ رہا تھا کہ ٹھنڈی ہواؤں میں واقعی زہر بھی بھرا ہوتا ہے جو نس نس میں
چبھنے لگتا ہے۔

کبھی کبھی کچھ بھی، بالکل کچھ بھی سمجھ میں ہی نہیں آتا، جیسے ذہن کا کوئی وجود ہی
نہیں۔ شاید وہ موت کا عالم ہوتا ہو گا۔ ورنہ زندگی کو غلط ہی سہی لیکن سمجھتے رہنا، اچھا
ہوتا ہے کہ زندگی کا احساس تو ہوتا رہتا ہے اور محسوس نہ ہونے والے درد اٹھتے رہتے
ہیں۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہاسٹل کے کمرے میں ہی نہیں بلکہ پورے ہاسٹل ہی
میں، میں بالکل اکیلا تھا اس رات۔ پتہ نہیں کیوں سارے ہاسٹل کے ساتھ ساتھ سارا
شہر خاموش تھا، بالکل چپ چاپ۔ ایسی تنہائی کے عالم سے شاید میں پہلی بار گزر رہا تھا۔
رفیع کے اس طرح اچانک اس میخانے سے غائب ہو جانے کا خیال ایک پھانس بنا ہوا
تھا دل میں، جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لیکن پہلے کبھی ایسا تو نہیں ہوا تھا
اس خیال کے ساتھ میرا سینہ کچھ بھاری بھاری لگتا تھا۔ کچھ سانس بھی گلے میں رک

رک جاتی اور کوئی شدید احساس آنکھوں سے بہہ نکلنے کی کوشش میں تھا اور میں اسے روک رہا تھا، تھام رہا تھا۔ میں نے شاید سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ اس قسم کے جذبے کتنے بے معنی ہوتے ہیں۔ بالکل وقتی، مختصر راستوں کی ان چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں کی طرح جن کو ہم آسانی سے پھاند کر گزر جاتے ہیں۔ اور پھر اس جذبے کا کوئی وجود کہاں تھا؟ کہیں بھی تو نہیں۔ شاید کچّے دماغ کی کچّی سمجھ تھی۔ لیکن رفیع کون تھا آخر؟ یہ کیسا تعلق ہم عمری ہوتا ہے۔ وہ کیسا تھا، وہ کون تھا؟ ایسے سوال کیوں اُٹھ رہے تھے دماغ میں۔ یہاں سے ہاں بالکل میرے پہلو سے ایک لذیذ و شدید احساس ایک وجود بن کر مجھ سے اچانک جدا ہو گیا تھا اور ادھر ادھر بکھر گیا تھا۔ وہ وجود کیا میرا ہی ایک حصہ تھا؟ آخر یہ دوست ہوتا کیا ہے۔ سجّاد شمن۔ عجیب بات ہے اتنی رات گزر چکی تھی اور میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لگتا تھا یہ پردہ اٹھا، یہ قدموں کی چاپ اور یہ قہقہہ۔

کتنی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو عقل قبول نہیں کرتی لیکن ان سے زندگی کے کسی دکھ کے احساس میں یا مسرت کی لہر میں ایک رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رنگ محسوس ہوتا ہے، دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر عقل اسے قبول کیوں نہیں کرتی۔ شاید عقل محدود ہوتی ہے، ایک جذبہ کی طرح لامحدود نہیں ہوتی۔ جذبہ کی لامحدودیت زندگی کی وسعت ہوتی ہے، عقل اس راہ میں اپنی عمر چل کر تھک ہار جاتی ہے۔

میرے کمرے کی تاریکیوں میں اس وقت ایسے ہی رنگ تھے جنھیں میں محسوس کر رہا تھا، دیکھ رہا تھا لیکن عقل مجھے سمجھا نہ پا رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میرے سارے احساس اس وقت ان رنگوں کے بنائے ہوئے بہت ہی مہین پردے لگ رہے تھے جن میں صرف محسوس ہونے والا ایک بہت ہی سبک ارتعاش تھا، جیسے ہلکی سی ہوا آجائے تو ان کے تانے بانے ٹوٹ جائیں اور کہیں کچھ نظر نہ آئے، نہ محسوس ہو۔ ان احساسات کے پردوں میں شاید ایک ہلکی خاموشی جیسی جنبش تھی جو ان آنکھوں کی پلکوں میں ہوتی ہے جو حیرت و استعجاب میں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ یا پھر ان میں ان ہونٹوں کی گویائی تھی جو لفظ و آواز کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں۔

باب (۲۷)

وہ ایک عجوبہ تھا، ایک واہمہ تھا یا پھر کوئی ٹھوس حقیقت تھی جو زندگی کی حقیقتوں کے تسلسل کی ایک لازمی کڑی ہوتی ہے۔

میرے کمرے کے باہر سڑک پر کھلنے والی کھڑکی پر مہین سا سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا یا پھر وہ شام کا دھندلکا تھا، آہستہ آہستہ ہلتا ہوا۔ باہر راستہ چپ چاپ تھا، کوئی آواز نہیں تھی۔ اس چپ سادھے ہوئے راستے کے ہونٹ ہلے، میں کچھ سن پایا، جیسے ان دھندلکوں سے کوئی گزر گیا۔ اس گزرنے والے کے لباس کی ہلکی ہلکی سی رنگت شاید مجھے نظر آگئی تھی۔ میں نے اس کو پہچان لیا تھا۔ مین کچھ جانتا نہیں تھا اس کے بارے میں، ہاں دیکھا تھا، بار بار دیکھا تھا اس کو وہاں سے گزرتے ہوئے، بس ایک رنگ کی طرح، کبھی ایک خوشبو کی طرح، کبھی ایک درد کی طرح۔ ایک بار کچھ غور سے دیکھا تھا تو ایسے ہی شام کے دھندلکوں میں وہ لڑکھڑاتا تھا۔ اور اس طرح چلتے ہوئے پوری کوشش کرتا تھا کہ ایک رخ پر یعنی میرے کمرے کی دیوار سے لگے لگے گزر جائے، ہوا کے ایک ایسے جھونکے کی طرح کہ کوئی اسے محسوس تک نہ کرسکے۔ وہ کون تھا؟ یہ جاننے کی خواہش مجھ میں اتنی شدید نہیں تھی جتنی یہ کہ وہ ایک دھیرے دھیرے آگے بڑھ کر چمک چمک جانے والی کشش تھی جو اس کی شخصیت کو میرے لیے ایک سِرّ ناتمام بنائی ہوئی تھی۔

"ہوگا کوئی۔" مجھے اپنا یہ خیال ناگوار سا لگا تھا۔ "کہیں میرا اس سے کوئی تعلق تو نہیں؟ وہ تو کافی اونچی عمر کا آدمی لگتا تھا۔ ۴۰، ۴۲ سال کا۔ دبلا پتلا، کچھ نحیف نحیف سا، کچھ خفیف خفیف سا۔ بس شام ہوتی، دھندلکے بڑھتے اور وہ گزر جاتا۔ بے وجہ ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا جا رہا تھا اور وہ پوری طرح مجھ سے بے تعلق اور بے خبر تھا مجھ سے کیا وہ تو ساری کائنات سے بے خبر لگتا تھا۔ ایک دلکش، خوش رنگ اور باوقار لباس میں ملبوس۔ چہرے مہرے سے اعلیٰ نژاد۔ بس پیدا ہوئے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے ناز و نعم میں پلے بڑھے۔ کھیل کود رہا۔ پڑھنا لکھنا رہا۔ نہ کسی سے بیر نہ کسی سے دشمنی۔ جیسے اس جذبے ہی سے ناواقف۔ جس سے ملے دوست بنے۔ جس سے دل

بہلا اس سے بہل گئے۔ جسم و جاں کی خوش حالی نے کسی کدورت کو گھر کرنے ہی نہیں دیا۔ بات کی تو پیار کی، ہنسی مذاق کی، لطائف کی۔ ایسے ہی کچھ اجزائے ترکیبی تھے جن سے وہ شخصیت بنی تھی جس کو سنبھالے سنبھالے وہ ہر روز شام کے دھندلکوں میں میری کھڑکی کے نیچے سے گزر جاتا تھا۔ اس کے گزرنے کے بعد راستے کی خاموشی مجھ سے سرگوشیاں شروع کر دیتی۔

"وہ بدمست ہے، رند باوقار۔ مے خانوں کو عزت بخشتا ہے، یہ یقین دلاتے ہوئے کہ میخوار کو مے تک آنا چاہیے۔ مے تو حسن خرابات ہے جو زندگی کی ساری لطافتوں کا جگمگاتا تاج ہے۔"

آج رات اندھیروں میں کچھ اسرار زیادہ ہی تھے۔ اب جب کہ شہر کی شاہراہوں کی آواز مدھم پڑ چکی تھی اور عیش گاہوں کے سناٹے سنائی دے رہے تھے میں اپنے کمرے کی روشنی بند کیے اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور ایک جذباتی انداز میں کچھ سوچ رہا تھا۔ اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ کھڑکی سے کچھ ہلکی سی ہوا آ رہی تھی۔ جیسے بہت ہی آہستہ آہستہ وہ کسی کا نام لے رہی تھی۔

کھڑکی کے باہر اچانک ایک مرد کی آواز سنائی دی، لہجہ بڑا ہی مدھم تھا

.....

"تم چلی جاؤ۔ بنا یہ سوچے کہ میں کون ہوں۔ سمجھو ہم کبھی ملے ہی نہیں تھے۔ مجھے اپنا پاس ہے، اپنے ناموس کا پاس ہے، لیکن دنیا کا کوئی پاس نہیں۔ بس تم اسی لمحے اور یہیں سے چلی جاؤ۔ اس شخص کے ساتھ، جس کے ساتھ تمہارے تعلقات کا علم مجھے آج سے نہیں، مہینوں سے ہے۔ لیکن اس زندگی نے مجھے مہذب بنا دیا ہے۔"

کسی مہذب خاتون کی ایک مہذب ہچکی سنائی دی۔ مرد نے اسی بھرپور آواز میں کہا۔ "اس گھڑی اور اس جگہ ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ تم اپنے جذبے میں سچی ہو یا نہیں، مجھے اس سے غرض نہیں۔ لیکن میرے پاس کبھی نہ لوٹنا۔ میں نہیں ملوں گا۔"

"پھر ایک ہچکی سنائی دی۔ پھر کچھ ایسی سرسراہٹ سنائی دی جیسے جنگل میں اُگی ہوئی گھاس کو چیرتا ہوا کوئی وحشی جنگل کے اندر چلا گیا اور دوسری طرف جیسے کوئی

ناگن پھنکارتی ہوئی نکل گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ اس رخ پر مجھے بھی بھاگنا چاہیے۔ جانے کیوں ایسا ہوا، شاید جب کسی انسانی جذبے کی ہتک ہوتی ہے یا کوئی انسانی رشتہ ٹوٹتا ہے تو ماحول کی ہر شئے کو توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ ویسے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ میں تیزی سے اپنے کمرے سے نکلا کوریڈور سے ہوتا ہوا ہاسٹل کی گیٹ تک پہونچ گیا۔ اس وقت وہاں ان دھندلکوں میں مجھے ایک بڑی ہی دلکش شکل نظر آگئی۔ اس کا زرق برق لباس اس کی بھرپور شخصیت، جوانی کی ساری لذتیں آشکار، وضع قطع ایسی جیسے بڑے ہی تیز رفتار گھرانے کی خوش حالی سے ہو کر یہاں تک پہونچی ہے۔ لیکن اس وقت اس کے قدم کچھ غیر یقینی انداز میں اُٹھ رہے تھے۔ لگتا تھا اچانک اسے احساس ہو گیا تھا کہ جب تک شوہر کو دغا دینے کا احساس دل کا چور بنا ہوا تھا وہ اپنے آپ کو کہیں محفوظ پاتی تھی۔ لیکن اب جب کہ اسے ساری جذباتی جکڑ بندیوں سے چھٹکارا مل گیا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ اس کا وہ عاشق جو وہیں کہیں اس کا منتظر تھا، پتہ نہیں کن اندھیروں میں اسے ڈھکیل دے۔ میں نے خود اس رات ہلکے ہلکے اندھیروں میں اس حسین شکل کو بڑی ہی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور مجھے یہ ممکن لگا تھا میں بھی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہوں۔

آگے دور اس سڑک کی نکڑ پر ایک کار کے دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی پھر گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ پیچھے کی سرخ روشنیاں چمک کر تھوڑی دیر میں شاہ راہ پر غائب ہو گئیں۔

مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگا، لیکن دلچسپ بھی! میرے اپنے وجود سے ان واقعات کا کیا تعلق تھا، کچھ بھی تو نہیں۔ کہیں بھی تو نہیں، پھر بھی آدمی کیوں کچھ ایسے واقعات کو جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اپنا ذہن سونپ دیتا ہے۔ میری سوچ میں اس وقت گہرائی تھی۔ کافی رات ہو چکی تھی۔ آدمی اکیلا ہو تو رات بھی کتنی گہری ہو جاتی ہے، وسیع نظر آتی ہے، اندھیروں کا سمندر۔ میں گیٹ سے واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا، دیکھا تو سامنے کوریڈور میں دو نوجوان اس طرح ایک دوسرے کو لگے لگے کھڑے ہیں کہ اپنے ہونٹوں میں سگریٹ لگائے، سگریٹ سے سگریٹ جلا رہے ہیں، جیسے سگریٹ سے ایک دوسرے کو پیار کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کچلو تھا، بہت

ہی لمبے لمبے پاؤں، لمبے لمبے ہاتھ اور لمبا لمبا چہرہ۔ اس کا سارا وجود دو چار بمبوؤں کا بنا ہوا تھا، جیسے سگریٹ جلتے جلتے اس کے جسم کو کہیں چھو جائے تو اس کا سارا جسم جلنے لگ جائے اور دھواں ہی دھواں پھیل جائے۔ اس کی آنکھوں پر لگے ہوئے شیشے اتنے موٹے تھے کہ ان کو دیکھ کر سر چکرا جاتا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ اگر میں اس کی عینک لگا کر دیکھنے کی کوشش کروں تو شاید میری زندگی میں آنے والی جتنی راتیں ہیں سب کی سب ایک قطار میں مجھے نظر آجائیں۔ کچلو کی آواز میں بڑی گہرائی اور بڑی گیرائی تھی، کھلی اور صاف، اس کی آواز ہی اس کے سارے وجود کی قوت تھی۔ اس کے ساتھ دوسرا نوجوان جو کھڑا ہوا تھا وہ فرزی تھا۔

کچلو نے اپنے وزن سے زیادہ وزنی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "ارے یار، تم کو تو اب تک مرجانا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا۔ "کیوں؟"

تو کچلو بولا۔ "تم تو بڑے ہی Historical عاشق ہو، یعنی chronic اب تک تو تمہارا مقبرہ بن جانا چاہیے تھا۔"

فرزی نے تیزی سے کہا۔ "ہاں پیارے، اس کا مقبرہ تو ایک بڑا ٹورسٹ سنٹر بن جائے گا۔"

میں نے کچلو سے کہا۔ "کچلو، میرا ایک مقبرہ تو کیا، کئی مقبرے بن جائیں گے، لیکن عشق کے سلسلے میں تو یہ فرزی مصر و روما کے پرانے تاریخی آثار میں سے ایک ہے Historical Relic، مشہور کھنڈر، تم کو معلوم ہے تھوڑے دنوں میں ہزاروں لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آنے لگیں گے۔ ہم بڑے مشہور ہو جائیں گے اور مالدار بھی۔"

فرزی نے مجھ سے کہا۔ "دیکھ تو اور میں کبھی بھوکے نہیں مریں گے۔ میرے مقبرے پر تیری مجاوری اور تیرے مقبرے پر میری۔"

کچلو ایسے ہنسا جیسے وہ جن بمبوؤں سے بنا تھا، ان میں کہیں تڑخ سی آگئی ہے۔ میں نے کچلو سے کہا۔

"لیکن یار، اصلی گھی کی طرح اصلی عاشق تو تو لگتا ہے، کوئی ملاوٹ نہیں، بالکل

کھرا۔ تجھے معلوم ہے قیس جب جنگل میں کسی پیڑ تلے بیٹھ گیا تھا تو وہ ایسے لگتا تھا جیسے
کوئی سوکھی ساکھی بیل پیڑ کو لپٹی ہوئی ہے۔"
تڑاق سے جیسے بمبو پھٹ پڑے اور اس کا ایک سوکھا ٹکڑا میرے کاندھے پر
آگرا۔ اس نے کہا۔ "آؤ میرے کمرے میں۔ میری لیلیٰ کی باتیں سناتا ہوں۔" میں اور
فرزی اس کے کمرے میں چلے گئے۔ ایک کونے میں ہلکا پھلکا سا ایک پلنگ رکھا تھا،
اس پر نرم نرم بستر۔ ٹیبل کو لگی ایک کرسی، ٹیبل پر بے حساب کتابیں، ٹیبل کے
ساتھ ساتھ کرسی پر بھی موٹی موٹی کتابیں۔ ذرا آگے دیکھا تو پلنگ پر بھی تین چار موٹی
موٹی کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تو بیٹھتا کہاں ہے؟"
کچلو نے اپنی آواز میں جواب دیا۔ "میں بیٹھتا نہیں۔"
"لیکن دوسروں کو بٹھاتا تو ہے نا؟"
میں اور فرزی اس کے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ کچلو نے مجھ سے کہا۔ "ایک سگریٹ
پی۔" اپنے ٹیبل کی دراز سے ایک بدوضع اور کھردرا کھردرا سگریٹ نکال کر دیا۔ اور
دبے لہجے میں کہا۔ "لے پی لے۔" اس نے فرزی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔
"جلا لے" فرزی نے مجھ سے کہا۔ میں نے سگریٹ کی طرف غور سے دیکھا،
سگریٹ کچھ موٹا موٹا سا لگ رہا تھا۔ دونوں میری طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ فرزی
نے دیا سلائی سے میرا سگریٹ جلا دیا۔ میں نے کش لیا تو میرا سر چکرا گیا۔
دونوں نے کہا۔ "گھبرا نہیں، آج ہم سب ننگے ملکوں کی ننگی اپسراؤں کے پاس
جانے والے ہیں۔ اس دھنوئیں سے ہوتے ہوئے ہم اوپر اڑ جائیں گے۔"
میں نے کہا۔ "لیکن۔" تو کچلو نے کہا۔ "چپ رہ۔ اب سن میری عاشقی کی بات۔
دیکھ آج تک میں نے کسی سے عشق نہیں کیا۔ البتہ اگر کسی نادان حسینہ نے مجھ سے
عشق کیا ہے تو مجھے نہیں معلوم۔ اور تو نے جو کہا ہے نا وہ سچ ہے، میں صرف لکڑی کا بنا
ہوا ہوں۔ یہاں سے وہاں تک مجھ میں کوئی جذبہ نہیں۔ کیا تو یقین کر سکتا ہے کہ
کبھی کوئی حسین لڑکی نظر آتی ہے تو باضابطہ خیال آتا ہے کہ "ابھی کوئی ضرورت نہیں"
پتہ نہیں کس طرح ان بڑی بڑی کتابوں نے مجھے دیمک کی طرح اندر باہر چاٹ لیا
ہے۔ لگتا ہے ابھی میرا کچھ حصہ بچ رہا ہے۔ اور جب یہ کتابیں مجھے پوری طرح چاٹ

جائیں گیں تو شاید پہلی بار مجھے ایک لڑکی کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ مجھے ٹھوک ٹھاک کر پھر سے بنا لے۔ بس۔" اب اس نے اپنے سگریٹ کا ایک بہت لمبا کش لیا۔ مجھے لگا اب بمبو جلنے لگ گیا ہے اور اس کی بو کمرے میں پھیل گئی ہے۔ وہ لیمپ جو نیچے ٹیبل تک لٹکا ہوا تھا، اس کی روشنی بھی بڑی مدھم لگ رہی تھی۔ کیونکہ فرزی بھی اپنے سگریٹ کے بڑے بڑے کش لے رہا تھا اور کمرے کو دھواں دھار بنا رہا تھا۔ ہم تینوں کی آنکھیں ذرا زیادہ سرخ ہو گئی تھیں۔ کچلو نے بڑے ہی پر سکون لہجے میں مجھ سے کہا۔

"دیکھ، تو ابھی ابھی جس کو گیٹ پر دیکھ آیا نا، وہ اپنے ہی ایک لذیذ ترین جذبے کا ایک روپ ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے تجھے بھی ایسا ہی لگا نا کہ اس کا نیم برہنہ حسن تجھے بھی کچھ چرکے لگاتا ہوا گزر گیا۔" وہ ایک طویل داستان کی ایک کڑی ہے۔ ایک کڑی ...... کڑی ...... اس کی آنکھوں میں اس کے سگریٹ سے زیادہ چمک آگئی۔ کچلو کی وزنی آواز مجھے سنائی دیتی رہی۔ اس کا لہجہ کچھ زیادہ ٹھوس لگ رہا تھا، پراعتماد، جیسے کوئی کتاب کھول کر اس نے پڑھنا شروع کر دیا ہے، کہنے لگا۔

"ان سب کو میں جانتا ہوں۔ وہ سب ہماری تہذیب و تمدن کے کتبے ہیں۔ اس مہذب شہر کی تہذیب کا نام ان کے ناموں سے، ان کے کارناموں سے زندہ ہے۔ یہ بڑے ہی خوبرو، خوش مزاج، خوشحال اور دل والے لوگ ہیں۔ ان کی ہلکی نیلی آنکھوں کو دیکھو، ان میں ان کی نسل کی بے جابرتری کی جھلک ہوتی ہے۔ وہ جھلک ان کے رُکے رُکے کھلے کھلے انداز اور سنبھلی سنبھلی گفتگو سے مل کر ان میں ایک شان بردباری پیدا کرتی ہے۔ تم سچ مانو ان کو دراصل کسی سے کوئی خصومت نہیں، کوئی دشمنی نہیں، وہ بس جیسے اپنی ہی زندگی کے نرم گرم میں مست رہتے ہیں۔ لیکن جہاں کبھی کوئی شک رنجی پیدا ہو جاتی ہے یا کوئی ایسی مشکل آجاتی ہے جو ان کی زندگی کی پرسکون آسائشوں کو کچھ درہم برہم کر سکتی ہے تو ان کی تہذیب، ان کی معاشرت ان کے طیش کو یا کسی انتقام کے جذبے کو حد سے گزرنے نہیں دیتی۔ بڑے مہذب ہیں یہ لوگ۔ اصل تہذیب برداشت ہے، انسان کا ظرف، اس کی فطرت کا حسن ہے۔ ہاں کبھی کبھار کوئی غم، کوئی دکھ اپنی ایک باوقار چمک یہاں وہاں دکھا جاتا ہے۔ ان کے

نرم نرم لہجوں میں بڑی گھلاوٹ، بڑا دبدبہ ہوتا ہے ۔ دوسرا کوئی ان کے غم کو ذرا کم ہی چھو سکتا ہے ۔ مختلف مذہبوں کے اثرات نے جو ایک تمدن بنایا ہے، اس شہر میں، اس میں یہاں سے وہاں تک ایک بڑی ہی دلکش اور سکون پرور مشرقیت اور انسانی فطرت کی نفاست تھی ۔ ان نفاستوں میں بیرونی حکمرانوں کی معاشرت کی چکاچوند اور اس کی ہلکی ہلکی دلپذیر عریانی بڑی ہی تیزی سے گھل مل گئی اور زندگی کی لذتوں کے احساس کو ہلکے ہلکے اکساتی رہی ۔ مشرقی وضع قطع کو کچھ اس طرح زیادہ پر کشش اور جاذب نظر بنادیا کہ ایک شائستہ دل اس کی دلفریبیوں کو اپنی تہذیب کا طرۂ امتیاز سمجھنے لگا .... لیکن سب چلتا ہے یار، یہ تاریخ ہے تاریخ، تمہارے میرے بس میں تھوڑا ہی ہے کہ آج کی سیاہ رات جہاں سے بھی، جدھر سے بھی اور جس طرح بھی گزرنے والی ہے، اس کے روٹ Route کو یا اس کی اسپیڈ کو بدل سکو۔"

مجھے کچلو کی باتیں عجیب تو لگ رہی تھیں لیکن ساتھ ساتھ ایسا بھی لگ رہا تھا کہ وہ سگریٹ جو میں پی رہا تھا وہ اس کی ان باتوں سے زیادہ عجیب تھا ۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی ہر بات ایک شکل بن کر سامنے آرہی ہے اور اس طرح کی کئی شکلیں میری نظر کے سامنے سے گزر رہی ہیں ۔ اور یہ بھی خیال آرہا تھا کہ یہ ماضی ہے، یہ حال ہے اور یہ مستقبل ۔ فرزی کی طرف دیکھنے کے لیے مجھے کوشش کرنی پڑی ۔ جانے کیوں میرے ذہن نے اس وقت مجھے یقین دلانے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ فرزی زندہ ہے ۔ اس کا سگریٹ تو جیسے بھڑک رہا تھا ۔

کچلو میری طرف جھک آیا اور بولا "آج شام وہ سب کچھ میں نے بھی دیکھا اور میں نے بھی سنا جو تم نے دیکھا اور سنا ۔ وہ منظر ۔! وہ جو ادھر چلی گئی ۔ بڑی فنکار ہے وہ پھر اس دور کی آزادیوں نے کہاں کہاں اظہار کا موقع نہیں دیا ہے ۔ وہ ادھر چلی گئی ۔ اور وہ جو لوٹ گیا، وہ تہذیب زدہ، اس کا خدائے مجازی" ۔ اس بات پر کچلو یکلخت زور سے ہنس پڑا ۔ اور بولا ۔ "بڑا خوبرو آدمی ہے وہ ۔ میلی نیلی آنکھوں والا، بدمست ۔ وہ تو بڑا عالم و فاضل انسان ہے ۔ جتنا پڑھتا ہے، اتنی ہی پیتا ہے، جیسے علم سے حاصل ہونے والی شئے صرف تشنگی ہوتی ہے، اور وہ صرف شراب سے بجھتی ہے ۔ وہ دونوں آج اس گلی کی نکڑ پر آکر کس طرح چپ چاپ، ایک بے ضرر انداز میں ایک دوسرے سے

ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ یہ تہذیب کا المیہ ہے یا طربیہ۔ یا پھر نہ یہ ہے نہ وہ۔"

کچلو اب میرے لیے صرف ایک آواز بن گیا تھا، جو مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اور فرزی صرف ایک بے معنی وجود۔ شاید اس سگریٹ کے نشے کے تسلسل میں ایک وقفہ بھی آجاتا تھا وہ نشہ اچانک دو گھڑی کے لیے ٹوٹ بھی جاتا تھا۔ ایسا ہوا بھی۔ میں اور فرزی بالکل ویسے ہی بن گئے جیسے شروع ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے بڑی ہی سمجھداری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مسکرا پڑے۔ لیکن کچلو اب بجائے ایک آواز کے، کچھ کہنے والی خاموشی بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر لگے ہوئے بڑے بڑے شیشے اب مجھے میری آنکھوں پر لگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور ان شیشوں سے میں اب کچلو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے لیے ایک بہت ہی واضح شکل بن گیا تھا۔ جیسے ایک آوازِ مُتشکّل ہو گئی تھی، ایک آہ یا واہ بنی ہوئی۔

دو لمحوں بعد کچلو کی آواز کہیں دور سے آئی۔ "وہ، وہ جو آج شام چلی گئی نا، وہ میری بہن تھی"۔

جیسے ہمارے سگریٹ ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے اور کمرے میں دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ لگا ہم تو اس دھماکے سے زخمی بھی ہو گئے ہیں۔ میں اور فرزی اچانک پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک بڑا ہی کرخت اور ناگوار سا قہقہہ سنائی دیا، جیسے وہ سارے بمبو ٹوٹ گئے ہوں جن سے کچلو بنا تھا۔ پھر کچلو کی آواز جو اب کم وزنی لگتی تھی، اس کمرے میں گونجنے لگی جیسے وہاں پھیلے ہوئے دھوئیں کو وہ صاف کر رہی ہو۔

"دیکھو یہ کتنا بڑا شہر ہے۔ یہاں کتنے بڑے بڑے محل ہیں، باغات ہیں، چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ بڑی بڑی سڑکیں ہیں، شاہراہیں ہیں، کتنی پتلی پتلی گلیاں ہیں، روشن بھی، تاریک بھی، گندی بھی۔ کہیں بازار ہی بازار، آدمیوں کی بھیڑ ہی بھیڑ۔ ہر قسم کا آدمی۔ یہاں وہاں تفریح گاہیں ہیں، دارالمطالعے ہیں۔ کوٹھے ہیں، رنڈی خانے، جہاں فنِ رقص و موسیقی نے اپنا عروج دیکھا ہے، زوال دیکھا ہے۔ وہ بڑے بڑے شفاخانے، دواخانے۔ عدالتیں۔ گزشتہ تہذیب کے کھنڈرات، اجڑے باغات، اجڑی کوٹھیاں، رنگین داستانیں۔ پراسرار کہانیاں۔ کتنی تہذیبیں بنیں اور مٹ گئیں۔ کیا

کچھ بن جاتا ہے، اور کیا کچھ اُجڑ جاتا ہے۔ کہیں کچھ رہ جاتا ہے اور کہیں کچھ بھی نہیں۔ ہر نظام حیات نیا ہے، ہر نظام حیات پرانا ہے۔ آدمی کب بدلا ہے، صرف حالات بدلے ہیں۔ چور، ڈاکو، قزاق، قاتل، خونی، زانی، شرفاء، علماء، دانشور، پیشوا، حاکم، غلام، لونڈی، ننگی عورت، ننگا مرد۔ سب زندہ ہیں، ہر زمانے میں، ہر دور میں۔ کسی کردار سے انسان اپنی تہذیب کو محروم نہیں کر سکتا۔ یہ سارے کردار اس کی تہذیب اور اس کی زندگی کے لوازمات ہیں۔ ان میں ایک بھی کردار کم ہو جائے تو یہ زندگی زندگی رہے گی نہ تہذیب تہذیب۔ سب ٹھس ہو کر رہ جائے گا اور آدمی اس دنیا کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ ایک ناقابل برداشت وحشت کا مارا، دیوانہ ہو کر۔"

"ہم اس شہر کو جو ایک مہذب شہر کہتے ہیں یا اس کی تہذیب پر ناز کرتے ہیں وہ بات کہاں جا کر حقیقت بنتی ہے۔ یہ تہذیب تو اس شہر کے ایک مخصوص اور محدود طبقے کا طرز حیات بنتی ہے۔ تہذیب تو دراصل وہ ہوتی ہے جو سارے عوام کی زندگی کے تصور سے بنتی ہے۔ تہذیب تو بنیادی طور پر کردار ہوتی ہے۔ ہمارے پاس اگر کردار کا واقعی کوئی تصور ہے اور ہماری تہذیب اس تصور کے سانچے میں ڈھلی لگتی ہے تو یقیناً ہمارا شہر اور ہم مہذب کہلانے کے مستحق ہیں۔ ورنہ کسی مخصوص طبقے کی خسروی، دارائی و خواجگی یا فوقیت زرداری ہی کو عوام کی وراثت سمجھ کر اس پر ناز کرنا، اس کردار کے تصور کی گراوٹ کا عام نظارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ فوقیت انسان اور ذلت انسان کے امتزاج کے جیتے جاگتے تصور کو تہذیب کا نام دینا ہی تو خود پسند، خود پرست و خود بیں طبقات کی فوقیت کا آسان ترین ذریعہ بنا۔ ایک مجرب نسخۂ عمل۔ ان کے اخلاق و کردار کی گراوٹ کی پردہ پوشی ہمیشہ تہذیب کے اسی تصور نے کی ہے۔ یہ کسی فکرِ بلند و بلیغ یا فلسفہ کی بات نہیں، یہ تو ہر انسان کے دل کی دھڑکن ہے جو کسی اندیشے کی لگائی روک سے پہلے سنائی دیتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اتنی ہی عظیم ہے جتنا کہ انسان۔ اس لیے کہ اس تہذیبی گراوٹ کی نشاندہی ہر فکرِ بلند، ہر بلند مرتبت فلسفے اور ہر مقدس مذہب کا مقصدِ اولین رہی ہے۔"

یہ ساری باتیں کچلو ایک ہی لہجے میں کہے جا رہا تھا۔ اب اس کا سگریٹ ایک بھڑکا ہوا شعلہ لگ رہا تھا۔ فرزی بھی شاید میری طرح اپنے آپ کو ہوا میں معلق محسوس

کر رہا تھا۔ ہم نہ زمیں پر تھے نہ آسماں پر۔

کچلو کی آواز پھر آئی، آواز بڑی اونچی تھی۔ کچھ ایسے الفاظ مجھے وقفے وقفے سے سنائی دینے لگے۔ ہُرمُز خُرمُز، انسان۔ ایک خوبصورت جوان عورت، ننگی لگی ہوئی مجھ سے، شہوت سے بھرپور۔ اُف۔ انسان .... " کچلو کی وہ آواز! اُف میرے کانوں میں تاشے مرفے بج رہے تھے۔ بیانڈ بج رہا تھا۔ میں نے اپنا سگریٹ پھینکا۔ اپنا تین من وزنی سر اٹھا کر فرزی کی طرف دیکھا۔ فرزی ایک ہی جگہ مسلسل دوڑ رہا تھا۔ میں نے بھی دوڑنا شروع کیا۔ کچلو کی آواز کا بیانڈ باجہ۔ میری اور فرزی کی دوڑ اور ہر راستہ بند۔

مجھے ایک بار ایسا محسوس ہوا جیسے میرے کچھ خیال میرے قابو میں ہیں۔ اور وہ کچھ ایسے ہیں " ایک انسانی بدن ہے، مجھ سے بالکل لپٹا ہوا۔ اور اس سے نکلتی ہوئی ایک کڑوی کسیلی بو ہے، شاید اس بدن والے کو میرے بدن سے بھی ایسی ہی بدبو آرہی ہے۔ پھر جیسے ایک صدی گزر گئی، ایک صدی کی طویل خاموشی۔ دو بدن جو ایک دوسرے کو لپیٹے ہوئے تھے کچھ الگ ہونے لگے۔ کچھ روشنی بھی نظر آئی، کچھ ہوا بھی محسوس ہوئی۔ کیا منظر تھا! وہ منظر دھیرے دھیرے نظر کے سامنے ابھرنے لگا۔ کچھ ظاہر بھی ہوجاتا اور غائب بھی۔ پھر واضح ہوا تو یوں ہوا کہ میرے کمرے میں، میں اور فرزی ایک دوسرے سے لگے لگے اس دری پر پڑے ہوئے تھے جو میرے پلنگ کے قریب بے ترتیبی سے فرش پر بچھی تھی۔ پھر ہم ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، جیسے اس وقت ایک نئے انداز سے ہم پھر پیدا ہورہے ہیں۔ جب ہر شئے میری نظروں کے سامنے واضح ہوگئی تو میں نے ایک عجیب آواز میں فرزی سے پوچھا۔

" کچلو کہاں غائب ہوگیا؟"

" کچلو ایک سگریٹ تھا، جل گیا، بجھ گیا۔" فرزی نے جواب دیا۔ " دیکھ سارا دھواں چھٹ رہا ہے۔ دیکھ، مشرق اور مغرب کی جلتی بجھتی روشنیوں میں کبھی اسی طرح یہ دنیا ظہور میں آئی تھی۔"

باب (۲۸)

کچلو سے ملاقات کے بعد فرزی میں ایک بڑی خوشگوار تبدیلی آگئی تھی ۔ بے پناہ خوش دکھائی دینے لگا تھا ۔ دن بھر ہنستا بولتا رہتا ۔ ہر بات اس کی ایک چھیڑ ہوتی ، ایک قہقہہ ہوتی ۔ کالج جانے کی تو جیسے اسے سوجھتی ہی نہیں تھی ۔

صبح جب میں کالج جانے کے لیے تیار ہوتا تو وہ بھی تیار ہو جاتا ، لیکن اچانک مجھ سے کہتا ۔ "ارے بیٹھ ، یہ سگریٹ پی ، پھر چائے پییں گے ، کیا رکھا ہے تیرے کالج میں ۔؟"

میں بھی ف[illegible] کی بات مان لیتا اور وہ پھر ہاسٹل کے میس Mess سے چائے منگواتا اور [illegible] پیتے ہوئے بیٹھے رہتے ۔ کچھ گپ شپ ، کچھ لطیفے ، کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ۔

ایک دن اچانک اس نے کہا ۔ "چل ، چل ، اس اقلیم عدل و انصاف میں چلیں جہاں کا قانون زرداری جدا ہوتا ہے اور قانونِ دلداری جدا ۔ جب وہاں حکم قاتل ہوتا ہے کہ تم قابل گردن زدنی ہو تو ہم گردن جھکا دیتے ہیں اور ہماری گردن پر چھری چلا دی جاتی ہے ۔ حکم ہوتا ہے کہ سر خم کرو کہ سر کو تمہارے قلم ہونا ہے تو سر قلم ہو کر قاتل کے قدموں میں جا گرتا ہے اور انصاف ہو جاتا ہے ۔ چل چلیں اس قتل گاہ کو ۔ اس بازارِ حسن کو جہاں صرف ہم بِک جاتے ہیں بِنا کسی نرخ و لاگت کے ۔ اس قتّالہ کی تو تجھے بہت یاد آتی ہو گی ۔؟

میں نے کہا ۔ "صرف مجھے ؟"

"ہاں صرف تجھے ۔ تجھ پر مرمٹی تھی وہ اس شام ۔ اب تک وہ تیرا انتظار کرتی ہو گی ۔ یہ کوٹھے والی شہزادیاں ، اپنی ناز و ادا میں جتنی کھلی کھلی ہوتی ہیں ، سنا ہے وہ اپنی دھڑکنوں میں اتنی ہی بند بند ہوتی ہیں ۔ ایک گرہ باندھ کر رکھ لیتی ہیں اپنے سینے میں ۔ اندر بھی اور باہر بھی !! " وہ ہنسا ۔

میں نے کہا ۔ "دیکھ تھوڑا تو پیسہ آج میرے پاس ہے ۔"

فرزی نے کہا ۔ "نہیں ، کروڑی مل جی ۔ آج یہ بات نہیں چلے گی ۔ اگر آج ہم وہاں گئے اور وہ نواب بھی آ گیا تو کیا عزت رہ جائے گی ، ہم قارون نما فقیروں کی ؟ کہا تھا

نا نواب نے اس دن " نہیں آج یہ نہیں ہوگا۔ آج کی رات ہمارے نام رہے گی اور کل کی شب آپ کے نام ......"

میں نے کہا۔ " ارے چھوڑ، نوابوں کی ہر بات نوابی جیسی ہوتی ہے، کیا یاد ہوگی اس کو اس کی وہ بات۔ میں سمجھتا ہوں تو دراصل کسی نوابی کے قابل نہیں ہے چل، میرے ساتھ چل۔"

فرزی نے کہا۔ " میں آپ کی فقیری کے سہارے دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ دیکھ، سن، میں اب جا رہا ہوں ایک ایسی جگہ جہاں مجھے آج ایک فرعون کا ناجائز خزانہ ملنے والا ہے، زیر زمین ہے۔ زمین کا سینہ چیر کر نکال لاؤں گا وہ خزانہ تیری دلداری کی خاطر، اور نواب آجائے تو اس کی خاطر داری کے لیے بھی۔"

میرے ایک قہقہے کے ساتھ میری پھٹی پھٹی آنکھیں بھی ہنسنے لگیں۔ وہ بولا۔ " دیکھ میں جا رہا ہوں۔ آج شام تو شاید نہ آسکوں، کل ضرور آجاؤں گا۔ بندوقوں اور توپوں کے دھماکوں اور گھن گرج کے ساتھ۔ جانتا ہے تو بادشاہوں کا خزانہ اسی طرح باجوں گاجوں کے ساتھ لایا جاتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا وہ تیزی سے نکل گیا کمرے سے۔ میں پیچھے بھاگا بھاگا گیا تو وہ پلٹ کر اسی انداز سے ہنستا ہوا ہاتھ ہلانے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ " یقین کر کل تک آجاؤں گا۔" وہ چلا گیا۔

میں سارے ہاسٹل میں اس وقت تنہا تو تھا لیکن فرزی نے جاتے ہوئے، اپنی بڑی ہی کھلی کھلی مسکراہٹ سے یقین دلایا تھا کہ وہ آئے گا اور سامانِ عیش و طرب لے کر آئے گا، اس احساس سے زیادہ خوشبودار احساس یہ تھا کہ فرزی ان دنوں کتنا طرحدار ہوگیا تھا۔ کیسے کیسے شگوفے چھوڑتا تھا۔ کبھی کبھی اپنی زبان و نظر سے کیسے برہنہ برہنہ سا لگتا تھا۔ بے روک، ٹوک کالج کی ایک ایک حسینہ کا نہ صرف سراپا بیان کرتا تھا بلکہ ان کا لبادہ نوچ پھینکتا تھا، کیا ہوگیا تھا اسے، اس کی وہ سنجیدہ نظریں بڑی عیاش قسم کی نظریں لگتی تھیں۔

فرزی کی کہی ہوئی بات پر مجھے کسی قسم کا یقین نہ ہونے کے باوجود، اس کوٹھے والی کے دلفگار تصور نے میرے سینے میں جیسے رات کی آزادیوں کی ایک لہک پیدا

کر دی تھی۔اور اس تصور پر پھر ایکبار دل آہی گیا تھا تو یہ سوچ رہا تھا کہ ہاں ان عیش و طرب کی محفلوں کو تو انسانی تہذیب ہی کا نہیں بلکہ تہذیب سے بھی بلند اور اعلیٰ تصور بنا رہنا چاہیے کہ وہیں تو سب کچھ ملتا ہے، وہیں تو ایک جواں دل کی ساری تمناؤں کی منزل ہوتی ہے، فطری لذتوں سے بھرپور دل کے ولولے کو بھلا کون تھام سکا ہے، روک سکا ہے۔وہ ولولہ تو یہ اظہار ہوتا ہے کہ کوئی دو دھاری کٹار چلے اس پر، کوئی خنجر چلے، اس پر اور اس کا خون قطرہ قطرہ، سارے شباب کی لذت بن کر ٹپکتا رہے۔ ایک آزار بھی رہے اور وہ آزار خوشگوار بھی رہے، آہ آہ بھی اور واہ، واہ بھی۔اُف اس رقص و سرود کی محفلوں میں اس بے دریغ مچل جانے والے حسن و شباب کی آتشیں لہک، رقص کی تھرک میں وہ انگیا کی کسی چُنَت سے دہک اٹھنے والے راز، کمر کی کسی گرہ سے کھل پڑنے والی رنگ برنگی چنگاریاں، جیسے اب وہاں سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ارے ایسے پھٹ پڑنے والے شباب کے مارے دل کو عدالتِ عالیہ میں لے جایئے تو فرشِ عدالت پر وہ ثابت کر دے کہ یہ ہوش و حواس کا خون خرابا کرنے والی محفلوں کا اور یہ نا و نوش، یہ رامش و رنگ کا وجود بھی اتنا ہی جائز ہے جتنا کہ عدالت عالیہ کا وجود۔"

فرزی کے چلے جانے کے بعد میرے دل و جان میں ہونے والی کھل بل کو، بے کلی کو میں اپنے ایسے ہی خیالات سے ہوا دیے جا رہا تھا۔کیا کروں؟ کیا کروں؟ ایسے میں تو وہ رامش گر اپنے چست و تنگ لباس میں، اپنے جسمِ جواں کی آمادگیوں اور عریانیوں کو پھنسائے ہوئے اور ان کو زیادہ سے زیادہ تناؤ دیتے ہوئے، مجھ سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔اب سارے جگ میں ایک تم ہی تو ہو، اور ایک میں ہی تو ہوں آؤ نا اِدھر ...."

کچھ دیر بعد ان موہوم سرگوشیوں کا گمان تک بھی باقی نہیں رہا۔لیکن میں اپنے سارے ہوش و حواس کو ان ہی سرگوشیوں سے قریب لے جانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہی حالتِ سرگوشی باقی رہے، کچھ انداز باقی رہے، میں کچھ سنوں یا نہ سنوں، ان سرگوشیوں کا احساس زندہ رہے، لیکن ایسی غیر واضح سی کیفیت میں تو ہر قسم کے خیال کو حق ہوتا ہے کہ در آئے۔مجھے وہ پڑھنے لکھنے والوں کا ذہن تو جیسے کبھی

ملا ہی نہیں تھا، اس قسم کے خیالات سے بھرا پرا ذہن تو پڑھنے لکھنے والوں کا ذہن نہیں ہوتا۔ ان کا ذہن تو بالکل دوسرا ہی ہوتا ہوگا۔ ان کو تو نہ کوٹھے والیوں کا دھیان ہوتا ہوگا نہ تھیٹر والیوں کا، نہ عشق جیسے خلل دماغ کا کوئی چسکا۔ وہ پڑھنے لکھنے والے تو کوئی دوسری ہی مخلوق ہوتے ہوں گے، لمبوترے چہروں پر اگی ہوئی لمبی لمبی ناک۔ بڑی بڑی اور بار بار نیچے کھسک جانے والی عینک، رات کی خاموشیوں میں، لالٹین کی روشنی میں ایک چھے فٹ لمبی کتاب کے صفحات کو گھور رہے ہیں، جیسے کوئی ناگن پھن کھولے ہوئے کتاب کو گھور رہی ہے۔ جنوں کے بچے۔

فرزی آج لوٹنے والا نہیں تھا۔ اور دھیرے دھیرے شام ہو رہی تھی، میں ہاسٹل سے نکل پڑا اور قریب کی شاہراہ پار کر کے آہستہ آہستہ ایک ایسے مقام تک آگیا جہاں پہونچ کر مجھے خیال آیا کہ آج میرے پاس کچھ پیسے بھی ہیں، کیوں نہ میں قریب کے اس ریستوراں کو چلا جاؤں جہاں میں ایک بار پہلے جا چکا تھا۔

باب (۲۹)

شہر کے بڑے بازار سے پرے، ایک چھوٹے سے خوشگوار ٹیلے پر ایک بڑی ہی جواں سال رستوراں تھی۔ بالکل نئی دلہنوں جیسی چمک دمک، سارا سراپا زرق برق، چھوٹی سی عمارت، لیکن ایک وجاہت لی ہوئی سنئے رنگ، نئی روشنیاں، ہر زاویہ پُرکشش۔ اندر یہاں وہاں ایسے گوشے جن میں کچھ اسرار کے اندیشے۔ وہاں ایک چھوٹا سا پُراَسرار ڈانس ہال تھا۔

پہلی بار جب میں وہاں گیا تھا تو ایک ایسے کیوبیکل میں بیٹھ گیا تھا جہاں سے ڈانس ہال صاف طور پر نظر آتا تھا۔ ڈانس ہال سے کچھ پرے ایک ناولٹی کونٹر پر بیٹھی ہوئی ایک عجیب چمک دمک رکھنے والی ناولٹی بھی نظر آجاتی تھی۔ ایک بڑے مصور کا سب سے حسین تصور .... اس شام مجھے بعد کو معلوم ہوا تھا کہ اس کا نام گِلڈا ہے۔ گِلڈا کا ہر انداز، اس کی ہر ادا دھڑکنوں کو بڑھا دینے والی ایک اجنبیت لیے ہوئی تھی۔ نہ نظروں کو سمجھ میں آئے نہ دل کو سنبھلنے دے۔ پتہ نہیں وہ کہاں کی رہنے والی تھی۔

لگتا تھا، روز اپنی ڈیوٹی کے بعد رستوراں سے نکلتی ہوگی اور پھر آسمان کی نیلاہٹوں میں تحلیل ہوجاتی ہوگی۔ پتہ نہیں وہاں مجھ جیسے فی الفور فنا ہوجانے والے کتنے ہی ازلی ننگے بھوکے اس کی راہ تکتے ہوئے زندگی گزار رہے تھے۔ اس کا قصور کیا تھا؟ انتظار تو زندگی کا مقدر ہے۔ مجھے بھی تو زندگی کی ہر ایسی پرچھائیں کا انتظار تھا کہ یہاں ملے، وہاں ملے، کہیں تو ملے۔ یہ ذہن و دل کی بے ترتیبی میں بکھری ہوئی دھندلی راہیں تھیں۔

لیکن آج وہ لمحہ آہی گیا تھا، اس محفوظ کیوبیکل میں بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا تھا کہ اچانک میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی ہے، اور ہر دھڑکن میں ایک لذت سی محسوس ہونے لگی ہے دیکھا کہ گِلڈا اپنی ساری بے رحم بے نیازیوں کے ساتھ آسمان سے اتر رہی ہے اور رات بھی سولہ سنگھار کیے اپنے جوان لمحات میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ وہ آسمانوں سے اترنے والی ابر سیاہ جیسا ملبوس زیب تن کیے ہوئے ہے، جس پر آسمان کے سچے تارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ایک روشنی پھیل رہی تھی۔ مجھے تو وہ بہت دور لگی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی روشنی تھی۔ وہ کس کو پہچانے گی اور کیوں کسی کو جانے گی۔ وہ رنگ و نور سے بھرا پُرا ماحول مجھے ایسا لگا تھا جیسے ایک ناقابل برداشت، اور ایک ناقابل فہم بوجھ میرے شانوں پر آگرا ہے کہ اگر کل میں یہاں پھر نہ آسکوں تو شاید میری اپنی نظروں میں، میری اپنی زندگی کی ہتک ہوگی کہ یہاں جان کی بازی نہیں لگائی تو کہاں لگاؤ گے۔ جینے کا مطلب معنی تو صرف یہ ہے کہ اپنی آنکھوں میں اپنی وقعت رہے۔ بار بار مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اندر ایک زہریلی مکڑی ہے جو میرے سارے احساسات اور جذبات کے تانے بانے بُن رہی ہے، اور میں اس میں پھنستا جارہا ہوں، ایک مکھی کی طرح .... جال، دلدل کیچڑ۔ اپنے اندر ایک آگ محسوس کر رہا ہوں اور ایک ٹھنڈی سیال چیز کی بوند بوند کو ترس رہا ہوں جو میری اس تشنگی کو کم کرسکے، بجھاسکے۔ لیکن آج مجھے اس آسمانی شکل گِلڈا کی آنکھوں نے بار بار دیکھا ہے، جیسے بار بار کہہ رہی ہے۔ "شراب پیو۔ شراب کے سوا کوئی اور ایسی سیال شئے نہیں ہے جو تمہاری پیاس بجھاسکے۔"

میں اس کی آنکھوں کے دیے ہوئے یقین کو شراب میں گھول کر پینے لگا ہوں تو

یقین ہو رہا ہے کہ گلڈا مجھ سے خوش ہے اور وہ نہیں تو اس کی آنکھیں ضرور مجھے شراب کے گھونٹ اتارتا ہوا دیکھ کر مسکرا پڑتی ہیں۔

بہت ہی مدھم سی روشنی ہے، اور بہت ہی مدھم سی موسیقی۔ ہر طرف اسرار ہی اسرار مہکنے لگے ہیں۔ مجھے اسرار سے بڑا شغف ہے، بس کوئی راز سربستہ ہو اور دھیرے دھیرے مجھ پر اس کا انکشاف ہو، بالکل مدھم روشنی کی طرح، یا مدھم موسیقی کی لَے کی طرح، تو میری جان نکل جاتی ہے۔ کچھ ایسے ہی مہکتے اسرار مجھے گلڈا کی آنکھوں سے زیادہ اس کی باہنوں کے اطراف محسوس ہونے لگے ہیں۔ جیسے ان باہنوں کو بڑی ہی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا ہے میں نے اور اچانک اس کے منہ سے آہ نکل گئی ہے دو مضبوط باہنوں نے بڑے ہی بھرپور انداز میں ان کو جکڑ لیا ہے تو گلڈا کی آنکھوں کی روشنی نرم و ملائم فرش پر ہر طرف پھیلنے لگی ہے اور اس کی دو بھر سانسیں اس ہال میں ہر جگہ محسوس ہونے لگی ہیں۔

ڈانس ہال کا دروازہ دیوار میں اس طرح پیوست ہے کہ دیوار ہی لگتا ہے۔ بس ذرا ایک ڈھکے چھپے بٹن پر انگلی رکھ دو تو آہستہ آہستہ کھلنے لگتا ہے، جیسے دیوار کا ایک تراشیدہ حصہ دیوار بن گیا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی دوسرے رخ سے گہری نیلی روشنی اپنے ساتھ سرخی مائل موسیقی لیے ادھر آجاتی ہے، پھر دروازہ اچانک بند ہو جاتا ہے اور گلڈا کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت وہاں بیٹھے ہوئے سارے لوگ تیزی سے شراب پینے لگ جاتے ہیں اور اس دیوار کو گھورنے لگتے ہیں جس میں وہ دروازہ پیوست ہے۔

"میں بھی زندگی کا انتظار کر رہا ہوں۔" بڑی ہی شستہ انگلش میں اور بڑی ہی گہری آواز میں کہی گئی یہ بات مجھے قریب ہی سنائی دی، لگا اس مدھم سی روشنی سے یہ آواز ابھری ہے۔ میں چونکا اس لیے کہ لہجے سے لگا کہ وہ آواز مجھ سے مخاطب ہے۔ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے ایسا لگا میں کسی چرچ میں بیٹھا ہوا ہوں اور سامنے سرتاپا سفید پوش فرشتہ نما کوئی ہستی بڑی ہی چمکدار نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے اور آنکھوں کی چمک میں بڑی ہی مشفق مسکراہٹ ہے۔ لاغر لاغر سا جسم، گورا گورا۔ آنکھوں پر ہلکے نیلے شیشے۔ بالوں میں یہاں وہاں نتھرا ستھرا برف اور ہلکی چمک۔

چرچ میں رہنے والے یہ مشفق بزرگ جب بھی کسی سے بات کرتے ہیں، بڑی ہی پر سکون بات کرتے ہیں، ایک تسلی سی دیتے ہیں، اور کچھ ایسی ہی پہل کرتے ہیں جیسے دنیا بھر کے دکھ بھرے دلوں کا ان کو علم ہوتا ہے۔ ان کی نیک خوئی ان کو ودیعت کرتی ہے یہ وصف۔ چرچ میں منبر پر کھڑے، وہ فرشتے امن و سکون کا رس ہر درد بھرے یا مجرم دل کی دھڑکنوں میں گھولتے رہتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس ہیجانی کیفیت میں کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے۔ اور میں کچھ پر سکون ہو گیا ہوں .... میں بڑے ہی ادب سے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس بزرگ کو سلام کیا .... انھوں نے بڑے ہی پر سکون لہجے میں کہا۔ "God bless you" ۔

تب میں نے سارے ماحول پر نظر ڈالی تو لگا جیسے وہاں میں اکیلا ہوں اور مجھ سے قریب وہ فرشتہ نما شکل ہے جو اچانک کسی پر نور فضا سے یہاں اتر آئی ہے۔ میرے اندر جو ایک حبس جیسی کیفیت تھی، لگا وہاں ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ہے۔ روح میں جیسے راحت کا احساس گھلنے لگا ہے، میں نے سوچا اس حبس زدہ تہذیب میں جینے والے آدمی کے لیے ایسی ہستیوں کی کتنی ضرورت ہے۔ میں نے اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنا گلاس کچھ پرے رکھ دیا اور ان کی طرف کچھ جھک آیا۔ ویسے شراب کے نشے کے ساتھ گلڈا کے پر اسرار حسن کی لطافت میری رگ رگ میں اتر چکی تھی اور میرے احساسات گلڈا ہی کے ذکر و فکر میں گھل مل رہے تھے۔ پھر بھی اس بزرگ کی شخصیت نے بڑی ہی تیزی سے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مجھے شاید اس لمحے اس بزرگ ہستی ہی کے قرب کی ضرورت تھی۔ ساری ہی زندگی صرف جذبات کی ماری لگتی تھی۔ جذباتی زندگی میں بھلا کہاں کوئی ڈھنگ کا ٹھاو ٹھکانا ملتا ہے، کہیں سر پر کوئی چھپر تک نہیں ملتا۔ سارے دن رات کچھ پر فریب امیدوں اور خواہشوں میں گزرتے رہتے ہیں، ایک یقین دلاتے ہوئے کہ بس اب مقام آیا، تب مقام آیا، بس یہ رہی منزل، وہ رہی منزل۔ بھٹکتے ہوئے دماغ اور بھٹکتے قدموں کی منزل تو وہ ہوتی ہے جس کا نام جستجوئے مسلسل ہوتا ہے، نہ کوئی ٹھاو ٹھکانہ، نہ کوئی پڑاو۔ وہ بزرگ مجھے ایسے ہی ایک سایہ دار پیڑ لگے جو ایسی راہوں پر کہیں مل جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے مقام کرنے کی دعوت دیتا ہے

انھوں نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔" تم کو تو یہاں پہلے بھی دیکھا ہے میں نے۔"

"آپ!" میں چونک گیا۔

"میں یہاں بہت دنوں سے آتا ہوں۔" انھوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور وہاں وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی کرسی ان سے قریب کر لی تو وہ بڑے ہی پرخلوص لہجہ میں بولے۔" اپنا گلاس بھی لے لو۔" میں نے کچھ جھجکتے ہوئے اپنا گلاس بھی لے لیا۔

"آپ کیا پئیں گے؟" میں نے کچھ رک رک کر پوچھا۔

"شراب"۔ انھوں نے بڑے کھلے لہجے میں کہا۔ میرے کانوں میں گرجا گھر کے گھنٹے بج اٹھے۔ مجھے لگا میری رگوں میں شراب کا نشہ اچانک تیز ہو گیا ہے۔ اس بزرگ نے کہا۔" بیرا میرے لیے شراب لا رہا ہے۔ لیکن گِلڈا کے ڈانس ہال میں چلے جانے کے بعد جو تاثر تمہارے چہرے پر میں نے دیکھا، اس نے مجھے تم سے قریب کر دیا۔ تم ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ میرے پاس کوئی روحانی قوت ہے، یا میں کسی کے دل کا حال جان سکتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بالکل سیدھا صاف آدمی ہوں۔

" Drink. You should drink. In your age I did not drink and that I repent today"

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی ان کی شخصیت کا ایک بہت ہی خوشگوار پہلو لگی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ ہنسی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ دو دلوں کو قریب کر دیتی ہے۔

بیرے نے ان کی شراب لا کر رکھ دی۔ انھوں نے بڑی ہی تیزی سے ایک بہت بڑا پیگ بنایا۔ کم پانی ملایا اور دوسرے لمحے مجھ سے کہا۔ God bless you

ہم دونوں نے شراب کے گھونٹ لیے۔ ان کی طرف دیکھا تو لگا وہ بہت تشنہ ہیں، پیاسے ہیں، اور پانی کی طرح شراب پی رہے ہیں۔ گلاس اپنے منہہ سے ہٹا کر میری طرف بہت ہی پرلطف انداز میں دیکھا۔ بولے۔" میری عمر اس وقت ۷۵ سال ہے۔"

گھڑی بھر کے لیے میرا نشہ غائب ہو گیا۔ پورے ہوش و حواس کے ساتھ میں

نے دیکھا۔ "ایک سرسبز پودا۔ چھریرا بدن، بالکل سیدھا، کم قد، چہرے پر کچھ تازہ تازہ سرخی، آنکھوں میں چمک جانی والی نیلی نیلی امنگ جینے کی اور ہونٹوں پر شریر، شریر سی مسکراہٹ۔" دوسرے گھونٹ میں انھوں نے اپنا گلاس خالی کر دیا۔ چہرے پر کچھ ایسا رنگ عود آیا اور آنکھوں میں کچھ اتنی چمک آگئی کہ وہ سچ مچ میرے ہم عمر لگے۔ انھوں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "میں نے اتنی طویل عمر گزاری ہے صرف تزکیۂ نفس کا درس دیتے ہوئے۔ میں نے تزکیۂ نفس کے بارے میں کچھ اتنا پڑھا ہے، اتنا پڑھا ہے کہ آج یہ سارا مضمون میرے لیے بالکل بے معنی ہو گیا ہے۔" انھوں نے پھر اپنے گلاس میں شراب انڈیلی۔

"تو پھر آپ؟؟" میری زبان لڑکھڑائی۔

"مجھے فادر فریرا کہتے ہیں۔ میری زندگی خلقِ خدا کی خدمت میں گزری ہے۔ مجھے ناز ہے کہ میں نے آج تک کسی کو کوئی غلط راہ نہیں بتائی۔ میں اپنے آپ کو ایک سچا پادری سمجھتا ہوں کہ میرے پاس جو بھی آیا، وہ میرے پاس سے ایک سکون کا عطیہ لے گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ مجھے کہیں سکون نہیں ملا۔ سب کو میں نے راہ دکھائی، ان کی منزل کی نشاندہی کی، لیکن اپنے لیے نہ مجھے کوئی راہ ملی نہ کوئی منزل۔ وہ زندگی جو نہ کوئی راہ ہوتی ہے نہ کسی منزل کی نشاندہی کرتی ہے، مجھے بڑی پرسکون لگی۔ اچھی لگی۔ پُرکشش لگی۔ اس راہ پر چلتے ہوئے، میری رگوں میں دوڑنے والے خون کی ساری لذتیں مجھے ملیں۔ لذت کا احساس کتنا پرسکون ہوتا ہے۔! تم بھی پیو نا؟" انھوں نے اپنی بوتل کی شراب میرے گلاس میں ڈال دی اور کہا۔ "پیو، اور میری طرح پیو۔ شراب اور عورت کی صحبت میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں بہت خوش ہو جاتی ہیں اگر دونوں کو تم تیزی سے حلق کے اندر اتار لو۔" انھوں نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کہی جیسے کسی کتاب میں لکھی ہوئی بات پڑھ کر سنا رہے ہیں۔

میں نے ایک گھونٹ میں آدھا گلاس خالی کر دیا۔ پل بھر میں فادر فریرا میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ ان کی جگہ مجھے وہاں فرزی نظر آیا، کچلو نظر آیا، ہاسٹل کا وہ رئیس نظر آیا، رفیع نظر آیا۔ ٹرین والا پروفیسر نظر آیا۔ سوچا وہ پروفیسر جس نے ولایت میں لوزی کے ساتھ ایک طوفانی رات گزاری تھی۔ کتنا بوڑھا تھا وہ، جب وہ مجھے ملا

تھا! جانے کس تیزی سے زندگی کی ہی شراب وہ پیتا رہا تھا۔ مجھے ایک ایسا خیال آیا کہ میں نے شاید ایک بڑی غلطی کر دی تھی اپنی زندگی میں کہ سمی جیسی شراب کو تیزی سے اپنے حلق کے اندر نہیں اتارا تھا۔ لیکن صبا کو اتارا تھا۔ وہ ایسی ہی شراب تھی۔"

رستوران کے کیو بیکل میں مجھ سے قریب پھر مجھے فادر فریرا نظر آ گئے۔ مجھے اپنے خیالات میں کھویا ہوا دیکھا تو وہ میری طرف جھک آئے اور پوچھا۔

"تم گلڈا کے دیوانے ہو نا؟ ہے نا پری زاد؟۔ تمہارے دیوانے پن کی میں قدر کرتا ہوں۔ ایسے ہی ہوشربا حسن پر جان کی بازی لگانا چاہیے۔"

میں نے پھر اپنا گلاس اٹھالیا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا۔

"اتنی تیزی بھی اچھی نہیں۔ دیکھو میں نے سب کو وہی راہ بتائی ہے جس کی اس کو تلاش ہوتی ہے، یہ بات یاد رکھو، یہ میرا بڑا وصف ہے۔ میں نے کسی کو اپنی راہ نہیں بتائی۔ گلڈا کو بھی میں جانتا ہوں۔"

اچانک میرے حلق میں جیسے ایک آگ لگ گئی۔ وہ شاید ایک چیخ تھی، لیکن میں اپنی اس کیفیت کے اظہار میں صرف اتنا کہہ سکا۔ "فادر !!"

"ہاں میں فادر ہوں، تمہارا بھی اور گلڈا کا بھی۔ میں سبھی کا فادر ہوں۔ مجھے سب فادر کہتے ہیں۔ ایک باپ کے سارے فرائض مجھے انجام دینے پڑتے ہیں۔ حالانکہ ایک فادر کے فرائض کی انجام دہی کے لیے فطری جذبہ چاہیے۔ لیکن وہ جذبہ میرے پاس فطری نہیں۔ میں نے خرید لیا ہے، یہ خریدا ہوا جذبہ میرے بہت کام آیا۔ یہ میری زندگی کا وسیلہ ہے۔ میری زندگی کا سہارا ہے۔"

وہ کچھ مسکرا پڑے۔ جیسے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہوں، وہ سب کچھ یہ نہیں ہے جو انھوں نے کہا ہے۔ اچانک انھوں نے آواز لگائی۔ "بیرا" اور مجھ سے کہا۔ "اس طرح ہم کب تک پیتے رہیں گے۔ پیتے ہوئے تو صحیح معنوں میں جینا چاہیے اور جینا کسے کہتے ہیں ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں۔ یہ صبح سے شام کرنا، یہ شام سے صبح کرنا، یہ کاروبار حیات، ان کے بندھے ٹکے قانون اور ایک بندھے ٹکے انداز میں، اس قانون کی خلاف ورزی۔ وہی نیکوکاریاں، وہی بدکاریاں، وہی جرم و سزا، ایک ہی طرح کی زندگی، پھر موت، کسی نے ہم سے کہہ دیا کہ اسے جینا کہتے ہیں، سو ہم سمجھتے ہیں ہم جی رہے ہیں۔

خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ پتہ نہیں ہم کونسی بات صحیح کہتے ہیں اور کونسی غلط۔ لیکن یقین کرو یہ ایک بات تو سچی ہے کہ آج تمہارے ساتھ شراب پی رہا ہوں تو محسوس ہو رہا ہے کہ ایسی شراب میں نے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ واہ !!۔"

بیرا آیا۔ انھوں نے شراب ہم دونوں کے لیے منگوائی اور مجھ سے کہا۔ "گلڈا کے ڈانس ہال سے واپس آنے تک تو تم کو ٹھہرنا ہی ہے، مجھے بھی ٹھہرنا ہے۔ یہ بھی تو ایک سچ ہے نا کہ جب ایک حسین جوانی کچھ بے خبری میں، کسی نشے کے اثر سے، کچھ دلبری کے انداز میں، بہک بہک کر چلتی ہے، لڑکھڑاتی ہے تو واقعی ساری دھرتی ڈولنے لگتی ہے، ایک شوخ و شنگ، حسنِ جواں سال ہی تو ساری دنیا کا حسن ہوتا ہے، باقی سب کچھ بے معنی ہے، بے مقصد ہے۔" بیرا شراب لے آیا۔ دونوں گلاس انھوں نے اپنے قریب کر لیے۔ دونوں میں شراب انڈیلی، میری طرف ایک گلاس بڑھایا اور اپنا گلاس اٹھا کر پتہ نہیں کیوں اچانک انھوں نے کہا۔ "Cheers" چیرز، اور ایک ہی گھونٹ میں انھوں نے اپنا گلاس خالی کر دیا۔ ٹیبل کا سہارا لے کر وہ آہستہ سے کھڑے ہو گئے اور بڑی ہی شفیق مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے کہا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔" وہ وہاں سے اٹھ کر گلڈا کے ڈانس ہال کی طرف بڑے ہی مستعد انداز میں بڑھ گئے۔

شاید وہ ڈانس ہال کا دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

میں نے سوچا یہ انسان کی کس عمر کا روپ ہے؟ "فادر تو بے تکان شراب پیتے ہیں اور .... اور، شاید ...." میں کچھ ڈھنگ سے آگے سوچ نہیں سکا۔ اچانک پتہ نہیں کیوں مجھے ایک عجیب یقین ہونے لگا کہ فادر اب لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ اس یقین کے ساتھ میرا نشہ جیسے اس ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ اترتا ہی چلا گیا۔ اور میرے پیروں میں کچھ ایسی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی جو ایسے نشے کے اترنے پر محسوس ہوتی ہے۔ فادر کی منگائی ہوئی شراب تھی وہاں، اور کافی تھی۔ میں نے پھر پینا شروع کر دیا اور پیتا رہا، دونوں کا۔ گلڈا کا زیادہ اور فادر کا کم انتظار کرتے ہوئے۔

باب (۳۰)

اب میں اپنے کمرے میں صاف ستھرا ہلکا پھلکا لباس پہنے فرزی کے ساتھ اپنے بستر پر بیٹھا ہوا گرم گرم چائے کی چسکیاں لے رہا ہوں۔

فرزی نے کہا۔"ارے بے راہ رو، جانتا ہے تو کل رات دیر گئے تجھے پولیس والوں نے راستے سے اٹھا کر یہاں تک پہونچایا۔ کل رات وارڈن بھی عشق میں تھا۔ سنا ہے کل شام ہی ایک کالی لونڈیا کو اپنی چھوٹی سی کار میں بٹھا لایا تھا اور گھر میں بند ہو گیا تھا، رات وہ زیادہ ہی بند تھا۔ تیرے بھاگ، اسی لیے تو پولیس والے تجھے ہمارے حوالے کر گئے۔ میں تو کل رات ہی لوٹ آیا۔ پولیس والے سیدھے تجھے وارڈن کے پاس لے جا رہے تھے۔ ہم نے کہا۔"نہیں صاحب، یہ بہت ہی شریف لڑکا ہے، آج تک ایک قطرہ شراب اس نے نہیں پی۔ کسی بدمعاش ساتھی نے تھوڑی سی پلادی تو یہ حالت ہو گئی اس کی۔ بھلا اس عمر میں کیا شراب پیے گا یہ؟"

جمعدار خود اس وقت تین چار پیگ چڑھایا ہوا تھا، ہنس کر چپ ہو رہا اور چلا گیا۔ بتا کل رات تو کہاں گیا تھا؟"

"ہیونز Heavens"۔

"بتا کتنے پیسے ہیں تیری جیب میں؟"

"جیب ہی نہیں ہے؟"

فرزی نے کچھ تیز لہجے میں پوچھا۔"ارے مغل اعظم کی اولاد شیخو۔ سچ سچ بتا اتنی ساری شراب کیسے پی ہے تو نے؟ بول، نہیں تو انار کلی کی جگہ تجھے دیوار میں چنوا دوں گا۔"

میں اس کی اس بات پر ہنس پڑا اور بولا۔"آپ آج اکبر جی کے ٹوڈرمل کی آتما بن کر کیوں منڈلا رہے ہیں میرے اطراف؟ اور میرے قریب لیٹ کر کیوں سونگھ رہے ہیں مجھے، جیسے پولیس کا کتّا۔"

اس بات پر فرزی نے میرا گریبان پکڑ لیا اور بولا۔"بول، یہ راز کیا ہے، اتنا سارا پیسہ سنا ہے تو تو وہ بڑے ہوٹل میں جا کر پینے لگا ہے شراب۔؟"

میں نے کہا، بتاتا ہوں، بتاتا ہوں، میرا گریبان چھوڑ۔ اور میرے بستر سے اپنے یہ بدبودار کھر ہٹا۔ توبہ۔"

فرزی نے کہا۔"لے چھوڑ دیا۔ بول یہ سب کیا ہے؟"

"پیارے یہ ساری باتیں مت پوچھ۔" میں نے کہا۔" دیکھ یہی عمر ہوتی ہے نا، یعنی یہی پڑھائی کا زمانہ، جب زندگی ملتی ہے اور جب یہ عمر ختم ہوجاتی ہے تو یہ زمانہ بھی ختم ہوجاتا ہے اور اس زمانے کے ساتھ، زندگی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اور صرف عمر ہی عمر رہ جاتی ہے۔ بار بار میرے اندر کوئی مجھ سے کہتا ہے۔" بس مجھے تھوڑی سی فرصت دِل دیدو، تھوڑی سی شراب اور ایک ماہ لقا کا ساتھ۔ بس اس کے اِدھر یا اُدھر شرق تا غرب کچھ بھی نہیں چاہیے۔ ورنہ یہ تعلیم، یہ تعمیرِ حیات، تخریبِ حیات، یہ فلسفے یہ صرف تصور ہیں، وہ بھی انسان کی بے بسی کے آفریدہ۔ Frustration کی تخلیق ہیں، اور یہ اس عمر کی تخلیق ہیں جس میں زندگی نہیں ہوتی۔

Ah, what a great truth – One crowded hour is much better than thousand years of stale life.

فرزی بولا۔"تیرا نشہ نہیں اترا ابھی۔"

"پیارے" میں نے کہا۔" کل رات مجھے ایک Faithless Father ملا تھا ...... اور وہ ...."

باب (۳۱)

ہاسٹل اور کالج میں رہتے ہوئے صرف یہی جی چاہتا تھا کہ زندگی ساری صرف اسی طرح اور یہیں گزر جائے۔ کیونکہ یہ یقین ہوتا تھا کہ کم از کم اس جہانِ خراب و خوب میں اس ہاسٹل میں گزرنے والی زندگی کے صلے میں کل نہ کوئی جنت ہی ملے گی نہ دوزخ، جیسے یہ زندگی اس دوزخ جنت کے تصور ہی سے آزاد ہے۔ یوں گزر گئے تھے تین، ساڑھے تین سال۔

ہوا کچھ ایسا بھی تھا۔ کالج کی چھٹیاں ہوگئی تھیں، میں نے سوچا تھا ہاسٹل ہی میں رہوں، لیکن اس بار فرزی چلا گیا تھا۔ میس بھی بند ہوچکا تھا۔ سوچا تھا گاؤں چلا

جاؤں، لیکن وہاں سبھی کے گھر پر پڑا ہوا تالا نظر آتا تھا، اور جی بیٹھ جاتا تھا۔ میں نے کسی کو بتائے بنا ایک مقام ڈھونڈھ لیا تھا۔ ایک بڑی ہی پرانی ڈیوڑھی کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور میں وہاں رہنے لگ گیا تھا۔ وہ ایک ویران سا احاطہ تھا اس ڈیوڑھی کا۔ میرے کمرے سے قریب پانی کا ایک چھوٹا سا نل تھا اور اِدھر اُدھر اس ڈیوڑھی سے بھی زیادہ پرانے کچھ پیڑ تھے، نیم اور جامن کے، ایک بڑا سا پیڑ پیپل کا بھی تھا۔ وہ پیڑ بھی ایسے لگتے تھے جیسے انسان اور اس کی آج کی دنیا کو، بلکہ کبھی کبھی ہلکی یا زور سے چلنے والی ہواؤں کو بھی ان سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ جیسے وہ سارے پیڑ اپنی زندگی جی چکے تھے اور نیچے گرتے ہوئے ان کے پتوں میں جو تھوڑی سی زندگی باقی تھی، وہ بھی ان پیڑوں کی قسمت میں نہیں تھی۔

سارا دن اس کمرے میں روشنی رہتی تھی اور رات کے لیے کمرے کی چھت سے لٹکا ہوا ایک زرد زرد روشنی دینے والا بلب تھا، جس کا سوئچ میرے کمرے میں نہیں تھا وہ ہر شام روشن ہو جاتا تھا لیکن کسی بھی وقت بجھایا بھی جاتا تھا۔ میں کچھ دنوں کے لیے اس سیلن زدہ کمرے میں آ گیا تھا صرف اس ارادے سے کہ میں یہاں بہت کچھ پڑھ سکوں۔ میری ہی کتابیں میرے ساتھ تھیں، جو میں نے ایک بوسیدہ قسم کے ٹیبل پر رکھ دی تھیں، ایک انبار تھا کتابوں کا، جس کے اندر چھپے ہوئے جھینگر بار بار باہر آ جاتے اور پھر واپس اس انبار کے نیچے غائب ہو جاتے۔

کچھ دن تو گزر گئے، لیکن ہر وقت یہی خیال آتا تھا کہ کوئی بھی ڈھنگ کا کام کرنے یا پڑھنے لکھنے کے لیے تو دنیا کے وجود کا احساس ضروری ہوتا ہے، اور یہاں تو لگتا تھا جیسے نہ اس کمرے سے دنیا کا کوئی تعلق ہے نہ یہاں رہنے بسنے والے سے۔ اس کے باوجود جب کچھ دن میں نے وہاں گزار لیے تو محسوس ہونے لگا تھا کہ وہاں کی تنہائیوں نے اور خاموشیوں نے مجھے بہت کچھ پڑھایا ہے، سمجھایا ہے، جیسے ایک علم ایسا بھی ہوتا ہے جو کتابیں یا ان میں لکھے ہوئے الفاظ نہیں سکھاتے اور کسی بھی انسان کے ذہن میں پہلے ہی سے وہ سارا علم موجود رہتا ہے جو کالجوں اور مدرسوں میں سکھایا جاتا ہے۔ سوچتا تھا کہ کیا تباہی و بربادی ہے وقت اور زندگی کی کہ اس سارے علم کو پھر سے حاصل کرو جو ذہن و دل میں پہلے ہی سے موجود ہے۔

فرزی نے تو ایک ایسا عشق کر لیا تھا، جو اس کے لیے زندگی کا سچا اور اصل علم بن چکا تھا۔ آخر کوئی علم اپنی انتہا پر جا کر ایک یقین، ایک ایقان، ایک عقیدہ ہی تو بنتا ہے، یہ کالج میں لکھنا پڑھنا تو اس کے لیے ایک ایسی زندگی بن گیا تھا جس کو بہر حال اس جہانِ بے خبر کی ہوائیں ایک منزل تک پہونچا ہی دیتی ہیں اور مجھے تو سمی اپنی اس پھول کی طرح کھلنے والی عمر میں ہی ایک باوقار، مکمل اور سچا علم بن کر ملی تھی جس میں زندگی کی وہ ساری فراست ہوتی ہے، سوجھ بوجھ ہوتی ہے جو دیوانگی سے دست و گریباں رہتی ہے، اس میں معنیٰ و مطلب ہوتے ہیں، جوش و جنوں ہوتا ہے، جیسے اصل حیات وہی سب کچھ ہے۔

یہاں کی تنہائیوں اور خاموشیوں میں سمی مجھے بار بار یاد آتی تھی، جیسے یہاں کے شب و روز ایک ایسا ہی مزاج رکھتے ہیں جس کو صرف سمی جیسی شخصیت سے ایک رغبتِ خاص ہو، ایک الفت ہو۔ ایک نسبت ہو۔ یہی شب و روز کسی بھی لمحے سمی کو میرے اس کمرے تک اپنے جلو میں لے آئیں گے۔ جیسے یہاں گردشِ ایام کو تلاش ہے تو صرف سمی کی۔ اس طرح کی بے کراں تنہائیوں میں اگر کوئی حسین و جمیل مبتلائے عشق دوشیزہ اپنے عاشق سے آ ملے تو ان تنہائیوں سے زیادہ بھری پری زندہ و تابندہ دنیا کونسی ہو سکتی ہے؟

کبھی کبھی پتہ نہیں کیوں اور کیسے، بالکل ہی ایک معلق یا ایک سلسلے سے ٹوٹے ہوئے خیال کی طرح صاحب جنگ ساسانی کا چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا، جو اس ڈیوڑھی کا مالک تھا۔ میرے خیالات کے اس سلسلے کی ایک ٹوٹی ہوئی کڑی بن کر اس چہرے کا میرے سامنے آ جانا بالکل ہی بے محل اور بے معنیٰ لگتا تھا۔

ایک رات کچھ ایسے ہی خیالات میں گزر رہی تھی کہ اچانک کمرے کی روشنی چلی گئی۔ میں نے کمرے کے باہر نظر ڈالی، وہاں ہلکی سی چاندنی نظر آئی اور اس چاندنی میں وہاں پھیلے ہوئے، سوکھے پتوں کے بیچ بنی ہوئی وہ ایک پگڈنڈی نظر آئی جو اس احاطے کی گیٹ تک چلی گئی تھی اور مجھے اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے اس پر چلتی ہوئی سمی آ رہی ہے۔

میرے کمرے کے دروازے کو لگا ہوا ایک چھوٹا سا پودا تھا، جس کو کبھی کبھی

میں پانی دے دیا کرتا تھا، وہ ہرا ابھرا لگتا تھا اور کبھی کبھی اس پر ایک دو پھول بھی کھلے نظر آتے تھے۔ ایک ایسا بے معنی خیال بھی آجاتا کہ چلو میں نے بھی زندگی میں کچھ کام کیا ہے، جس کا نیتجہ یہ دو چار پھول ہیں۔ اس بے معنی خیال کے ساتھ مجھے ایک یقین سا ہونے لگتا کہ دراصل یہ زندگی ہی بے معنی ہے، لیکن اس کو معنی خیز سمجھ کر جینا تو زندگی سے زیادہ انسان کے وجود کو بے معنی اور کھوکھلا بنا دیتا ہے۔

لائیٹ نہیں آئی تھی۔ میں نے مومی شمع جلالی۔ بڑا ہی تنہا محسوس کر رہا تھا میں اس رات اپنے آپ کو۔ آنکھوں سے نیند غائب ہو جائے تو خیالات کا سلسلہ اس طرح قائم ہو جاتا ہے جیسے کوئی گفتگو کر رہا ہے، اس گفتگو میں نہ کسی عالم وجود کا ذکر ہوتا ہے نہ عالم عدم کا، بلکہ کسی تیسرے عالم کا ذکر ہوتا ہے اور اس کے وجود کا یقین بھی ہونے لگتا ہے۔ ایک ایسا بھی ہلکا پھلکا یقین کہ یہ ساری خاموشی دراصل مدفن ہوتی ہے، بھانت بھانت کی آوازوں کا ایک شور و غلغلے کا، اس کو بھی اگر کریدا جائے، یا زمین کی طرح کھودا جائے تو پتہ نہیں زندگی کی کیسی کیسی آوازوں اور ان کے اظہار کے دفینے اور خزینے ہاتھ لگیں گے، باہر نکل پڑیں گے۔ گزرے وقتوں کے انبار میں یا ان کے ملبوں میں پھنسی ہوئی انسانی آہ و بکا کے اور چیخ و پکار کے کتنے ہی مہنجو دارو، ہڑپہ، اہرام مصر، یا انسانوں کی قربان گاہوں کے کھنڈرات دریافت ہونے لگیں گے، اور ان آوازوں کو ہم سن سکیں یا ان کا احساس کر سکیں تو شاید زندگی کے معنی مطلب کی مزید کھوج بے مقصد اور لاحاصل لگے گی۔ جیسے سب کچھ تو کہہ دیا گیا ہے، اور دفن بھی کر دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ نہیں کہا گیا ہے اس کا اظہار کرنے والی آوازوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے کچھ ایسے کوہستانوں کے نیچے دفن کر دیا گیا ہے جن کا اب ان خاموشیوں کی گہرائیوں میں شاید کوئی نشان بھی نہ ملے اور اگر ان آوازوں کا دفینہ کہیں مل جائے تو وہ دریافت بھی صرف کئی بار آزمائی ہوئی زندگی کو بھرپوری شدّ و مد کے ساتھ دہرانے لگ جائے۔ کچھ کچھ بدلے ہوئے ظاہر و باطن کے ساتھ، جن سے انسان اپنی تاریخ میں بار بار شدید اکتاہٹ محسوس کرتا رہا ہے۔

اب میری نظر میں ایک ایسا ہی منظر تھا، جس میں نئے دور کی نئی نسلیں ایک جشن منا رہی تھیں، زندگی سے اکتا کر، زندگی کو ہی ٹھکرانے کا جشن۔

ایک خوشحال اور متمول گھرانے کی بڑی ہی نورس اور نوخیز لڑکی کی برتھ ڈے پارٹی تھی‘ اس کے کالج کے ساتھی لڑکے لڑکیوں کے علاوہ اور کئی نوجوان ساتھی پارٹی میں موجود تھے۔ نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ پڑھے لکھے بھی، ان پڑھ اور کچے پکے بھی، سبھی تھے اور شام کا پورا پورا لطف اٹھانے کے لیے ساری ضروری آسائشوں اور عیاشیوں کے سامان بھی موجود تھے۔ ان سے لطف اٹھانے کی کھلی آزادی بھی تھی۔ بڑا ہی دل موہ لینے والا ماحول تھا۔ زرین اور بے پناہ آرام دہ فرنیچر، ہر قسم کا، چاہے بیٹھیے، لیٹیے، یا لوٹیئے۔ رنگ برنگے پھولوں کی پنکھڑیوں سے سجائے ہوئے قالین، ٹھوکروں سے اڑاتے جاییے پھولوں کے رنگوں کو۔ ایک بڑے ہال میں، در دریچوں پر آتشیں رنگ کے پردے اور ان کے اُڑنے سے آنے والی آتشیں ٹھنڈک‘ عطر و عنبر کے جھونکے اور پھر ہر طرف کھلی کھلی نظروں کی چکاچوند۔ ہر انداز کی مڈبھیڑ جوان جسموں کی، اور ہنسی کھلی کھلی، ایک دوسرے کو قربت کی آزادیاں دیتی ہوئی۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے میخانے، قیمتی تپائیوں پر الف لیلوئی تہذیب کے جام و سبو۔ شاہزادوں، رانیوں، راجکماروں اور پریزادوں کے سے لباس۔ وہ بھی نئی نئی تراش خراش کے، جو جسم کے ان حصوں کو چھپاتے ہیں جن کی نمائش سے کوئی لطف نہیں ملتا۔ سنہرے روپہلے رنگ کی ٹائیٹ پتلون۔ نازک اندام لڑکیوں کے جسم پر کچھ اتنی نیچے نیچے کہ تقریباً نصف کولہوں پر ٹھہری ہوئی۔ اور سامنے کی طرف ناف سے نیچے زِپ وہاں تک کھلی ہوئی جہاں سے ایک وادی میں بنی پگڈنڈی شروع ہوتی ہے اور اوپر رنگ اور مصالحہ سے چمکائے ہوئے اور معطر کیے ہوئے سینوں کے اتار سے ابھار تک ایک راستہ، جہاں سے اترتی ہوئی نظر، دست درازی کی ترغیب ہی نہیں، ہمت بھی دیتی ہے اور بھی کتنے ہی تنگ، چست، ڈھیلے ڈھالے، ہوا میں آہستہ اُڑنے والے لبادے، جو کبھی کچھ اشارے کر دیں، کبھی کچھ۔ اور نظروں میں ایک بے تابیٔ شوق کہ دیکھنے والا ان اشاروں کو سمجھ رہا ہے یا نہیں۔ اور پھر وہاں گائی جانے والی غزلوں کو بِنا سمجھے آہ، واہ کہنے کا اور جھومنے کا لطف تو واقعی شراب پینا سکھا دیتا ہے۔ شراب پینا آسان ہو جاتا ہے۔ پہلی پہلی تلخی پر بھی واہ واہ نکل جاتی ہے زبان سے۔ اس پر غضب یہ کہ ان محفلوں میں گائی جانے والی غزلیں ان نازک جسموں کے کھلے حصّوں

سے جھانکتی ہوئی رنگتوں میں رنگی ہوئیں۔ عشق و وفا کی فرسودہ بات تو اب نشہ اتار دیتی ہے۔ اب تو ہر لفظ میں، ہر شبد میں تھرک ہو، ایک لہر ہو، ٹوٹتی انگڑائی کی اُمنگ ہو، اور رس ہو، ایک ایک دُکھتے انگ کا، وہ بھی محسوس ہوتا ہوا، نظارہ بن کر انگ سے انگ لگ جانے کا .... وہاں ایسی ایک غزل گائی جا رہی تھی۔

تم اپنی زلفوں کو سینے پہ لپنے پھیلانا
پھر لپنے سینے سے اپنا لباس ڈھلکانا

"ہائے، ہائے مار ڈالا۔ کیا کہہ دیا ظالم نے، ہائے۔" سب چیخ رہے ہیں "مکرّر۔ مکرّر پیارے۔ Once more، سیٹیاں۔ شور .... ہائے، تم اپنی زلفوں کو سینے پہ لپنے پھیلانا۔ کراری بات ہے، گاؤ یار گاؤ"

مجھے شراب پلانا تم لپنے ہاتھوں سے
کہ میرے ہاتھوں میں اک دوسرا ہے میخانہ

"ارے توبہ .... کیا بات ہے میرے دلیر دلبر۔ ہم تو مر گئے۔ پھر بولو یار، گاؤنا" شور، سیٹیاں۔

ڈھلک رہا ہے ترا چاندنی سا پیراہن
کٹورے چاند سے بھر کر مجھے پلا دینا

"آہا، یہ چاندنی مجھے اس جام سے پلا دینا۔ ارے کیا بات کہہ دی، دل کھول کر رکھ دیا۔" کہتے ہوئے سب لپنے لپنے ساتھیوں سے لپٹنے لگے اور شراب کے جام چھلکانے لگے۔ کوئی کہنے لگا۔

"کم کم پیو، یہ بتاتے ہوئے پیو کہ پینے سے خوف ہو رہا ہے، ایک ہلکی سی خوشگوار چیخ کے ساتھ پیو اور ساتھی کے قریب ہو کر پیو، پھر کسی گوشے میں کسی کے ساتھ آہ، آہ کرو اور پیو۔" اور پھر یہ فکر کسے کہ آگے کیا کرنا ہے، جو ہوگا سو ہوگا۔ ابھی تو بس آہ، واہ ہو رہی تھی کہ محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ اتنی تیز موسیقی شروع ہو گئی کہ نشہ چڑھے یا نہ چڑھے، مستیوں سے بھرپور لپنے دل کو وہ آزادی دے دو، کہ مستیوں کا اظہار کھلے بندوں ہو۔ یہ پوپ سانگ اور یہ پوپ گیت ....

Take thy share – from me

Dare you guy, strip me off
Dare you guy.
Ah – Ah – Ah..

اس گیت کی لئے پر ایک رقص، ہر لچک، ہر تھرک، ہر حرکت، جسم کا ہر موڑ، ہر قسم کی کود پھاند ہر کسی سے لپٹ جانا، وحشیوں کی طرح چیخ پڑنا .... وہ سب کچھ اس شور آمیز موسیقی اور اس شوریدہ رقص کا لازمی حصہ ہے، وہ سب کچھ موسیقی ہی بنتا ہے، رقص ہی بنتا ہے ۔ پھر جلتی بجھتی روشنیاں اور ہال کے کھلتے بند ہوتے دروازے، ہال سے باہر چھوٹے باغ میں تاریک گوشے، وہاں سبزے کی نرمی، وہاں لوٹ پوٹ ہوجانا تو تہذیب کا (Latest trend) لیٹسٹ ٹرینڈ ہے، موڈرن لائیف سے مکمل واقفیت کی نشانی ہے، اور سرگوشیاں کرو یا چیخ پڑو، وہ سب کچھ اس ماحول کے قانون میں نہ دوش ہے نہ جرم ....

پھر جیسے ہال میں روشنی تیز ہو گئی، موسیقی کی لئے مدھم ہو گئی ۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں ہال میں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے جام اس طرح ٹکرانے لگے کہ ہر جام چھنا چھن ٹوٹنے لگا ۔ ہر جام کی کرچیاں قالین پر بکھرے رنگ برنگے پھولوں کی پنکھڑیوں کو زخمی کرنے لگیں ۔ تب ان ٹوٹے ہوئے پیمانوں کی ان کرچیوں اور پھولوں کی پنکھڑیوں کو نئے نئے وضع قطع کے پاپوش، موسیقی کے سرتال پر اس طرح روندنے لگے تیزی سے کچلنے لگے کہ ایک دوسرا رقص شروع ہو گیا ۔ اور سب ایک ساتھ آہ، آہ کہتے ہوئے رقص کرنے لگے ۔ ایسے میں اچانک ایک نوجوان کی آواز سارے ہال میں گونج گئی ۔

You cranky bores, You guzzling sluts,
You nuts – crazy pokers – Shut all that is open in you – shut it up – you ....

وہ نوجوان اس طرح چیخ رہا تھا، اور جھوم رہا تھا کہ اس کی چیخوں کے ساتھ ساری موسیقی بند ہو گئی ۔ سب اس نوجوان کو اپنے گھیرے میں لینے لگے .... وہ، چیخے جا رہا تھا .... "ارے بزدلو ....You lopsided crooks، بے شرمو ۔" اس کے منہ سے کف نکلنے لگا ۔ وہ چیخنے لگا ۔

You dried – "ارے سالو ..... اری سالیو ..... پھر وہی شراب؟

up lobsters نامردو......... ناعور ... کیوں پیتے ہو شراب، کیوں ؟ کیوں
ان شریف زادیوں کو پلاتے ہو شراب .... ارے کیوں پلاتے ہو۔؟ ارے یہ بھی
کوئی نشہ ہے ؟ تھو ہے تمہاری جوانی پر، تھو ہے تمہاری اس عمر پر۔ تھو .... سنو، سنو
بدبختو میں جارہا ہوں۔ میں جارہا ہوں .... "
اس کو سب روکنے لگے۔
وہ رک گیا اور چیخنے لگا۔ "You rotten crabs" کیوں روکتے ہو
مجھے۔؟ میں جاؤں گا۔ بس ابھی .... تم کو زندگی تو کیا، موت بھی نہیں ملے گی۔
You half - born sex worms ، کچی اولادو۔ نہ زندگی
ملے گی نہ موت .... نہ زندگی نہ موت .... Oh guffah ،
وہ باہر جاتے جاتے پھر رک گیا۔ ایک Oh guffah, send me out
صوفے پر اپنے گندے جوتوں کے ساتھ چڑھ گیا۔ اور چیخنے لگا۔ "سنو، سنو۔ چھوڑو یہ
شراب، یہ دارو۔ یہ ڈھیلے لوگوں کا نشہ ہے۔ بھیڑوں کا نشہ ہے۔ چھوڑو اس کو۔ ارے
یہ شراب پینا اور رنڈیوں کو نچانا تو وہ مردہ زمانے کے مردہ راجہ رجواڑوں کا نشہ ہے
وہ ..... ۔ارے ارے آج کا نشہ تو ہے، یہ شیروں کا نشہ۔ ہاں شیروں کا نشہ۔ یہ
نشہ شیرنی کا مزہ لوٹتا ہے، شیرنی کو شیر کا مزہ لوٹنا سکھاتا ہے، ارے کیا سیکھا ہے تم نے ؟
یہ نشہ تو شیروں کا بھی نہیں، یہ تو ریچھ کا ہے، ریچھ کا۔ guffah ! ۔ وہ زور سے
ہنسا۔ "ارے عورت مرد کا مزہ تو اس میں ہے، یہ ریچھ کے غدود سے بنا ہوا رس۔ ہاں
ہاں ..... " Bear's glands " - " Bear's glands " - وہ اپنی
جیب سے ایک مٹی کی چلم نکال کر جلانے لگا۔ اور پینے لگا۔ چیخا۔ " دم مست قلندر دھر
رگڑا۔ دم مست قلندر دھر رگڑا۔ ہائے۔ " پھر ڈھیر سارا دھنواں چھوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

Yes - I am a rock
Yes, Yes - a rock

گٹھیلے بدن کی ایک لڑکی اس کی طرف لپکی۔ لڑکی کی آنکھیں بالکل بلّی کی
آنکھوں جیسی تھی۔ لڑکی نے اس نوجوان کو صوفے سے نیچے کھینچا اور وہ بھی ایسے بیٹھی
کہ اس نوجوان کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے اپنے زانوں پر بٹھالیا۔ اور بولی۔ " دینا مجھے

..... دینا مجھے یہ نشہ او ریچھ کے بچے ۔" اس سے چلم چھین کر لگایا ایک بھرپور کش اس نے بھی ۔ اس کی بلّی جیسی آنکھیں اور چمک گئیں جیسے دور اندھیرے میں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے ۔ نوجوان کے منہہ پر دھنواں چھوڑتی ہوئی بولی ۔ " Bear's glands ہیں نا ، واہ ، بالکل Rock like .... ہاں وہ اور کیا کہا اس کو تم نے ۔ یعنی وہ ریچھ کے ۔ کیا کہا وہ ریچھ کے ؟"

نوجوان اچھل پڑا اور بولا ۔" ریچھ کے غدود ..... غدود ..... " ۔ لڑکی چیخ پڑی ۔ "اوہ ، گُدود ..... گدُود ..... اردو ہے نا ؟"

لڑکا بولا ۔" ہاں ..... غدود ، اردو ہے ۔ لیکن اردو کے غدود نہیں ، ریچھ کے غدود ۔ ریچھ کے ..... " وہ زور سے ہنسنے لگا ۔ لڑکی تڑاخ سے بولی ۔

" ارے ریچھ کی اولاد سُن ۔ گدُود ، اگر اردو ہے تو گدود پر گجل ہونا چاہیے ۔ گُدود پر گجل ۔"

نوجوان لڑکی کے ہاتھ سے چلم چھین کر پھر کش لگاتے ہوئے چیخا ۔" ارے او غزل گانے والے .....! او غزلیے ..... اب یہ جلے بھنے دل و جگر کی غزلوں کو مار گولی ۔ اب تو بس ، جیسے یہ حسینہ کہہ رہی ہے ، صرف غدود کا ذکر ہونا چاہیے غزل میں ۔ واہ ! جیسے .....

" مِرے غدود تو تیرے ہیں میری جانِ وفا "

" ہائے ، کیا بات ہوئی "

لڑکی چیخ پڑی ۔" یہ ریچھ کے گُدود کی گجل ہے نا ؟ " وہ دیوانہ وار ناچنے لگی ۔ موسیقی شروع ہو گئی ۔ پھر شور مچ گیا ۔ سب رقص کرنے لگے ۔ ایک ہنگامہ برپا تھا ، اچانک وہی نوجوان اس صوفے پر پھر کھڑا ہو گیا ۔ اور چیخنے لگا ۔

" محترم حرام زادو اور محترم حرامزادیو ۔"

اس کی اس بات پر سب زور زور سے چیخنے لگے اور تالیاں بجانے لگے ۔ پھر وہ نوجوان چیخ پڑا ۔

" دیکھو ، تم سب ننگے ہو جاؤ ۔ تم سب ننگے ہو جاؤ ۔ دیکھو کیسا نشہ ہے اس چلم میں ۔ ارے دیوانو ، اصل میں یہاں سب بدل چکا ہے ، کس سے ڈرتے ہو ، کیوں

مرتے ہو جینے کے لیے ۔ ارے یہ ہے میری ناف سے پھوٹنے والی اصلی جڑی بوٹی ، اس کا رس یہ Hashish ۔ یہ اصلی Narcotic ، یہی سب کچھ ہے ، یہی شیروں کا نشہ ہے ۔ ریچھ کے غدود کا رس ، وہ چلم کا ایک کش لینے لگا ۔ کھلے کھلے بدن کی دو تین لڑکیاں اپنے ساتھیوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو گھسیٹتے ہوئے اس طرف لے آئیں اور کہنے لگیں ۔ " ہم کو بھی دو یہ نشہ ، اور ان بچوں کو بھی دو جو ہمارے ساتھ ہیں ۔ بچے ! " وہ ہنسنے لگیں ۔

" ٹھہرو " صوفے پر کھڑے ہوئے نوجوان نے کہا ۔ " دیکھو ڈرنا نہیں ، کبھی نہیں ۔ گورنمنٹ والے چیخ پکار کر رہے ہیں کہ یہ نشہ نئی نسلوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے ۔ یہ سب جھوٹا پروپیگنڈا ہے ۔ یہ سب لوگ ہم سے جلتے ہیں اور ہم کو اپنی سڑی گلی زندگی کی طرف بلا رہے ہیں ۔ وہ گندی نالیوں جیسی زندگی ، وہ کھنڈروں والی زندگی ۔ دیکھو یہ ہم کو ہماری زندگی جینے نہیں دیتے ، ہماری موت مرنے نہیں دیتے ۔ کس نے حق دیا ہے ان کو ہم کو اس طرح زندہ رکھنے کا اور اس طرح مارنے کا ۔ یہ چاہتے ہیں ہم ان کی بسائی ہوئی بستیوں میں جییں ، ان کے سڑیل ہسپتالوں میں مریں ، جن میں ہمیشہ موت کی بدبو پھیلی رہتی ہے ۔ کون جیے گا وہ زندگی ، کون مرے گا وہ موت ؟ ۔ دیکھو یہ ماحول کتنا خوش نما ، رنگین اور خوشبودار ہے ۔ ہائے میں تو اب اس رنگ برنگی زندگی کی طرف جا رہا ہوں جہاں زندگی کی طرح موت بھی ایک خوش رنگ روشنی ہے ، نور ہے ۔ وہ شفق کے تازہ رنگ ۔ آسمانوں کے کناروں پر اُڑنے والی ٹھنڈی اور کتنے ہی رنگوں میں اڑنے والی شفق ، ہائے بے حساب رنگ ۔ میں دھیرے دھیرے ایسا ہی ایک رنگ بن جاتا ہوں ۔ اس شفق سے پھوٹنے والی ایک رنگ بھری کرن بن جاتا ہوں ۔ اور پھر کئی رنگوں میں تبدیل ہو کر سُبک سار مستیوں میں اڑنے لگتا ہوں ۔ اور اس طرح اُڑتے اُڑتے ، زندگی کا ایک لذت بھرا احساس بن کر ان رنگینیوں میں ، ان ٹھنڈی روشنیوں میں ادھر چلا جاتا ہوں ۔ زمین کے آخری کنارے سے آسمان کی یاقوتی روشنیوں میں ۔ بس اوپر ہی اوپر ، ہزاروں میل اس زمین سے دور ۔ اس طرح ایک لذیذ ترین احساس بن کر اس دنیا سے ، اُس دنیا میں چلے جانا آتما کو سدا کی شانتی دیتا ہے ۔ یہی تو نروان ہے ، پیو ، یہ نشہ پیو ۔ "

کتنے ہی حسین اور جوان بدن ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور سب کے سب دھنواں دھار ہو گئے اور سب چیخنے لگے۔" دم مست قلندر دھر رگڑا ..... اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا ہال چپ ہو گیا۔ سارا ماحول چپ، جیسے ہر گوشہ اب ایک سرگوشی ہے۔

باب (۳۲)

وہ سارا منظر آج صاحب جنگ کی کوٹھی کے پچھلے احاطے میں بھی چپ تھا، جیسے اس احاطے کی تنہائیوں پر ایک خیال کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ اس منظر کی چپ ایسی تھی جو شاید خاموشیوں کے سمندروں کی تہہ ہوتی ہو گی۔ اتاہ گہرائیوں میں۔

میرے سامنے وہ مومی شمع ایک ہی انداز میں جل رہی تھی، چپ چاپ۔ وہ بھی اب مجھ سے مخاطب نہیں تھی۔ شاید وقت کے صحرا میں تنہا بہ تقدیر کھڑی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی ہلکی روشنی میں، میری نظر کے سامنے وہ کتابوں کے انبار تھے، ٹیبل پر۔ لیکن ان میں سے کوئی جھینگر باہر جاتا یا اندر آتا نظر نہیں آتا تھا۔ شاید وہ حشرات بھی اب کتابوں کے اندر، ان کے صفحات کی نرمی گرمی میں محو خواب تھے۔ ان کتابوں کے عظیم مصنفوں کے اعلیٰ و ارفع فلسفیانہ یا راہبانہ خیالات کے ساتھ یا تصورات و حقایق کے ساتھ۔ پتہ نہیں کہاں کوئی حقیقت کا دلدادہ تھا اور کہاں کوئی خواب کا مارا .... کتابیں چپ۔ اور وہ نئی نسل کی ہنگامہ خیز شب کا تصور بھی چپ، .... لیکن یکلخت مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ یہ معنوں کی تلاش میں سرگرداں فکرِ تازہ بھی کس بے خبری اور بے ہوشی میں، چند قائم و دائیم فریبوں اور انتہائی ہٹ دھرم تصورات کے جھانسوں میں آجاتی ہے۔ کس آسانی اور کس یقین سے میں نے بھی انتہائی تنگ اور محدود حلقوں میں زندگی کو دیکھا ہے کہ صرف شہروں کے وہ بھی بالکل ہی مخصوص خاندانوں کے اللون تللوں میں پلے ہوئے سپوتوں اور سپتریوں کو میں نے نئی نسل کہہ دیا، نئی نسل مان لیا جو اپنی زندگی میں میسر خوش حالیوں اور آسائشوں سے اوب جاتے ہیں، اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں اور زندگی سے کچھ اور مانگتے ہیں۔ نئی نسل تو شہروں کی چار دیواری کا کوئی اجارہ نہیں ہوتی۔ ان نوخیز جوانوں اور

نورس جوانیوں کو کیا کہوں جو جنگلوں اور کھیتوں میں پل کر زیادہ نئی اور زیادہ ترو تازہ لگتی ہیں۔ اس جواں نسل کی جواں فصل تو بے حساب محنت کرتی ہے مشقت کرتی ہے، ان کو تو کوئی عیش میسر ہوتا ہے نہ کوئی آسائش، کڑی محنت ہی ان کے لیے سب سے بڑی آسائش ہے، جو زندگی کی تعمیر کرتی ہے، لیکن ہم ان کو اپنی نئی نسل مان کر اپنے تازہ بہ تازہ ذوق حیات پر ناز نہیں کرتے۔ اور شہروں کی بے معنی اور بنجر زمین سے اُگنے والی گھاس کو علم و دانش، وقت حاضر کی آگہی، اور روشنی کا نام دے کر اپنی ساری ہی زندگی کو زیادہ بناوٹی یا غیر فطری بنا دیتے ہیں اور ہر موسم میں مایوسیوں کی فصل اگاتے ہیں، ان کا کھلیان کرتے ہیں۔ اور اسی فصل کو ہم اپنی سرسبز و ترو تازہ اور نمائندہ زندگی کہتے ہیں۔ یہی تو ہمیشہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے، یہی سب کچھ تو تاریخ بنتا ہے، تاریخ جو ہر حالت میں آگے بڑھ جانے والا وقت ہوتی ہے۔

وقت تو سب سے بڑا شعبدے باز ہے۔ گرگ باراں دیدہ۔ وقت تو سب سے زیادہ دروغ گو ہے۔ وقت اگر سچ بولتا تو انسان کی اس آس و امید کی عمر اتنی لامتناہی نہیں لگتی، اس طرح وہ صرف لاتعداد مایوسیوں کو جنم دینے والا احساس بنی نہیں رہتی، جن کو شمار کرنے کے لیے صدیاں بھی کافی نہ ہوں۔ لیکن ان صدیوں میں شمار ہونے والے وقت کا نام بھی تو آس تھا، امید تھا۔ تھا ضرور، لیکن فطرت کا ودیعت کیا ہوا یہ وصف خاص بھی تو ان آسمانوں جیسا راز لگتا ہے، گہرے نیلے سمندروں جیسا کہ جس طرح وقت کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹتا، اسی طرح اس نظام حیات میں اس کی آس امید کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا۔ انسانیت کہاں اور کب دیکھے کہ یہ آسمانوں کی لامتناہی بلندیوں جیسا بوجھ اس کے سینے سے کبھی اترے اور وہ ایک بار ایسی کھلی سانس لے سکے کہ اس کو یقین آجائے کہ ہاں ایک سانس تو وہ جی سکی۔ ہاں جی سکی۔ لیکن اس کی یہ آس و امید کیا تھی جو وقت کا سلسلہ بن کر اس کے ساتھ چلی ہے۔ صرف انسانیت کی آس۔ صرف انصاف کی آس۔ انصاف تو ضرور ہوا لیکن انصاف بھی شاید ظلم کی شکل میں ہوا۔ ورنہ ظلم کی صدیوں پرانی مٹی کے نیچے دبی ہوئی انسانیت کی وہ آہ کبھی تو سنائی دیتی، جو سچ مچ انصاف بن جاتی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اس آہ، اس آس کو تو خود تاریخ نے ان تاریک ترین تہہ خانوں میں دفن کر دیا جن کا اتا پتہ شاید اب خود تاریخ

کو بھی معلوم نہیں ۔ اسی لیے شاید آج بھی جب کبھی کسی مجبور و محروم و مظلوم کی آہ ہم کو اپنے اندر سرائیت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو انسان کی ساری تاریخیں یاد آجاتی ہیں، ان کی یا وہ گوئی یاد آجاتی ہے، فلسفوں کی بے معنویت اور ان کی بے حسی یاد آجاتی ہے ۔ انسان شاید اپنے علم پر سب سے زیادہ سرخ رو ہوتا ہے، ناز کرتا ہے، صرف یہ جان کر کہ اس کی بلندیاں، اس کی رفعتیں ہمیشہ عمل کی ارضیت اور سطحیت سے محفوظ رہی ہیں ۔ لیکن آج بھی یہ سچائی اپنے آپ کو منواتی ہے کہ جب تک کسی مجبور و محروم و مظلوم کی آہ باقی ہے، اس وقت تک نہ کوئی انسان، انسان ہے، نہ کوئی تہذیب، تہذیب اور نہ کوئی تاریخ، تاریخ ۔ اور اس وقت تک دنیا کے سب سے بڑے جھوٹ کا نام انسان ہے، سب سے بڑے جھوٹ کا نام تہذیب ہے اور سب سے بڑے فریب کا نام قانون ہے ۔ بس ....

میرے کمرے کی ان تنہائیوں نے اس رات پتہ نہیں کیوں میرے ذہن کو ان خیالات میں جکڑ لیا تھا ۔ مومی شمع، جو ایک ہی انداز میں چپ چاپ جل رہی تھی، اچانک بھڑک اُٹھی، میں مسکرا پڑا ۔ اپنے آپ پر ہنسی آگئی اور یکبارگی میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا .... "کس یُگ کا اِتہاس پڑھ رہے ہو میر جی! کون سنے گا تمہاری یہ بات (بکواس) ۔ بند کرو میر جی، بند کرو میر جی ۔"

کچھ دیر اپنی اس بات سے محظوظ ہوتا رہا ۔ تب رات کی گہرائیوں پر غور کرتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگا ۔ ایسے میں صاحب جنگ ساسانی کے گھر سے رات کی اس خاموشی کو بے دردی سے چیرتی ہوئی، پیانو بجنے کی آواز آئی، اور پھر آتی ہی چلی گئی ۔ اول اول دھیمی دھیمی، پھر زور سے، پھر اچانک اتنی دھیمی کہ جیسے بند ہو گئی ہے

پہلے پہلے مجھے متاثر کر گئی وہ آواز کہ رات کے پچھلے پہر کوٹھی کی چھت سے نکل کر وہ اوپر آسمان کی طرف چلی گئی ۔ مجھے ایسا لگا میں بھی اب کچھ یقین کرنے لگا ہوں اس بات پر جو اپنی جگہ تھی تو معمولی سی، لیکن اس گھر میں قیام کے دوران، میں نے بار بار سنی تھی ۔ پھر بھی اس پر دھیان نہیں دیا تھا ۔ وہ بات جس کو انسان اور انسان کی تہذیب اور اس کے معاشرے نے بار بار دہرا کر بے اثر بنا دیا تھا ۔ اب تو اس کا کوئی مکان یا

مقام اس زمین پر ہی ملتا ہے نہ آسمان کے نیچے۔ کسی دکھ یا خوشی پر ہم بھی تو اس وقت غور کرتے ہیں جب اس کا اظہار ہم کو متاثر کرتا ہے۔ (فن کے وجود کا جواز شاید یہی ہے) لیکن فن ہی اپنے آپ کو بے اثر کرلے تو پھر معاشرے میں کیا کسی دکھ یا کسی خوشی کا احساس۔

جی دہلتا ہے ایک ہلکے سے گمان پر کہ شاید کوئی طائرِ فسق و فجور بھی اس مقام تشکیک پر، پر نہ مار سکے کہ کہیں یہ تصورِ فن یا خود فن کوئی پردہ عنبکوت تو نہیں، جو صاف صاف سمجھ میں آنے والی یا نظر آنے والی بات کو اٹھا دے، سیدھے راستے سے بھٹکا دے۔ یا پھر اس بات کو ہمارے تصورِ فن کے بُنے ہوئے حریر و دیبا میں ملفوف اور محفوظ کر کے رکھ دے، فہم و فراست کے اونچے اونچے ایوانوں میں بنے محرابوں میں۔ اور پھر ایک عام بات کو درباروں یا محلوں کے راز کا درجہ مل جائے۔ اور پھر اس مقام بلند و بلیغ کو زمینی مخلوق دور ہی سے بڑے ہی عجز و احترام کے ساتھ ایک نظر دیکھنے کی کوشش و خواہش کرتی رہے کہ تقدیس تو اسی شئے میں ہوتی ہے جو اس مخلوق کی دسترس سے باہر ہوتی ہے یا اس کی فہم سے دور ہوتی ہے۔

پیانو پر بجنے والی وہ دُھن کچھ تیز ہو گئی۔ اس بار میں نے بھی اپنے آپ کو اس دُھن کی طرف متوجہ پایا۔ اور وہ دُھن بھی شاید اس رات کے ڈھلتے لمحوں میں اپنے آپ کو یکا و تنہا پا کر اپنے آپ میں اپنے تاثر کا اعتماد جگا رہی تھی۔ اور مجھے لگا، میں اب اس دُھن کو اپنے لیے زیادہ متاثر کن سمجھنے لگا ہوں اور اس بات پر آج غور کر رہا ہوں جو میں نے پہلے کئی بار سنی تھی۔

بات بس اتنی سی تھی کہ صاحب جنگ کی سب سے چھوٹی لڑکی جب جوان ہو رہی تھی، تو ...... تو ...... وہ جوانی کی شروعات بھی وقت کا ایک عجیب سرسبز و شاداب موسم ہوتی ہے، ہواؤں کے ساتھ زندگی کا ہر احساس جھومتا جھامتا نظر آتا ہے دن رات ہم آغوش لگتے ہیں اور آپس میں مسلسل اس طرح بے پروا ہو کر چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں کہ کچھ مخدوش لذتیں در آنے لگتی ہیں، ہر سانس میں، ہر احساس میں ...... اور لگتا ہے سارے گلستانوں کے پھول، آسمان کے سارے تارے، ہواؤں کی بے حیائیوں سے مل کر زیادہ مہکنے لگتے ہیں، زیادہ چمکنے لگتے ہیں۔ اس لڑکی کا نام تو کچھ

لمبا چوڑا تھا لیکن مجھے معلوم ہوا تھا وہ کبری ہے۔ جا گیر کے بڑے اسکول کے چھوٹے سے باغ میں کوکتی کوئل کی تلاش میں وہ ذرا اِدھر اُدھر دوڑ گئی تھی تو وہ ایک بے حد پھرتیلا، دھان پان سا چکورا، ہاں اس کو سب چکورا ہی کہتے تھے، دوڑتا ہوا آکر بے تحاشہ اس سے لپٹ گیا تھا۔ وہ بے پناہ پریشان ہو گئی تھی، خوف زدہ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی خوف زدگی میں آسانی سے چھپ جانے والی اس کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی کہ اس کو لپٹ جانے والے کے ہاتھ اس کے اِدھر اُدھر لگ گئے تھے جہاں چکورے کے ہاتھوں کو تو نہیں لیکن اس کو خود ذرا کے ذرا چر کے لگ گئے تھے۔ اس لڑکی نے اپنے آپ کو چکورے کی گرفت سے نہ چھڑانے کے انداز میں چھڑا لیا تھا اور پوچھا تھا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں یہ ؟۔"

"کچھ بھی نہیں۔ میں خود نہیں سمجھ سکا کہ کیوں اس طرح میں آج تم سے لپٹ گیا۔ اور میری ہمت کیسے ہوئی۔؟ تم کتنی بڑی ہو! تم کتنی بڑی ہو !

"میں کہاں بڑی ہوں۔ تم تو مجھ سے زیادہ اونچے ہو، لمبے تڑنگے!"

"اُف، میں کہاں بڑا ہوں۔ میرا قد اگر آسمان تک بھی پہونچ جائے، تو ہو گا کیا؟ میرا سر ٹکرا جائے گا آسمان سے، اس دنیا کی چھت سے، اور میں اپنے سر کی چوٹ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پھر بیٹھ جاؤں گا اس زمین پر۔ میرا یہاں کیا ہے؟ جس زمین پر میں یہاں چلتا پھرتا ہوں، وہ زمین تمہاری ہے۔ جس آسمان تلے رہتا بستا ہوں، وہ آسمان تمہارا ہے، اس سارے باغ میں جو رنگ برنگے پھول کھلے ہیں، وہ سب تمہارے ہیں، اور یہاں جتنے کانٹے میرے پیروں میں چُبھتے ہیں، وہ کانٹے بھی تمہارے ہیں۔ تمہاری جاگیر ہے نا؟۔"

اس جگہ سے اس وقت وہ دونوں باہر نکل آئے تھے، اس طرح جیسے وہ چاروں سمتوں میں چلے جا رہے ہیں۔

چکورا تو صرف گاتا تھا، بے حساب گاتا تھا، شام کے جھٹپٹوں میں گاتا تھا، رات اپنے جھونپڑے میں چراغ جلائے گاتا تھا۔ چراغ بجھا کر اندھیروں میں گاتا تھا۔ وہ تو ہر موسم میں گاتا تھا، چاہے خزاں ہو، چاہے بہار۔ وقت کا پابند تو بڑا سنگیت ہوتا ہو گا۔ لیکن اس کا گاین تو لگتا تھا سے کی سیما کو پار کر چکے گا۔ کیا گاتا تھا وہ، اس عمر میں تو صرف

لپنے من کا، لپنے تن کا گیت گاتا ہوگا کہ وہ دن وہ راتیں ایسی تھیں کہ اس کا من اسکا تن بن رہا تھا، اور اس کا تن اس کا من ۔ وہ اپنی ہی دھن میں گاتا رہتا، اپنی ہی لگن میں گاتا رہتا ۔ وہ ہوتا تو اکیلا ہی لیکن گاتا کچھ اتنی اونچی تان میں جیسے کسی کو سنانے کی اِچھّا ہو اس کی، کہ اسے کوئی سُنے، اس کے سریلے گیت کو سمجھے، پتہ نہیں کجری اس کے دل میں ہوتی یا ذہن میں، وہ جیسے بِرہ گاتا تھا، اور گاتا ہی رہتا، روشنیوں میں، اندھیروں میں، صبحوں کو، شاموں کو ۔

دن بہت کم رہ جاتا، شام پورے اعتماد کے ساتھ لپنے کچے پکے رنگوں کا چھڑکاؤ کرنے لگتی ۔ اور وہ پہاڑی پیڑ بہت اونچے اونچے، جو کجری کی کوٹھی کو لگے لگے کھڑے ہوئے تھے، شام کے ان رنگوں کو ہلکی ہلکی ہوائیں دیتے رہتے ۔ تب ہی اس دیوانے چکورے کا گائن سنائی دینے لگتا ۔ کجری اپنی کوٹھی کی دوسری منزل پر ایک کھڑکی میں کھڑی سوچتی ہوتی کہ وہ گاتا ہے تو اس کی آواز ان لمبے تڑنگے پیڑوں سے لپٹی ہوئی لگتی ہے وہ آواز تو ان اونچے پورے، جھومتے جھامتے پیڑوں ہی کی لگتی ہے ۔ شام بھی لپنے آخری لمحوں سے کچھ پہلے ادھر ادھر بکھر جاتی کہ چکورے کی آواز پر سر دُھن لے تو پھر کچھ چین سے افق کی دوسری طرف ڈھلکے ۔

چکورے کے گیت کے بول کچھ جمے جمائے نہیں لگتے تھے، وہ جو کچھ بھی گاتا تھا، وہ گاؤں کا کچّا گیت لگتا تھا مگر اس کی تان کہیں ٹوٹتی نہیں تھی، سیدھے ان اونچے اونچے پیڑوں کے اوپر چلی جاتی تھی ۔ اور کجری کے پاس آتی تھی تو وہاں ٹھہرتی نہیں تھی، بس اس کی کھڑکی کے اندر تھوڑا جھانکتی، اس کو چھیڑنے کے لیے مسکرا پڑتی اور اوپر چلی جاتی، ان اونچے اونچے پیڑوں کی پھننگ کی طرف ۔

ایک شام جب کجری کی کھڑکی میں لالٹین نظر آئی تھی، تو وہ ان پیڑوں پر چڑھتا ہوا اس کی کھڑکی تک پہونچ گیا تھا، کجری سے ملا تھا اور لالٹین بجھا کر جلدی سے نیچے اتر گیا تھا ۔ پھر ایک شام وہی لالٹین کجری کی کھڑکی میں ڈولتی نظر آئی تھی تو وہ پھر اس کھڑکی کو لگے اس بڑے اونچے پیڑ پر، جو اس کوٹھی کی چھت سے اوپر نکل گیا تھا، چڑھ گیا تھا ۔ کھڑکی تک پہونچ گیا تھا، اندر جھانکا تھا تو کجری نظر نہیں آئی تھی ۔ نِراشا اور گھبراہٹ میں اس بلندی پر وہ لپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا تھا ۔ اور پیڑ سے پِھسل کر، بڑی ہی

مہیب سرسراہٹ کے ساتھ نیچے گر پڑا تھا۔ اس آواز پر کوٹھی کا چوکیدار لالٹین لے کر بھاگا تھا ادھر۔ چکورے کا سر وہاں ایک بڑے سے پتھر پر جا گرا تھا، اور خون کی دھار پھوٹ نکلی تھی۔ کجری قریب قریب نیم مردہ ہو گئی تھی اس خون کی دھار کو دیکھ کر۔ بگھی میں چکورے کو لے کر گاؤں کے ڈاکٹر تک پہونچ گئی تھی۔ لیکن جب ڈاکٹر کے پاس سے وہ لوٹی تھی تو چکورے کا گیت مر چکا تھا۔ اس کا میت جا چکا تھا۔ کجری کی آنکھوں میں موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا۔ پھر دوسرے دن کجری گاؤں میں بدنام ہو گئی تھی۔

اس کے بعد تو کجری کے لیے ہزاروں سال بیت گئے۔ وہ شہر اُٹھ آئی، اور گانے لگی، اپنی ہی دُھن میں۔ اس زمانے میں صاحب جنگ ساسانی بھی چلے گئے اور کجری کے لیے دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ سارے موسم بار بار آئے اور چلے گئے۔ بہار آئی بھی تو پت جھڑ لگی، جیٹھ اشاڑھ آئے بھی تو جلتے جلتے ہی لگے۔ پھر نہ ساون سے کوئی آشا نہ بھادوں سے کوئی آس۔ ساری رُتیں گھاس پھوس کی گھٹڑیاں بن بن کر سے کے گھورے میں جمتی رہیں کہ کبھی ایک چنگاری بھی لگ جائے تو بھک سے سُلگ اٹھیں اور خاکستر ہو جائیں۔

صاحب جنگ کے جانے کے بعد ان کی جگہ ویرانیوں نے لے لی تھی۔ جو ہر طرف پھیلنے لگی تھیں، رات اور دن میں فرق ہی کیا رہ گیا تھا۔ جس طرح چکورا کسی بھی سے گا اٹھتا تھا، کجری کے اطراف پھیلی ہوئی ویرانیاں بھی گا اُٹھتی تھیں، کسی بھی سے۔

کوٹھی میں اور بہت سے سامان کے ساتھ وہ ایک پیانو بھی تھا، جس کو ایک کرسچین مشن کی راہبہ بجاتی تھی۔ اس نے کجری کو مجبور کیا تھا کہ وہ سنگیت سیکھے۔

آج پھر رات کے پچھلے پہر پیانو کی آواز آ رہی تھی، جو کجری اپنے اظہار کے لیے بجا رہی تھی۔ بے حد اونچے سُروں میں، یا بہت ہی دھیمے سُروں میں، جیسے پیانو کی آواز ہی بند ہو گئی ہو، اور کجری کا دل بھی خاموش ہو گیا ہو۔

کجری کو یاد آجاتا تھا اس برف جیسے سفید بالوں والی راہبہ کا پیانو بجانا، کتنے اونچے سُروں میں بجاتے بجاتے وہ اچانک کچھ اتنے نچلے سُروں میں کھو جاتی کہ پیانو کی

سُریلی خاموشی میں اس کے اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دینے لگتی۔ ایک راہبہ کی زندگی کی کبھی نہ ختم ہونے والی پُراسرار تنہائیوں کے سُر بھی کتنے پُراسرار لگتے۔ ایک آہ جیسی بھی کوئی صدا نہیں۔ اپنے کتنے ہی شدید ترین احساسات اور جذبات کو اس نے اپنے پیانو کے نچلے سروں کی طرح، اپنے سینے میں دبائے رکھا تھا اور مسلسل دبائے رکھا تھا۔ جیسے ان کی ہلکی سی آواز بھی اندر ہی اندر دھنستے دھنستے نابود ہو گئی ہو لیکن ایک زرد زرد ساخوف اس کی آنکھوں میں چھلکتا ہوتا کہ اچانک کہیں سارے سُر بے قابو ہو کر اونچے ہی اونچے ہوتے چلے جائیں، جیسے ایک خوفناک آواز ہو اور سارے اسرار کھل جائیں۔ اسی زرد زرد خوف کو وہ اپنی آنکھوں میں چھپانے کی کوشش میں گرد و پیش کو دیکھتی کہ کہیں اس کے سنگیت پر فریفتہ ہو کر کوئی اچانک اس کے قریب نہ آجائے۔ قریب نہ آجائے بہت قریب .... ۔ اس راہبہ کے بارے میں یہی سب کچھ سوچتے ہوئے کجری اپنا ساز بجاتی رہتی۔ اس کا سانس پھول جاتا جیسے وہ بڑا ہی طویل فاصلہ طے کر کے آئی ہو، ۵۰، ۶۰ میل کا فاصلہ۔ لق و دق صحراؤں میں۔ بے آب و گیاہ میدانوں میں۔ ورنہ وہ موتی جیسا پانی اور وہ دور دور تک پھیلا ہوا سنبلیں فرش اور اس میں اُگنے والی نئی نئی کونپلیں اور کہیں کہیں کھلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پھول کس کے لیے تھے۔ آخر کس کے لیے۔؟

اب تو کوٹھی میں ہر طرف سال خوردہ، سوکھے ساکھے پیڑ کھڑے تھے۔ احاطے میں ہر طرف برگ ہائے خشک پھیلے ہوئے تھے اور کجری کی ان ہی پھولی ہوئی سانسوں میں، بے ہنگم سی آوازوں میں، یا بے سُری خاموشیوں میں کوٹھی کی صبح ہو جاتی۔

آج بھی ایسی ہی صبح ہوئی تھی، میری اس رات کی صبح ہو گئی تھی۔ بُجھی بُجھی آنکھوں سے نظر آنے والی بے رنگ روشنی پھیل رہی تھی، بہت ہی ہلکی سی ہوا جو سرد تھی، اور اس میں میرے کمرے کے دروازے کے پاس اس چھوٹے سے پودے پر کھلے ہوئے دو تین پھول لرز رہے تھے۔ اور آج ان سوکھے پتوں کے بیچ بنی ہوئی پگڈنڈی بھی میرے اس احاطے سے نکل کر بہت دور تک جاتی نظر آرہی تھی۔

اس صبح کی بے بصارت آنکھوں میں، میں اپنے آپ کو دیکھ تو نہیں سکتا تھا، لیکن سوچا تھا کہ اب مجھے اس رات کو کہیں دفن کر دینا چاہیے، جس کی صبح اس کی

موت کا یقین دلا چکی تھی۔ اس کی موت کا ثبوت بن چکی تھی۔ مجھے اس رات کے مزار پر ایک کتبہ بھی لگانا چاہیے اور کتبے پر لکھنا چاہیے۔ "یہاں وہ سنگیت دفن ہے جو پہلے انسان کے پہلے احساس کے ساتھ وجود میں آیا تھا۔" اور بھی کئی خیال آئے تھے، جن میں یہ بھی خیال تھا کہ جس دیش نے مجھے پیدا کیا ہے، اس کا تو دھرم ہی سنگیت تھا، اور اگر وہ سنگیت ہی تہذیب بن جاتا تو اس دیش میں کوئی دُکھی تو نہیں ہوتا، بلکہ اس کے دل میں وہ سنگیت ہی ایک درد بن جاتا اور وہی درد ہر دل کا درد بن جاتا۔ سنگیت ہو یا تہذیب، اس کا سچا سُر تو درد ہی ہوتا ہے اور سچا درد تو کبھی کسی کو دُکھی نہیں بناتا، بس انسان بناتا ہے۔

میں نے ساری دنیا سے بے تعلق، اس کمرے کو چھوڑ دینے کی ٹھان لی۔ صاف صاف تو نہیں کہہ سکتا لیکن پتہ نہیں کیوں میرے اندر ہی اندر بھالے سے لگتے جب رات گئے اس صاحب جنگ کے گھر سے پیانو کی آواز آنے لگتی۔ اس کے ایک ایک سُر سے کچھ اتنی ناقابل برداشت اذیت ہوتی کہ مجھے اپنی موت بھلی لگتی۔

باب (۳۳)

میں اپنی موت سے بچ کر پھر ہاسٹل آگیا تھا۔ صاحب جنگ کی کوٹھی کی ویرانیوں میں، میں چکورے کی کجری کو چھوڑ آیا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ چکورا اگر اس کیفیت میں کجری کو دیکھ لیتا تو پتہ نہیں وہ اپنی کتنی بے شمار اموات سے مسلسل لڑتا ہوتا، لڑتا ہوتا۔ صرف اس لیے کہ بس ایک بار، صرف ایک بار وہ ایک ایسا سانس لے سکے کہ اس کے بے جان جسم میں اتنی طاقت کا احساس ہوجائے کہ کجری سے وہ کہہ سکے۔ "میں زندہ ہوں۔" جیسے اتنا کہہ دینے سے کجری ایک پل میں جی اٹھے گی اور گاؤں کے اس اسکول کے پیڑ پر کوکتی کوئل کی طرف دوڑ پڑے گی۔

پتہ نہیں یہ کوئی عشق ہوتا ہے یا دیوانگی یا کچھ اور ...... اُف، یہ کجری کا عشق تھا، یہ فرزی کا عشق تھا ...... ان دنوں میں سوچتا تھا کہ انسان کا کوئی ایسا دیوانہ جذبہ ہی زندگی کی جگہ لے لے اور بے کنار درد و غم کا احساس بن جائے اور ان زینوں اور

آسمانوں کی تنگ دامنی سے بچ کر اس کائنات کی بوسیدہ سرحدوں سے دور دور، پرے پرے، کہیں باقی رہے تو وہ زندگی ہوتا ہوگا یا صرف موت .... ؟ باقی رہنا تو زندہ رہنے کے برابر ہے۔

کیسے گھمسان کے رَن تھے وہ جو میں لڑ رہا تھا ان دنوں، اپنے احساسات کے رَن، اپنے بے معنی جذبات کے رَن۔ ایسی ایک خواہش کیوں جاگتی کہ میں خود کیوں نہ اس رَن میں کام آجاؤں۔

میں نے چکورے کو دیکھا تھا نہ کجری کو۔ لیکن جانے کیسے چکورے کے تصور ہی سے مجھے بے پناہ پیار ہو گیا تھا، اور پھر اس سوال کا جواب مجھے کون دیتا کہ کہیں کجری کے تصور سے مجھے بھی عشق تو نہیں ہو گیا تھا۔ یہ کیا بلا ہے عشق، نہ وجود کی ضرورت، نہ یقینِ وجود کی ضرورت، صرف تصور ہی تصور اور تصور ہی سے عشق۔ کیا یہ اتنا بے ناموس اور اتنا بے حس انسان اتنا بلند مقام انسان بھی بنتا ہوگا؟

میری زندگی کے وہ عجیب دن تھے۔ اتنے ناقابلِ فہم اور ناقابل برداشت دن پہلے میں نے کبھی نہیں گزارے تھے۔ فرزی چھٹیوں سے لوٹا نہیں تھا۔ ساسانی کی کوٹھی کی وحشتوں سے بچ کر میں نکل آیا تھا۔ میرے آس پاس فرزی نہیں تھا تو لگتا تھا میرے پاس دراصل کچھ بھی نہیں ہے، نہ دل میں نہ ذہن میں۔ میں بالکل کھوکھلا سا ہو گیا تھا۔ وہ جب ساتھ ہوتا ہے تو انجانے ہی میں سہی، میرے قدموں پر ہی نہیں، میرے خیالوں پر بھی ایک روک لگا دیتا ہے۔ میں اس کی بے معنی روک ٹوک سے بھی محروم تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ آزادیوں کا لطف بھی اس پر لگی قید سے ملتا ہے۔ کھلے راستے کا تصور تو اس پر لگی رکاوٹوں سے بنتا ہے۔ کسی قید سے محروم، آزادی کا تصور تو جھوٹا ہوتا ہے۔ اگر کوئی آگے بڑھ کر راستہ نہ روکے تو کیا راستہ کیا میدان، سب بے وجود۔

میں ان دنوں تنہا تنہا، جن کیفیتوں سے گزر رہا تھا ان میں یہ خیال بھی آتا کہ کوئی بھی اچھائی اچھائی تو ہوتی ہوگی، لیکن ہم جس بات کو برائی کہتے ہیں، وہ ایک اچھائی نہیں بنتی تو کم از کم ایک ضرورت تو بنتی ہوگی۔ اچھا بننے کے لیے، معاشرے کے قوانین اور اصول تو ضرور معاشرے کے امن اور سکون کے لیے ہوتے ہیں، لیکن وہ

قوانین اور اصول مجھ جیسے کسی ایک انسان کو سکون و آرام کا یقین نہیں دلاتے۔ ان میں تو میرے درد کا کوئی مداوا نہیں ملتا۔ بلکہ ان سے انحراف کبھی کسی غم و اندوہ کی سی کیفیتوں میں بڑا پرسکون لگتا ہے۔ اس میں زندگی کی چمک دمک نظر آتی ہے۔ احساس کی لذت ملتی ہے۔ کل بغاوت کا تصور کتنا بڑا جرم لگتا تھا، لیکن آج اس کا تصور کتنی جانفزا زندگی کا تصور لگتا ہے۔

کتنی بار میں یہی کوشش کرتا کہ میں اس رسٹورنٹ کو چلا جاؤں جہاں مجھے کبھی گلڈا اپنی سنہری، روپہلی جوانی کی پرفریب لغزشوں کے ساتھ نظر آجاتی تھی۔ میں تو ایک وارفتگی کے عالم میں وہاں پہونچ جاتا تھا، اس لیے کہ شاید گلڈا وہاں مل جائے اور فادر فریرا بھی۔ اس بوڑھے کھوسٹ فادر کی وہ گہری نیلی آنکھوں کے تصور سے مجھے کیوں یک گونہ سکون ملنے لگا تھا، اس سوکھے ساکھے چھوٹے سے پیڑ کو دیکھنے کی خواہش اتنی شدید کیوں ہو گئی تھی، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میری زندگی کا وہ خلا جس میں موت کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں، صرف فادر فریرا کی شخصیت پُر کر سکتی تھی اسے پاٹ دے سکتی تھی۔ شاید فادر مجھے کسی محفوظ لمحے کے پرسکون خول میں چھپا دیں اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہیں۔ اور وہ مسکراہٹ مجھے بحرِ حیات کے اس کامیاب شناور سے اتنا قریب کر دے کہ میرے جام میں لہر بن کر اٹھنے والی شراب بار بار مجھے یقین دلائے کہ یہ ہے تمہارا کنارا، اتر پڑو۔ آگے زمین کا سکون ہے۔

لیکن میں کیوں بار بار اپنے سامنے نظر آنے والی زندگی کی اتنی ساری لمبی رہ گزر کو چھوڑ کر بس ایک ہی تصور کا ہو گیا تھا، جس کی نہ کوئی قیمت تھی نہ کوئی لا قیمت صِفت۔

اُن خیالات نے ان دُکھ بھری کیفیتوں کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے میں شاید میری مدد کی۔ میں روز کالج کو جاتا، لیکن کلاس کو نہیں جاتا۔ بس ایک بے خبری کے عالم میں ایک دو چکر لیڈیز روم کے لگا لیتا۔ جیسے وہاں مجھے کچھ مل جائے گا۔ اپنے دن رات گزارنے کے لیے۔ ایک امید بھی تو زندگی کے راستے پر لگی ہوئی ایک روک ہوتی ہے، اور آدمی ایسے میں ذرا سنبھل سنبھل کر، رُک رُک کر چلتا ہے، کہ اس امید کو سنبھال کر لے چلے۔ اس طرح ایک صبح جب میں لیڈیز روم تک پہونچا تو

دیکھا کہ وارانڈے میں تین چار بالکل اجنبی وضع قطع والیاں کھڑی ہیں۔ اتنی عجیب کہ لگا ان کے دیش کو کسی خبطی سیاح نے ابھی تک دریافت نہیں کیا ہے اور انسان کی تاریخ میں ان کے دیش کا کوئی ذکر ہے نہ جغرافیہ میں اس کا محل وقوع، لیکن ان سب نے مجھے بھی بہت گھور گھور کے دیکھا، جیسے وہ بھی سمجھنا چاہتی ہیں کہ شاید میرا دیش بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے، توبہ! ایسے میں وہاں سے لوٹ رہا تھا کہ وہ نظر پڑی، شاید دنیا کے کسی حسین ترین دیش والی۔ وہ دیش جو رنگ برنگے آسمانوں کے سائے تلے، اس زمین پر ہوتا ہوگا، جس کے سارے موسم صرف بہار بن کر آتے ہوں گے۔

وہاں بجلیاں وِجلیاں ایسی نہیں چمکتی ہوں گی جیسے اس کی نظر چمک گئی تھی۔ اس وقت — اس کا سارا وجود دمک اٹھا تھا۔

سنا تھا کہ اس کو کالج میں آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں، لیکن دھوم تھی اس کے مغربی ورثے کی، یعنی وہ تو ولایت میں پڑھتی رہی تھی اور اب آئی تھی یہاں۔ ماں تھی سوئیزرلینڈ کی اور باپ اس شہرِ قدیم کا۔ جب یہاں آئی تھی تو ایسے طمطراق سے جیسے وہی سب کچھ تھی۔ اچھی بھی، بری بھی، اور نئی بھی۔ بڑی ہی لیٹیسٹ اپنے ہر رنگ میں۔ رفتار ہزار طوفانوں کی سی۔ Blitzkrieg یا قتل عام کرنے والا نادرشاہی حملہ۔ کالج کے کرتا دھرتا لوگ کچھ اس طرح مان گئے تھے اس کو جیسے اسٹوڈنٹس یونین کے لیے موزوں ترین شخصیت مل گئی تھی۔

میری قسمت کہ میں اس دن لیڈیز روم کی دہلیز کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے وہ سارے رُوپ ایک ہی نظر میں دیکھ لیے تھے میں نے۔ اس کے ساتھ اس کے چہرے کا جلال اور اس کی تابانی بھی، میں نے سوچا تھا کہ کبھی کسی طوفانی موسم میں خس و خاشاک کے ڈھیر پر بھی بجلیاں گرتی ہیں۔ سوچا تھا کس کی دہائی دوں، حُسن کے دیوتا کی یا عشق کے دیوتا کی۔ وصل کے دیوتا کی یا ہجر کے دیوتا کی۔ کیسے پیارے زمانے تھے وہ جن کو ہم دورِ جہالت کہتے ہیں، جب کہ ہر جذبے کا اور ہر احساس کا، اور ہر قسم کی تشنگی اور گرسنگی کا دیوتا ہوا کرتا تھا، عشق کرنا ہو تو دیوتا کا سایہ، شفقت میسر، حسن پر مرمٹنا ہو تو دیوتا کی شکتی کا یقین، وصل کے دیوتا کا تو ایک تیر تھا، لذت بھرے زہر میں

بُجھا ہوا، لگ جاتا سینے پر تو رات کروڑوں رنگوں میں بٹ جاتی تھی ۔ شبِ وصال تو وقت اور زندگی کا نقطہ عروج ہوتی ہے ۔ اور ہجر و فراق کا دیوتا بھی تو اپنا ہی ہوتا ۔ اس کے پاؤں دھولو ، پوترندی کے ٹھنڈے پانی سے تو ہجر کی اذیتیں ، وصل کی لذتوں میں بدل جاتی تھیں ۔ اسی لیے تو انسان خداؤں کے وجود کا اتنا قائل ہو گیا تھا کہ اگر اسے خدائی کا وجود نہ ملتا تو وہ صرف وقت کا ایک انجر پنجر ڈھانچہ بن جاتا ۔

اس صبح میں خود ایک سمجھ میں نہ آنے والی روشنی اور اندھیرے کے بیچ کی دھار پر چلتا ہوا ہاسٹل لوٹ آیا تھا ۔

باب (۳۴)

دوسری صبح میں کالج کو ٹھیک وقت پر پہونچا ۔ اور آہستہ آہستہ لیڈیز روم کی طرف چل دیا ۔ صبح کی روشنیوں میں ، مجھ سے کچھ دور وہی شمشیر نیم کش چمک اٹھی ، نیم عریاں ۔ اس دن کس جاہ و حشم اور قہر گردوں کی شکل میں آئی تھی وہ ۔ مرحوم مصر کی زندہ قلوپطرہ ۔ وہاں کتنے ہی کٹے پھٹے بدن ادھر ادھر نظر آئے مجھے ، نادان نوجوانوں کے ۔ میری شامت جو آئی تو چوری سے دو قدم آگے بڑھا کر ایک نظر دیکھا اس کی طرف تو اس نے یوں دیکھا جیسے میرا مذاق اڑا رہی ہے ، اور اب میرے پرخچے اڑنے والے ہیں ۔ میں نے پھر ایک عجیب زخم کی لذت کے ساتھ دیکھا اسے تو اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں تو بازار مصر میں نیلام ہو رہا ہوں ، ایک غلام ، اور اس قلوپطرہ نے آخری بولی لگادی ہے ۔ اور میں یک شبی حیاتِ لایموت کے لیے موت کے حضور سرنگوں ہوں ۔ میں نے پھر اسی غلام کی جرأتِ بے مثال کے ساتھ دیکھا اسے ، تو اس نے اس طرح دیکھا جیسے وہ مجھ پر غور کر رہی ہے اور جیسے اس کے دل میں نہ سہی ، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک جذبۂ رحم چمک گیا ہے ۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک بجلی سی چمک گئی جیسے ایک سوال ہو اس کی آنکھوں میں ۔ "آخر کون ہے یہ ناہنجار ؟" ۔

میں شاید اپنے اندر ہی اندر مسکرا پڑا یہ سوچتے ہوئے کہ حسن کی آنکھوں میں

یہی سوال تو ایک در دریچہ بن جاتا ہے، جو کھل جائے تو حسن کے سارے وجود میں غور و فکر کا انداز پیدا کر دیتا ہے۔ہاں۔"

اچانک بے حساب سیاہ و سفید غلط فہمیوں کی یلغار ہو گئی مجھ پر۔ایک گھڑی میں مرجاتا اور دوسری گھڑی میں جی جاتا۔آخر ان کفر بھری آنکھوں میں ایمان کے وجود کا یقین کیسے ہو؟۔نہ میں شہزادۂ گلفام نہ حسینوں کی آنکھوں میں چبھنے والا کوئی خوبرو نوجوان۔ان دنوں تو میں خود اپنی ان کیفیتوں میں دھیرے دھیرے ایک ملنگ فقیر بنا جا رہا تھا۔تھوڑی سی ڈاڑھی اور آنکھوں میں تھوڑی سی بے خبری، اور تھوڑا سا جلال پھر بھی اس نے مجھ پر غور کیا۔شاید اس فقیر کی جرأت رندانہ پر۔

اس کے بعد دو تین دن تک وہ ٹھیک مقررہ وقت پر اسی گیٹ سے کالج میں داخل ہوتی۔میں تو وہیں کہیں فرش پر پڑا نظر آجاتا اسے۔صورت ہی ایسی بن گئی تھی۔

ایک رات میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہاں میں ضرور ایک عشق سرفروش میں مبتلا ہو رہا ہوں، وہ بھی ان زہر بھری قہر بھری آنکھوں کے عشق میں، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔اس کا نام کلثوم تھا۔سوچتا تھا کہ یہ سالا عشق بھی سوچ بچار کی قواعد پریڈ بہت کراتا ہے۔گردن دبوچ کر سمندر کی گہرائیوں تک ڈبو دیتا ہے اور پھر اُچھال دیتا ہے۔کچھ ایسی ہی کیفیت میں، میں نے یکلخت ایک چھوٹے سے خوبصورت کاغذ پر اپنا بڑا ہی مختصر تعارف لکھا، لیکن کسی خوف نے مجھے اپنا نام لکھنے سے روکے رکھا۔میں نے انتہا ہی لکھا کہ جواب الفاظ میں نہ ہی لکھیے تو مہربانی۔یہ میری منت ہے آپ سے۔بس میری اس تحریر پر (✓) ایسا نشان لگا دیجئے یا پھر (✕) ایسا۔گلڈا جیسی ایک بین الاقوامی خوشبو والا سنٹ تھا میرے پاس، تکیے کے نیچے۔اس لفافے کو اس سنٹ سے تھوڑا مہکا دیا، اور ایک ایسی کتاب منتخب کی جس کے صفحات اس انداز سے سِلے ہوئے ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ہلکی سی بھی شئے رکھ دو تو کھل کر اس شئے کو سامنے کر دیں۔لفافہ اس کتاب کے بیچوں بیچ رکھ دیا اور اس رات کے ہر رُخ کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ایک ہلکی سی خوش فہمی کا بھی نشان نہیں تھا اس رات کے چہرے پر۔ہر طرف اندیشے ہی اندیشے تھے، اور اندیشوں کی خاردار جھاڑیوں میں دھڑکنیں چوکڑیاں بھر رہی تھیں۔دوسری صبح پتہ نہیں کتنی بے روح

ہمتّوں کے سہارے کالج پہونچ گیا۔ وہ ٹھیک اپنے مقررہ وقت پر کالج میں داخل ہوئی اس کے راستے پر تو میں ہر طرف بکھرا پڑا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے اس طرح دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہو "زندہ ہو یا مردہ؟" اور چلی گئی سیدھے لیڈیز روم کی طرف۔ لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی نظروں کے اس سوال میں تو ضرور اس تعلق کا اظہار تھا، جو اس کو مجھ سے ہو گا۔

کالج شروع ہو گیا، لیکن میں کالج کے ایک کوریڈور میں اکیلا کھڑا رہا، اس یقین کے ساتھ کہ لیڈیز روم کی آیا نظر آجائے گی۔ وہاں چھوٹے موٹے جھکڑ تو آئے جن میں بازار میں رسوائی اور سڑکوں پر پٹوائی کے امکانات مجھ سے ٹکرا ٹکرا کر گزر گئے۔ وہ چھوٹے موٹے قد کی کالی کلوٹی کالج کی آیا، میرے قریب ہی سے گزرتی ہوئی نظر آئی۔ وہ تو مجھے اس وقت مجسم عجز و انکسار اور معاملہ فہمی کے تجربے کا پر خلوص پیکر لگی۔ دل نوازوں کا بلکہ غریب نوازوں کا سا انداز لیے ہوئے، وہ میرے قریب آگئی۔ میں نے ضرور بے پناہ عاجزی اور وقت سے پہلے احسان مند ہو جانے کے انداز میں اس سے کچھ کہا۔ اور اس کے ہاتھ میں کتاب تھمادی اور منزل کی نشاندہی کر دی۔ وہ پلٹ گئی لیڈیز روم کی طرف۔ میں اس کوریڈور میں اس طرح بے دست و پا کھڑا ہوا پایا گیا کہ ایک ہجوم تھا کہ کالج کے ہر رخ سے مجھ جیسے عجوبۂ روزگار کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑ رہا ہے۔ حالانکہ کالج کی ہر کلاس میں اس وقت پڑھائی ہو رہی تھی۔ صبح کے سیشن کا دوسرا پیریڈ چل رہا تھا اور پیریڈ کو ختم ہونے میں ابھی دیر تھی، پھر بھی ....

کچھ ایسا ہوا کہ کالج کی چھت سے پہلے آسمان گر پڑا مجھ پر۔ سامنے غیر معمولی دھندلکوں میں آیا کھڑی تھی۔ اس کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ اس نے جیسے آخری ہچکی لی اور مجھے کچھ سنائی دیا۔ "بی بی آپ کو بلاتے ہیں۔ ابھی وہ اکیلی ہیں۔"

میں نے شاید اس آیا سے التجا کی۔ اس کے سامنے گڑگڑایا کہ وہ جو میرے پاؤں وہاں فرش میں گڑ گئے ہیں، ان کو نکالنے میں وہ میری مدد کرے۔ لیکن آیا چلی گئی۔ اب میری نظروں میں وہاں کہاں کوئی کالج تھا، وہاں دور تک پھیلا ہوا ایک قبرستان نما میدان تھا، اور اس میں صرف ایک قبر کھدی ہوئی تھی، جس میں میں دفن ہونے والا تھا۔ وہی آیا پھر ادھر لوٹتی ہوئی نظر آئی۔ میں اس کے قریب ہو گیا۔ جیب میں جتنا بھی

پیسہ تھا، اس کے قدموں میں ڈال دیا، اور اس کے ساتھ ہو گیا۔ لیڈیز روم کے دروازے پر خود آپا نے مجھے اندر دھکیل دیا۔ وہ بولی "اندر جایئے"۔ وہ واپس چلی گئی اب میں تھا اور تہہ تیغ میری گردن۔ وہ تو شہہ نشین پر ملکۂ قہر و جبروت بنی بیٹھی تھی۔ آواز آئی۔

"آپ نے کبھی جوتے کھائے ہیں؟ نہیں نا؟ اتنے پڑیں گے جوتے کہ آپ کا سر جوتا بن جائے۔ سمجھے۔؟ یہ لے لو تمہاری کتاب۔ اور تمہارا یہ خط میں اپنے پاس رکھ رہی ہوں۔"

اس کی اس بات پر بنا کچھ سوچے سمجھے میں نے اس کی طرف دیکھ لیا۔ جانے کیا تھا، اس کے سراپے میں، اس کے چہرے کے تاثر میں یا اس کی ان آنکھوں میں۔ مجھے وہ پوری کی پوری نظر آئی، سرتاپا۔ اور میرا خوف دھیرے دھیرے میری ایڑھیوں سے گزر کر فرش پر بہنے لگا۔ میں نے اپنی کتاب لے لی۔

تب اس نے کہا۔ "نام نہیں لکھا خط میں، عقل کے تو بڑے سمارٹ لگتے ہے۔ بالغ نظر۔ اب بتاؤ نام۔" میں نے اپنا نام بتادیا۔ وہ بولی۔

"اتنی اونچی کلاس میں پڑھتے ہو، اچھا پڑھتے ہو۔ تب بھی یہ بدروئی۔؟ کبھی کوئی اسکالرشپ ملا ہے تم کو؟"

میرے نہ کہنے پر کہا۔ "جاؤ، کل ایک درخواست لکھ لانا، سکالرشپ کے لیے، ولی میڈم کو جانتے ہو نا؟ وہی انچارج ہیں سکالرشپ کمیٹی کی۔ کل اسی وقت آنا۔ میں اکیلی ملوں گی" اب اس کے ہونٹوں پر پوری قوت سے روکی ہوئی ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی، یا پھر میرے اندر خوش فہمیوں کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

دو ہی ہفتوں میں میرا اسکالرشپ منظور ہو گیا۔ میں کلثوم کا شکریہ ادا کرنے کے لیے پھر اسی وقت پر لیڈیز روم پہونچا، جب وہ اکیلی تھی۔ اس بار مجھ سے مل کر وہ خوش لگی۔ اس دن اس نے مجھ سے خوب خوب ہنس کر باتیں کیں۔ وہ جب ہنس رہی تھی، میں اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کو دیر تک دیکھ سکتا ہوں۔ دور تک دیکھ سکتا ہوں۔ میری بہکی ہوئی بے راہ نظروں کو تو وہ بہت حسین لگی۔ پھر خیال

آیا۔ " حسین " تو ایک لفظ ہے، لیکن اس لفظ کو لکھنے والے کا ہر احساس عطر بیز ہو جاتا ہے، ہر سانس مشک و عنبر اور وہ خود ایک نادر الوجود تصور شباب کی تلاش مسلسل میں کھو جاتا ہے۔ لیکن وائے رے قسمت، مقصد تلاش مل بھی جائے تو تلاش جاری رہتی ہے کہ شاید ....

کلثوم ہنس ہنس کر جب مجھے اپنی قربت کا احساس دلا رہی تھی۔ اس وقت میری سانسیں بھی عطر بیز لگ رہی تھیں۔ اس کے رخساروں کی شفق میں وہ دمک تھی جو پہاڑی پر بنی حویلیوں یا ایوانوں کے در و بام پر سر شام کچھ اس طرح نظر آجاتی ہے جیسے وہاں وجود ہوتا ہے ان سرخیوں کو لو دینے والی شمع شباب کا۔ مجھ جیسے آوارہ منش نادار درویش عالم کے لیے وہ منظر تو فردوسی ہوتے ہیں۔ ناقابل پیمائش دوریاں ہوتی ہیں نیچ میں حائل، بے حساب محرومیوں کی دوریاں، احساس جبر کی بنائی ہوئی دوریاں۔ سب سے زیادہ بے رحم تو وہ ایک سنگ سرد جیسی شکل باجمال و جلال ہوتی ہے جس کو صرف تصور میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن بے مہریٔ ازل تو یہ ہے کہ وہ شکل ہر گھڑی نظروں کے سامنے ہوتی ہے کہ روح جلتی رہے، اور جلاپاتی رہے۔

کلثوم شہر کی ایک پر فضا، پہاڑی پر بنی ایک حویلی سے اتر کر آتی تھی کالج کو، اس کے رخساروں کی سرخی اور اس کی آنکھوں کی چمک ان اونچے بام و در کی بات کرتی تھی، اب جو وہ مجھ سے اس قدر قریب تھی اور اس کمرے میں میرے ساتھ اکیلی تھی، اس کے ہلکے سیاہ ابروؤں کی ہلکی ہلکی جنبش میں ایک وقار، ایک تکبر کا اظہار تھا۔ میں کس والہانہ انداز سے اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا، جب وہ اپنی نظریں نیچی کیے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ اس کی جھکی ہوئی پلکوں میں جو ایک انداز تمکنت ہے، وہ شاید قدرت اس مخلوق کو عطا کرتی ہے جس کو بعض فلسفوں نے فوق البشری کا شرف بخشا ہے، پھر یہ خیال بھی آیا کہ کیا واقعی فلسفوں میں کہی ہوئی باتوں میں کوئی سچائی بھی ہوتی ہے؟ یہ گمان بھی ہوا کہ یہ فلسفے بھی شاید کچھ ایسے ہی بے خانماں لمحات کی تخلیق ہوتے ہوں گے جن سے میں اس وقت گزر رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنی جھکی پلکیں اس طرح اٹھائیں جیسے کسی خیال سے چونک پڑی ہو۔ یا میری اس کیفیت کو دیکھ کر سنبھل گئی ہو۔ کہنے لگی۔ " دیکھو، ولی میڈم سے

بھی مل لینا۔ آج نہیں کل۔ تین بجے، وہ اپنے روم میں اکیلی ہوتی ہیں، ان سے Thanks کہنا۔ خوب خوب دلچسپی لی انھوں نے تمہارے کیس میں ...."

پھر کلثوم نے اس کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے آسمان کی طرف دیکھا، بڑے ہی کھوئے ہوئے انداز میں اور کچھ دبے لہجے میں کہا۔ "فرزی تو تمہارا بہت دوست ہے نا، ہمیشہ ساتھ رہتا ہے نا تمہارے۔ کہاں چلا گیا ہے وہ؟ کبھی اسے بھی لے آؤ ساتھ۔ ہاں۔"

اچانک میرے اندر ہی اندر ایک چیخ گونج گئی، جس کا گمان بھی کلثوم کو نہیں ہو سکا۔ لیکن اس چیخ کی گونج میرے ہی ذہن کو برماتی رہی کچھ دیر کہ کلثوم کے لہجے میں یہ کس قسم کے تعلق کا اظہار ہے، فرزی کے لیے؟ وہ فرزی کو کتنا چاہتی ہے، فرزی کی اس مختصر داستان کا کوئی پراسرار باب کلثوم کے اس تعلق سے تو نہیں کھلتا؟ کلثوم کا اس کھوئے کھوئے انداز میں آسمان کی طرف گھورتے ہوئے پوچھنا۔ "فرزی تو تمہارا بہت دوست ہے نا؟" کچھ ایسے سیاہ و سفید بادلوں جیسے شبہات کے ساتھ میں لیڈیز روم سے باہر نکل آیا۔ لیکن ان بادلوں کے اطراف ایک روپہلی لکیر، ایک یقین بن کر چمک رہی تھی کہ کلثوم وہ شہر تو نہیں ہے جس میں میں رہوں تو حراست میں لے لیا جاؤں گا۔ لیڈیز روم سے دو قدم بھی باہر نہیں نکلا تھا کہ کلثوم نے تیزی سے باہر کی طرف آتے ہوئے مجھ سے ذرا صاف آواز میں کہا۔ "دیکھو، ولی میڈم سے ضرور ملنا اور ان سے ملنے کے بعد مجھ سے ملنا۔" یہ کہہ کر کچھ اس طرح مسکرا کر دیکھا اس نے مجھے کہ میں نے صرف یہ سوچا کہ اس قدر سنگ دل اور سنگ مزاج حسینائیں تو بہت ہی کم رہی ہوں گی انسان کی تاریخ میں۔ ہر دور کو شاید مشکل سے ایک دو بخشی جاتی ہوں گی وہ بھی اس لیے کہ وہ پر شکوہ قربان گاہیں جن پر صرف جانباز، سرفروش و سرباز مردِ جواں قربان ہوتے رہے ہیں، ان کی حکایتیں زندہ ہیں اور خمِ ابرو کی حکمرانیاں اور سلطنتیں قائم و دائم رہیں۔ میں اپنے ہاسٹل کو لوٹ آیا۔

باب (۳۵)

تیسرے دن سہ پہر ٹھیک وقت مقررہ پر میں پروفیسرز چیمبر کے دروازے پر

کھڑا تھا۔ دروازے پر چلمن پڑی ہوئی تھی۔ چلمن تھوڑی سی اٹھا کر اندر جھانکا تو سامنے ہی تاریخ پڑھانے والے پروفیسر بیٹھے ہوئے نظر آئے، انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ کہا۔ " Come in " ۔ میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت وہ اکیلے تھے۔ مجھ سے انھوں نے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، اور ان پر نظر ڈالی۔ وہ اپنی نوٹ بک میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ ایک وجیہہ شخصیت، بڑا ہی قیمتی سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ رنگ کھلا کھلا سا، آنکھوں پر ہلکے سیاہ رنگ کی عینک۔ جسامت بھی ایسی کہ بڑھتی عمر کے سالوں میں علمیت کا وقار نمایاں تھا۔ مجھے وہ شاندار شخصیت والے پروفیسر یاد آگئے جو میرے شہر کے پہلے سفر میں ٹرین میں ملے تھے، انگلینڈ سے آتے ہوئے۔ یہ بھی تو انگلینڈ سے علم کی اونچی ڈگریاں لے آئے تھے ...... یہ بھی تو ...... یہ بھی تو ...... ایسا تو نہیں کہ ان کی بھی، یہاں اس دیش میں ایک بانو رہی ہو۔ اور انھوں نے بھی تاریخ کے خوش رنگ پہلوؤں پر لکچر دیے ہوں گے اور وہاں کوئی لوزی ان کو بھی ملی ہوگی ......، انھوں نے اپنی نوٹ بک سے نظر اٹھائی۔ مجھ سے پوچھا۔" " Any thing?

میں نے جواب دیا "نہیں، وہ ولی میڈم سے مجھے ملنا ہے۔" یکلخت انھوں نے کچھ اونچی آواز میں جواب دیا۔ "اوہ، ولی میڈم؟" اور کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ " Yes she will be just in " ۔ اور اپنی نوٹ بک اٹھا کر باہر جانے لگے۔ پھر کہا۔" Be seated " ۔

وہ چلے گئے چیمبر میں، میں اکیلا رہ گیا۔ ولی میڈم کا انتظار کرنے لگا۔ سامنے دیوار پر فریم کی ہوئی کچھ تصاویر تھیں، میں وہ تصاویر دیکھنے لگا۔ کالج کے کچھ پروفیسرز کی تصاویر تھیں ان کے اسماء گرامی کے ساتھ، ان کی تعلیمی ڈگریاں بھی لکھی تھیں۔ تقریباً وہ سب آکسفورڈ، کیمبرج، اڈنبرا جیسی مشہور یونیورسٹیز کے فارغ التحصیل تھے۔ ان سب کے چہروں پر علم کی ایک وجاہت تھی۔ میں نے سوچا تھا علم کس قدر عظیم ہوتا ہے، جس میں انسانیت کی ساری رفعتیں اور ساری بلندیاں محفوظ و مامون لگتی ہیں۔ اس وقت یہ خیال بھی دلچسپ لگا تھا کہ وہ سب ولایت کی دلپذیر تہذیبی فضاؤں میں رہ چکے تھے۔ یونہی کسی خیال سے میرے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آگئی تھی۔

بار بار مجھے وہی پروفیسر یاد آرہے تھے جو مجھے ٹرین میں ملے تھے۔ ایسے میں اچانک میری نظر ایک ایسی تصویر پر پڑ گئی جہاں ان خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا یا ان کا انداز بدل گیا اس تصویر میں ایک مخصوص تہذیب کا رنگ تھا، اس کا ایک منفرد تاثر تھا، اس تصویر میں جس شخصیت نے میری نظروں کو محصور کر لیا۔ ان میں مشہور زمانہ قدیم تہذیب اودھ کا بانکپن تھا۔ اس شخصیت کے چہرے پر ایک پُروجاہت تبسم تھا، اس میں بلا کی لطافت بھی تھی۔ اور اظہار تھا ان شاعرانہ عظمتوں کا جو حافظ و سعدی اور میر و غالب کے لہجوں سے منسوب رہی تھیں، جن کے خونِ جگر نے صرف ان اقدار حیات کی آبیاری کی تھی، جو مستقل ہیں اور ہر طرح مقدر ہیں اس عالم ہست و بود میں اس بشر فانی کا۔ ان مشاہیرِ عالم نے تو اس بشرِ بے زبان کے جذبۂ غم و مسرت کے اظہار کو ایک زبان دے دی تھی۔ جس کے اظہار سے ٹیس بھی لگے تو سچی، اور کیفیت سر خوشی ملے بھی تو سچی۔

وہ چوبی فریم تو بس اب ٹوٹنے کو تھا، جس میں اس شخصیت کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ آوارہ منش تو آوارگی حق کا دلدادہ تھا، اس کی آنکھوں میں کچھ ایسے ہی ہنستے ہنساتے اور چہچہاتے رنگ تھے۔ وہ کرشن جی کے بِرنداون کی کھلی کھلی فضاؤں کو بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کا مطالعہ کر چکا تھا، وہ بھی کچھ ایسی وابستگی کے ساتھ کہ اس کی نظر کی شوخی و شرارت میں ایک صوفیانہ ترنگ محسوس ہوتی تھی۔ امیر خسرو کی موسیقیت تھی اس کے ہر جذبے میں، واجد علی شاہ کی مطرب نوازی اس کے لہجے میں۔ اس شخصیت کی دراصل ہر سمت مشرق تھی۔ مشرق بھی اودھی، جہاں رسم و رواج کے دھانی، سرخ، جامنی یا پھر ہزار رنگ میں رنگی زندگی کے مہین سے لبادے پر طلوع آفتاب جیسی کرنوں سے کلابتو کا کام کیا ہوا لگتا تھا۔

مغربی علوم کے بلند آہنگ ہوش و خرد کے کلماتِ عالیہ کے مقابلے میں مشرق کا جنون خیز آہنگِ حیات بڑا کام کر جاتا وہاں، مشرق کی زندگی کو باوقار اور دلپذیر بنانے میں۔ وہ تو پروفیسر تھے اردو زبان کے، مزاج بھی اردو معلّٰی کا سا پایا تھا۔ وہ اس مغربی ماحول والے پروفیسرز چیمبر میں کبھی نہیں بیٹھتے تھے۔ ہمیشہ کالج کے ہوادار پورٹیکو کے پاس، دہلیز کو لگی، سنگ مرمر کی محراب جیسی نشست پر بیٹھے رہتے اور وہیں

خُرد و کلاں سے مِلنا جلنا ہوتا تھا۔"

مغربی زبان کے کالج میں مشرقی زبان پڑھاتے، اس طرح دار اور شوخ و شنگ انداز میں کہ سارے ذہن تو وہاں مغربی بنتے رہتے، لیکن سارے دل اپنی ہر دھڑکن میں صبحِ مشرق کی صباحتوں میں ملنے والے شبنمی نمک ہی کی تشنگی لیے ہوتے۔

بات بڑے فلسفوں کی تو نہیں کرتے وہ، لیکن کرتے حقایقِ حیات کی بات، وہ بھی اس طرح کہ پہلے پہلے ان کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ آجاتی، وہ غمازی کرتی ہوتی، جسم و جاں کے نہاں خانوں میں چھپی لذتوں کی اور مقابل کوئی طالب علم ہو یا طالبہ، بِلا تخصیص وہ بات کہہ دیتے کہ الفاظ کی لپ جھپ ایسی حسیات کو جگادیتی کہ سننے والے نوجوانوں کی بھیگی مسیں زیادہ بھیگی لگتیں۔ جوانی کی ترنگ سے بھرپور دِلوں کا یہی تو ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ بات کہنے والے وہ معلم حضور تو اپنی بات جس طرح بھی ہو کہہ دیتے لیکن ان کے لہجے کا ٹھسّہ برقرار رہتا۔ ان کی کہی ہوئی ایسی کئی باتیں آنے جانے والے موسموں میں دھڑکتے دلوں اور شگفتہ ذہنوں میں محفوظ ہوجاتیں، روایتیں بن جاتیں۔ مشاہیرِ مغرب، گیٹے، نطشے، شیکسپیر، ملٹن، ورڈزورتھ، شیلے، کیٹس، شا، وائلڈ وغیرہ کی کہی ہوئی باتیں ضرور ذہن کا حصہ بنتی رہتیں۔ لیکن ہمارے معلم حضور جناب آغا حیدر حسن کی کہی ہوئی باتیں تو آج کے ہر موسم میں سجنے والی محفلوں کو بھی گل و گلزار بنادیتی ہیں۔ ایک علم اپنی جگہ۔ ایک شخصیت اپنی جگہ۔

کالج کا گھنٹہ سنائی دیا۔ شاید پیریڈ ختم ہوچکا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں چلمن ہلی تو سامنے وِلی میڈم تھیں۔ میں نے بڑے ہی ادب سے وِش کیا، انھوں نے بڑی ہی لاپروائی سے سر کی ایک جنبش سے میرا جواب دیا۔ دبلی پتلی، چھریری، مہین، چھریرے پن سے بھی کم۔ بانس بمبوؤں سے بنی ہوئیں۔ عمر جوانی کے دریچوں سے باہر نکلتی ہوئی۔ چہرے کی کم رنگی میں ہلکی سی چمک، لیکن اس چمک سے کہیں زیادہ چمک آنکھوں میں۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ سارے کالج میں مشہور تھا کہ انگلش زبان پر غضب کا عبور رکھتی ہیں۔ اور عِلمیت تو زوں زوں سرچڑھ کر بولتی ہوئی۔ ان کی مٹیالی رنگت کے ساتھ، ان کی علمیت کی گہرائیاں، ان کی آنکھوں کی چمک دمک میں سحر سامری کا سا اثر پیدا کر دیتیں۔ ان کی شخصیت میں مغرب زیادہ بسا بسایا لگتا تھا۔ عمر پچھی دشت کی

سیاحی میں زیادہ گزری تھی ۔ غروبِ آفتاب کے بعد کے مناظر ان کی نظروں میں زیادہ تھے ، رات کی سیاہیوں میں شاموں کی رنگت گھڑی دو گھڑی کے لیے چمک اٹھتی ۔ ان کو غور سے دیکھیے تو لگتا کوئی مشرقی سمندر، مغربی ساحلوں پر ٹھاٹھیں مار رہا ہے ۔ اس وقت تو سمندری جھاگ کے سے سفید رنگ کی پروقار ساری میں ملبوس اور شانے بھی کچھ دبیز قیمتی سفید سلک میں اس طرح محفوظ کہ ان کی بانس جیسی شخصیت کا نکیلا پن پوشیدہ پوشیدہ، فیشن کی قینچی سے تراشیدہ بال ۔ اور ایک بات جو زیادہ پراسرار لگتی تھی وہ یہ تھی کہ کسی بھی خاتون کو دیکھیے تو پہلے اس کی نظریں ہی نظر آتی ہیں لیکن نظروں کے فوراً بعد، جہاں نظر پڑتی ہے، اور ٹھہر جاتی ہے ۔ پل بھر کو، وہ مقام ان کی شخصیت میں نظر ہی نہیں آتا، نظر سیدھے نیچے اترتی چلی جاتی ۔ گو کہ ایسی باتیں میں نے ان کی شخصیت کے بارے میں سنی تھیں، لیکن ان سے ملنے سے پہلے بھی میں ان سے مرعوب تھا، اور ملنے کے بعد بھی ۔

انھوں نے مجھ سے اپنے مخصوص ولایتی لہجے میں پوچھا "Yes?" ۔ ان کی آواز بھاری تھی ۔ جیسے نسوانی کم اور مردانہ زیادہ ہو ۔ میں نے سیدھے صاف لفظوں میں کلثوم کی دی ہوئی ہدایت کا ذکر کر دیا اور اپنا نام بتایا اور کہا میں Thanks giving کے لیے آیا ہوں ۔

وہ اچانک چہک اُٹھیں، اور کچھ کم دبی آواز میں کہا۔

Oh, Congratulation for Scholorship کچھ مسکرا پڑیں اور کہا۔

"Be fast master" ۔

میں نے سنا تھا کہ اس اسٹوڈنٹ کو جس کے ساتھ وہ کچھ کُھل کر بات کرتی ہیں، ماسٹر کہتی ہیں، میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ احسان مندی کے انداز میں دیکھا تو کچھ زیادہ مسکراتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔ "Any hobby?" ۔

میں نے فوراً کہا۔ "Reading" تو وہ اور بھی چہک اُٹھیں ۔

"good, good, good" ۔ اور یکلخت کچھ انداز بدل کر اپنے انگلش لہجے میں اردو بول پڑیں ۔ "میں نے اور بی کچھ سُنا تمھارے بارے میں ۔ مسٹر چارلس، تمھارے ہاسٹل کے وارڈن، انو نے بتایا۔"

" A rustic is crossing civic limits " یہ کہتے ہو۔
زور زور سے ہنسنے لگیں۔اس وقت تو اس چمبر میں ہم دونوں ہی تھے۔ پھرانہوں نے کہا۔

" Mr Charles branded you an accomplice of that red revolutionary Jagirdar, Rafi"

رفیع کا نام سن کر میری باچھیں کھل گئیں۔میرے ذہن میں وہ نام گونجنے لگا۔ رفیع، رفیع، رفیع .... پتہ نہیں یہ زمین گول کیوں ہے؟ اپنے محور سے کبھی اِدھر اُدھر ہوتی ہی نہیں۔میں نے کہا۔"ہاں، رفیع تو میرا ساتھی ہے، دوست ہے ....."

" Dalila's Samson, Farzi.... وہ .... اور، وہ" میڈم نے پوچھا۔

میں کچھ چونک پڑا۔اچانک دماغ کی طنابیں کھنچنے لگیں۔وہ مجھے دیکھ کر اس طرح ہنس رہی تھیں، جیسے ایک صحیح لہجے میں انھوں نے ایک لطیفہ کہہ دیا ہے۔میں بھی مسکراپڑااور کہا۔"ہاں، وہ بھی میرا ساتھی ہے ......"

ولی میڈم ہنستے ہنستے رک گئیں۔اور انھوں نے کچھ سنجیدہ لہجے میں کہا۔"اچھا جاؤ۔جاکر کلثوم سے مل لو۔بولنا تم میڈیم سے مل چکے ہو۔ٹھیک ہے؟"

میں پھرایک بار ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد باہر جانے کے لیے چلمن اٹھا رہا تھا کہ ولی میڈیم نے پھر کہا۔" Just a minute " ۔ انھوں نے مجھے اپنے قریب بلالیا۔

اپنے ٹیبل کی دراز سے ایک موٹی سی کتاب نکالی اور کہا۔

" Read this book and write a short note on it and meet me – sure it is your subject......"

میں نے کتاب لے لی۔اس کے خوبصورت کورپر لکھا تھا۔

" The god that failed" ۔ پھرانھوں نے اپنے لہجے میں کچھ لاپروائی کا انداز پیدا کرتے ہوئے کہا۔" I will be on leave for a fortnight۔ کتاب پڑھ لو۔بہتر ہے تم میرے بینگلوپر مل لو۔کالج سے تھرڈ لین میں میرا بینگلو ہے پاس ہی۔کلثوم سے پوچھ لینا۔

" Mostly I will be free af ter 5 evening at home. Ok ? All the best."

مجھے تعجب ہوا کہ انھوں نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں ان سے ہاتھ مِلا کر جلد ہی وہاں سے نکل گیا۔ وہ ہاتھ بھی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

باب (۳۶)

" The god that failed " وہ خدا جو ناکام ہوگیا، کتاب کا نام ہی چونکا دینے والا تھا۔ اوّل اوّل اس کتاب کے بارے میں میں نے رفیع سے کچھ دلچسپ باتیں سنی تھیں۔ ویسے اس کتاب کے تذکرے کالج کے ان گوشوں میں بھی سنے تھے جہاں زیادہ تر وہ طالب علم نظر آتے تھے جو اپنی آنکھوں پر موٹے موٹے عدسوں والی عینکیں لگائے ہوتے اور جن کی کچھ عرق آلود پیشانیوں پر غور و فکر کی دو چار لکیریں ضرور نظر آتیں۔ لائبریری میں لگی میزوں اور کرسیوں میں رینگنے والے کھٹملوں کو وہ دیکھ بھی لیتے تو نہ ان پر غور کرتے نہ ان سے پریشان لگتے۔ وہ تو بس پڑھتے رہتے اپنی کتابیں۔ لیکن ان کے بیچ ہونے والی گفتگو میں اس کتاب کا ذکر میں نے بارہا سنا تھا۔ کہ کس طرح کچھ کمیونسٹ اسکالرز نے کمیونزم اور مارکسزم سے مایوس ہوکر آخرکار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کمیونزم ناکام ہوچکا ہے۔ لیکن اس بات کو اس شہر کے روشن دماغ لوگ تو مانتے ہی نہیں تھے۔ یہاں تو دراصل انقلاب کے نعروں کو دل و دماغ میں بسا کر جینے والوں کی ایک نئی نسل تیار ہوچکی تھی، جس کے ساتھ چل چل کر رفیع جیل جاچکا تھا۔ بہرحال وہ کتاب اور اس کا نام دونوں، ان دنوں بہت مشہور ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب بھی ان دنوں اتنی ہی مشہور ہوگئی تھی، وہ ایک ناول جو سویت رشیا سے نکالے گئے ایک ناول نگار نے امریکی شہری بننے کے بعد لکھا تھا۔ جس میں بہت ساری آگ لگانے والی باتیں کہی گئی تھیں، ایک نابالغ حسینہ کے جنسی تجربات کے بارے میں۔ یہ ساری باتیں تو وہ تھیں جو کالج کی باؤنڈری کی دیوار میں پڑی ہوئی دراڑوں میں سے باہر نکل کر ہواؤں میں تحلیل ہوجاتی تھیں۔ لیکن اس نسل کی آواز جو انقلاب کے تصور کی دیوانی ہوئی جارہی تھی، شہر کی شاہراہوں پر، چھوٹی موٹی سڑکوں پر، شہر کی گلیوں میں، شہر کی

فضاؤں میں دھیرے دھیرے ایک شور بپا کر رہی تھی۔ لگتا کہ وہ آواز شہر میں ہر طرف پھیلے ہوئے برقی کے تاروں میں سنسنا رہی ہے، جیسے وہ ساری ہائی ٹینشن لائینز میں دوڑنے والی ایک برقی رو ہو، جو ایک طرف تو سارے شہر کو روشن کرتی ہے، اور دوسری طرف ایک ایسی آواز بن جاتی ہے جو سارے شہر واسیوں کے اندر ایک نیا احساس، نیا جذبہ اور نئی فکر پیدا کر رہی ہے۔ جو ایک نیا خوف بھی بن جاتی ہے اور ایک نئی امید بھی پیدا کر دیتی ہے۔ سارے شہر کے رگ وپے میں یہ رو دوڑ رہی تھی۔ کوئی تیز رَو ندی بھی زمین پر ایک ہی رخ پر بہتی ہے، لیکن اس نئی فکر کا شور شہر کی چاروں سمتوں سے اُمڈنے والا ایک سیلاب بن رہا تھا۔ جس کی زد میں کتنے ہی قصر و ایوان تھے، وقت کے رؤسا و اُمراء کے محل بھی تھے اور نکبت زدہ عام انسانوں کے گھروندے بھی تھے۔

اونچے اونچے بام و در کے رنگین شب و روز کی داستانیں سنانے والا یہ شہر، اعلیٰ سے اعلیٰ رتبوں اور وجاہتوں والے حسن و شباب کی حکایتیں سنانے والا یہ شہر بھی اب لپنے لہجوں کو بدلنے لگا تھا اور اس سنسناتی آواز سے آواز ملانے کی فکر کرنے لگا تھا۔ اپنے اظہار کے لیے نئے نئے الفاظ و معنی کی تلاش کرنے لگا تھا۔ عام شہریوں کے لب و لہجے میں تو ایک رزم کی سی کیفیت تھی، بڑے بڑے محلوں کے کنگورے بھی انقلاب کی بات کرنے لگے تھے، کرنا کیا تھا بات ہی تو کرنا تھا، بلند و بالا ایوانوں میں ہونے والی شعر و شاعری میں بھی انقلاب گنگنانے لگا تھا، لیکن ذرا دبے دبے، ہلکے ہلکے سروں میں۔ گلی کوچوں میں تو ایک جوشِ جواں عیاں عیاں، نہاں نہاں کہ درباروں کے لہجے بھی اسی اظہار کی غمازی کرنے لگے تھے۔ اس لیے کہ صرف لہجوں کو بدلنا تھا، عمل کو نہیں۔ تاریخ نے بتایا ہے کہ زندگی تو زندگی اگر موت کی بھی شکل ایسی ہو سکتی ہے جو بقائے حیات اور تحفظِ عز و شان اور وسائل حیات کے حصول کا یقین دلاتی ہے تو اس کا بے دریغ استحصال کرتے ہیں، سب سے پہلے وہی طبقے جن کے پاس ہر وقت، ہر ضرورت کی تکمیل کا سامان موجود رہتا ہے۔ وہ ذہن ہو یا دل، علم ہو یا شعور، فہم ہو یا فکر یہ سب پہلے ان ہی طبقوں کے کام آتے ہیں اور ان کو برتر ثابت کرتے ہیں۔ یہاں زلزلہ آ ہی جائے تو پھر مجبوری ہے، وہ بھی وقتی۔

کہیں کچھ ایسا بھی لگتا تھا کہ انقلاب کا جذبہ تو Evening in Paris جیسا فیشن بن گیا ہے۔ اونچے اونچے گھرانوں کی اونچی اونچی باشعور اور فیشن ایبل خواتین جو حریر و دیبا کے بنے لبادوں یا جرمنی، جاپان اور مینچسٹر کے بنے لاقیمت لباسوں میں مجسم عشوہ و ناز بنی رہتی تھیں، اب رنگ برنگے سودیشی لباسوں میں ملبوس نظر آنے لگی تھیں۔ وہ ملبوس قبائلی انداز میں پہنے جانے لگے تھے کہ سادگی بھی بڑا ہی پرکار فیشن بن گئی تھی۔ اونچے گھرانوں میں نئی تراش خراش کا قبائلی حسن، مستی بھری آنکھوں میں نئے نویلے علم و دانشوری کے کاجل کے ڈورے، ہونٹوں پر انقلاب اور نچلے طبقات سے مساوات کی باتیں۔ انٹلکچول خواتین کے لیے انقلابی دلارے بڑے ہی پُرکشش بن رہے تھے۔ انقلاب کے نعروں کا لطف تو مزدور اور کسانوں کے لبادوں میں ملتا ہے، لیکن ان رنگ برنگی سادگیوں میں بھی انقلاب کی تلخ لذتوں کی بات ہوتی تھی۔ جسم و روح تو کسی بھی طرح رومان انگیز بنائے جاسکتے تھے، عشق کی آہ یا واہ کی ہی حاجت نہیں۔ انقلاب کی سرفروشی کی بات بھی تو وہ آزادی کا احساس پیدا کرتی ہے جس میں کسبِ معاش اور سیاست کا دخل نہیں ہوتا بلکہ جسم و جاں پر لگی ہوئی دقیانوسی پابندیوں سے آزادی کا انداز بھی ہوتا ہے۔ انقلاب کا شعور اونچی گلیوں میں عشق و حسن کو ان کی منزلوں تک پہونچانے والی راہیں کھول رہا تھا، بس سرفروشی اس کی پہلی شرط تھی، اور سرفروشی بھی وہ جو جسم و جاں کی آزادیوں کے حصول کے لیے جائز ہتیھار بن جائے۔

دوسری طرف سڑتی گلتی گلیوں میں مرنے جینے والے عوام، ان پڑھ اور جاہل عوام، غلامی کی ریت رواج کے شعور کے ساتھ ہی جینے والے عوام، لاکھوں کروڑوں وہی پھٹی پرانی زندگی جیتے ہوئے، روز کی کمائی کی ڈھیر سی فکروں میں ٹوٹتی سانسیں لیتے ہی رہتے، گندے اجالوں میں، گندے اندھیروں میں، انقلابی دھاروں سے محروم بھی اور انقلاب کی ان دیکھی روشنیوں سے بے تعلق بھی۔ شہر کے افق اور اس کی شفق سے پھوٹنے والے انقلابی رنگ تو ان تک کسی طرح پہونچ نہیں پاتے کہ راستے میں بلند و بالا رکاوٹیں تھیں۔ اس شفق اور ان کے دو فٹ اونچے گھروں کے بیچ سربہ فلک عمارتیں تھیں۔ جن اندھیری گلیوں اور تاریک بستیوں میں اس عالم تاب

سورج جیسے منبعِ نور کی ایک کرن پہونچ نہ سکتی ہو، وہاں بھلا شفق کی سرخروئی کے عکس کے پہونچنے کا گمان بھی کیا معنی؟ تاریخ کے درخشاں سے درخشاں انقلابوں کے آفتابوں کو کبھی وہ سرخروئی نصیب نہیں ہوئی کہ ان پیوستگانِ ظلمتِ حیات کی طرف ایک نظر بھی اٹھا کر دیکھ سکیں۔ انقلاب تو آئے اپنے جلو میں رنگ و نور لے کر لیکن فاتح قائدینِ انقلاب تو اپنے غنیموں کو زیر کر کے سیدھے ان ہی سامان ہائے عیش و آسائش سے آراستہ قصور و ایوان ہائے نشاط میں گھس پڑے اور پھر وہیں کے ہو رہے، اس طرح کہ ان کی مخملیں دہلیز سے اتر کر ان غلاظتوں بھری، تعفن بھری گلیوں تک کبھی پہونچ ہی نہیں سکے۔ وہ قصر و ایوان وہی قصر و ایوان بنے رہے جن پر تاریخ کے ہر دور کی شفق کے رنگ و نور برستے رہے ہیں۔ قیادت کی برتری کا انعام بھی تو تاریخ کی عین منصفی رہی ہے اور وقت کی ضرورتِ اول بھی۔

لذاتِ حیات اور عیش و نشاط کے راستے کبھی مسدود نہیں ہوتے۔ یہ راستے تو انسانی فطرت اور اس کے وجود کے اندر بنی ہوئی ان کمین گاہوں سے نکلتے ہیں جہاں سے موقر عقائد اور اعلیٰ و ادنیٰ فلسفوں کی تلقین ہوتی ہے، اور عام انسانوں سے بے لوث محبتوں کے اعلان ہوتے ہیں کہ بلند کرداری کے نشان، رزمِ حیات میں یونہی بلند ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ان کمین گاہوں میں سجنے والی بزمِ حیات کے نقشے کچھ اور ہوتے ہیں، جو بنتے بھی ہیں تو خود بینی اور خود سری کی مستیوں اور ولولوں سے، اور ان کی آرائش کے جو ساز و سامان ہوتے ہیں، ان کے بازار الگ سجتے ہیں، انسان کے فطری جذبہ و احساس کی تونگری کی لین دین سے۔ اور پھر اس جذبہ و احساس کی دین ہوتے ہیں شہروں کی تاریکیوں میں اور بے نام بستیوں میں پلنے والے وہ امراضِ کہنہ جن کا علاج و معالجہ ہمیشہ دقیانوسی جالینوسی نسخوں کو نئے نئے نام دے کر اور عصری آلات سے چیر پھاڑ کرنے کے انداز میں ہی ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح کہ مرض کی پوشیدہ جڑیں ہمیشہ مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن گاؤں تو انسانی فطرت و ضمیر کے لگائے ہوئے وہ بھولے بسرے، قائم و دائم زخم ہوتے ہیں جن کی مرہم پٹی ہر دور میں ضرور ہوتی رہتی ہے، وہ بھی اس طرح کہ زخم بار بار مندمل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر کا مواد اندر ہی اندر پھیلتا رہتا ہے۔

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ

یہ شعر گونج گیا تھا، سارے شہر میں، سارے ملک میں، ایک آواز بن کر، اس شہر کے ایک سچے شاعر کی آواز جو نہ اس شہر کے اونچے محلوں سے آیا تھا نہ اس شہر کی گلیوں سے۔ یہ تو ایک گاؤں کی پرانی مٹی سے اٹھا تھا اور ایک جادو اثر آواز بن کر اس طرح سارے شہر پر چھا گیا تھا کہ یہ کوئی ایسا جوش و ولولہ نہیں تھا، جو عام طور پر وقتی ذہنوں کی وقتی تخلیق ہوتا ہے، اس کی آواز میں تو ایک صداقت کا اعلان تھا، صداقتوں کی تصویر تھی اور حق کے لیے سردار پہونچ جانے کا حوصلہ بھی۔ پھر اس نے ایک طوفان انگیز جسارت اور دیدہ دلیری کے ساتھ سربازار یہ نغمہ سنایا تھا۔

پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربتِ کاری
حضور آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

اس کے ایسے نغموں کو سن کر محتاط مفکرین اور مصلحتوں کے سوداگروں نے کچھ رک رک کر سانس لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ غدار ٹھہرا، اس پر بے حساب الزام لگائے گئے۔ پولیس کی کوٹھریوں میں اس کو بند کر دیا گیا۔ اس نے پولیس کے ظلم سہے پھر جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور مقابل قوتوں کی بندوقوں کو جُل دیتا رہا اور اپنے انقلابی لباس بدل بدل کر گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، جنگل جنگل گھوم کر وہاں کی زرخیز زمینوں میں اور بنجر زمینوں میں بھی انقلاب کے بیج بوتا رہا اور زیر زمین رہنے والے اپنے ساتھی جانبازوں کے ساتھ مِل کر حکومتِ وقت کی گولیوں کا گولیوں سے جواب دیتا رہا اور حق کی لڑائی لڑتا رہا۔

لیکن ان جنگلوں میں کبھی کسی رات دشمن کی بندوق کی گولی، اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتی تو وہاں سے دُور حسینۂ شہر کی خوابگاہ میں ایک دھماکہ سا ہوتا۔ وہ حسینۂ شہر جس کی خوابگاہ میں برقی قمقموں کی روشنی نہیں ہوتی بلکہ لعل و زمرد کی چمک دمک سے وہ ماحول روشن رہتا۔ کبھی تو وہ لعل و زمرد کی چمک دمک بھی مدھم پڑ جاتی کہ ساری خوابگاہ کو روشن رکھنے کے لیے حسینۂ شہر کے چہرے کا عکس کافی ہوتا، جو در و دیوار کو پراسرار انداز میں روشن کر دیتا۔ ایسی ہی رات جب اپنی روپوشی کی آن بان

کے ساتھ شاعر کبھی شہر آجاتا اور کسی میخانے میں چھپ کر حسینۂ شہر کو اپنے جنگل کا کوئی پیام دینا چاہتا تو اس خوابگاہِ حسن میں ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھتی اور وہ انقلاب پسند حسینۂ اپنی نزاکتوں سے مرصع کلائی سے ٹیلیفون اٹھا کر، نیلم کے بنے دمکتے بوندوں کے قریب لاکر، گل شبو کی چٹک جیسی آواز میں ہیلو، کہتی تو ادھر سے ایسی آواز آتی جیسے ایک ایک لفظ میں لذت شعر تو ہے لیکن ساتھ ہی انقلاب کے لحن کی وہ گونج بھی ہے، جو کبھی قیس کے صحراؤں میں گونجتی رہی ہو گی۔ "بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا۔"

تاریخ کی یہ خوش مذاقی یا ستم ظریفی تو قرنوں پرانی رہی ہے، کہ حق پرستی اور انسان دوستی کے سچے جذبوں نے جن جانبازوں کو مہم جو بنایا، ان پر اونچے محلوں کے اونچے در و بام کی رنگینیوں میں محفوظ و مامون، حسنِ شب تاب نے اپنے آپ کو نچھاور کر دیا۔ ان کو گھایل کر دیا، ان کے زخموں پر اپنے لب و رخسار کی سرخیوں کے مرہم لگائے اور رسم وفا نبھائی۔

میرے ان خیالات کے بہاؤ میں مجھے اچانک یاد آگئی، میرے کالج ہاسٹل کی پہلی شام، میرے کمرے کی بغل والے کمرے میں ہونے والی خرمستیاں اور ہنگامے۔ اس کمرے کی دیوار پر لٹکا ہوا وہ کیلنڈر جس میں گریٹ لنین کی تصویر تھی، لنین ایک ٹیلے پر کھڑے ہوئے لاکھوں بھوکے ننگے عوام کو انقلاب کا مژدۂ جانفزا سنا رہے ہیں۔ اور دوسری دیوار پر ایک دوسرے کیلنڈر میں میرے اس قدیم ترین ملک کے ایک گاؤں سے قریب بہنے والی ایک چھوٹی سی ندی۔ وہاں پانی میں اپنے پیر لٹکائے بیٹھی وہ گاؤں کی الھڑ گوری، جس کی نظروں میں وہاں ہر طرف پھیلا ہوا سبزہ زار ہے، اور اس میں بنی ایک پگڈنڈی ہے، جس سے ہوتا ہوا کوئی گبرو ادھر آئے تو آئے، نہ آئے تو نہ آئے۔

عشق و رومان کتنے پُرفریب ہوتے ہیں اور انقلابوں کی طرح جان لیوا بھی کہ ان میں مخملی تصورات کی نرمی اور گرمی بھی ہوتی ہے اور وہ سختی اور درشتی بھی جو انسانی دلوں کو جوش و خروش کی آگ سے کھیلنا سکھا دیتی ہے۔

یہ سب کچھ ہوتا ہے، لیکن جیسے کچھ نہیں ہوتا۔ صدیوں کے پیچھے صدیاں،

لمحوں کی رفتار سے دوڑتی رہتی ہیں۔ دراصل یہ انسانی تاریخ، بے لفظ اور بے معنی ہی رہتی ہے، اس کی تحریر تو ایک اندھے کی لاٹھی کی بنائی ہوئی ایک ٹیڑھی میڑھی لکیر ہوتی ہے اور اس تاریخ کی ساری فتوحات بے مقصد اور اس کے سارے فاتح بے معنی۔ انسان کا فریب انسان سے اور اس کا ایک لامتناہی سلسلہ۔

باب (۳۷)

میں نے تو بہرحال ولی میڈم کی دی ہوئی کتاب پڑھ ڈالی تھی۔ ایک بوجھ تھا میرے ذہن پر کہ اس پر مجھے ایک نوٹ بھی لکھنا ہے۔ ان کی بات کو ٹالنا بہت مشکل لگتا تھا۔ آخر انھوں نے مجھے ایک اچھا سا اسکالر شپ دلایا تھا اور میں کچھ آسودہ ہو گیا تھا۔

جب میں کلثوم کے بتائے ہوئے پتے پر ولی میڈم کے گھر پہونچا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ مجھے یاد آیا، انھوں نے اپنے ملنے کا وقت بھی بتایا تھا مجھے۔ کال بل پر ہاتھ رکھنے سے پہلے پتہ نہیں کیوں ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا مجھے۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ نوٹ میں نے تیار نہیں کیا تھا اور ایسی باتوں میں وہ بہت سخت گیر مشہور تھیں میں نے بل کا بٹن دبا دیا۔ دروازہ کچھ اتنی جلدی کھل گیا جیسے وہ اس بٹن ہی سے کھلتا تھا۔ ایک طرار سی خادمہ سامنے آئی اور کہا۔

"آجائیے، میڈم آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" یہ بات سن کر میرا دل کچھ زیادہ ہی دھڑکنے لگا کہ وہ خادمہ تو مجھے جانتی ہی نہیں، اور میڈم بھی اس طرح کیسے میرا انتظار کر سکتی ہیں۔ میں نے دو قدم اندر بڑھائے، خادمہ نے دروازہ بند کر دیا اور کہا "چلیے اندر۔" میں نے آگے قدم بڑھائے، سامنے دہلیز پر رکھے ہوئے بڑے بڑے گملے تھے جن میں سرخ، سفید، چمپئی، اودے، نیلے، بڑے چھوٹے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جب میں نے ڈرائینگ روم میں قدم رکھا تو اچانک ایسا لگا جیسے میرے سامنے وہ منظر ہے جو میں نے کبھی رنگ پور کے تھیٹر میں دیکھا تھا کہ ایک خوبصورت باغ میں پھولوں کی بہار، وہ ایک نوجوان رقاصہ، ہلکے رنگوں والی روشنی میں محوِ رقص، اسی طرح اور ان ہی اداؤں کے ساتھ جن پر میں فریفتہ ہو چکا تھا۔ وہ جسم و جاں کے نوخیز طوفانوں کا

زمانہ۔اس یاد نے میرے اندر ایک لذت بھری ترنگ پیدا کر دی۔اس منظر میں جو ہلکے ہلکے رنگ تھے وہ صرف محسوس ہونے والی روشنی کی کرنیں تھیں۔ان میں مجھے اب نظر آرہا تھا، وہ سارا ڈرائینگ روم، اس کی ساری آرائش، زیبائش، مخملیں قالین یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے۔بید اور شیشم سے بنا فرنیچر، ابونی تپائیاں، وہ ساری آرائش، نوادرات اور دو سفید و سیاہ مرمر میں تراشے ہوئے دِجیح مجسمے۔اتنا بڑا ہال کہ چھت سے لٹکتے ہوئے فانوس بڑے ہی پر شکوہ لگتے تھے۔وہ جو ایک بہت بڑا نرم گرم قرمزی مخمل سے بنا ہوا صوفہ سیٹ تھا، وہیں میں کھڑا ہوا تھا۔ایک دو دیوان تھے جن پر سنہری گوٹ لگے کور (Cover) تھے اور مغل محل سراؤں کے انداز کے نرم و دبیز، بڑے بڑے گاؤ تکیے تھے، کُشنز تھے۔فرنیچر کے اور بھی سیٹ تھے اسی طرح آراستہ پیراستہ۔اور ایک موزوں گوشے میں ایک بڑا آتش دان۔میں اس بڑے اور نرم صوفے پر بیٹھ گیا جب کہ میرے احساس میں ایک مخملی پریشانی بھی تھی اور میرے ذہن میں بڑی ہی تیزی سے گھومنے والا یہ خیال کہ یہ گھر تو ولایتی رہائش گاہ کا ایک گوشہ ہے، جو مشرقی اِنداز رہائش پر بھی ناز کرتا ہے۔

ویسے اس وقت وِلی میڈم کے کسی بھی لمحے ڈرائینگ روم میں اچانک آجانے کا یقین تھا مجھے۔لیکن اس یقین میں ایک یقین کی مکمل حرارت نہیں تھی۔اس میں ایک سِیلن بھی محسوس ہو رہی تھی کہ پتہ نہیں میڈم کہیں روکھے پن سے پیش آئیں یا ہو سکتا ہے کچھ رکھ رکھاؤ کے ساتھ پیش آئیں۔کوئی جماؤ نہیں تھا خیال و احساس میں میرے۔مقابل کی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس پر ایک دھنک رنگ پردہ تھا۔پردہ کچھ لہرا جاتا تو دوسرے رُخ پر ایک بڑی ہی وسیع و عریض مسہری نظر آجاتی۔وہ یقیناً میڈم کا بیڈروم تھا، اس مسہری کو دیکھ کر میرے احساس میں ایک گداز سا پیدا ہوا کہ مسہری پر بس جدھر چاہو اپنے ہاتھ پاؤں، آزادی کے ایک احساس بیکراں کے ساتھ پھیلا لو اور لطف استراحت کی بھول بھلیوں میں کھو جاؤ۔وہاں کچھ ہلکی ہلکی طلائی چمک دمک بھی تھی۔شاید وہ مسہری کی ایک طرف رکھی ہوئی تپائی کی تھی۔موتیوں جیسی سفید سفید روشنی کی کرنوں سے بنا ایک جال تھا پھیلا ہوا، مسہری کے ہر رُخ کو اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے، جو شاید چھت سے لٹکتی ہوئی ڈوریوں کی مدد سے تان دیا گیا

تھا بڑے ہی سلیقے سے ۔ اس جال کے اندر صبحِ کاذب کی سی ہلکی ہلکی دمک نظر آئی تھی جس میں اونچے اونچے افقوں کا انداز تکبر بھی تھا ۔ خیال آیا تھا کہ مٹیالے رنگ کی میڈم ان اونچے اونچے افقوں کی رہنے والی تو نہیں ہے، پھر کیا بات ہے کہ اس کا مٹیالا رنگ اس دھرتی کے کسی رنگ سے بھی میل نہیں کھاتا ۔ اس مٹی سے بھی نہیں ۔ کچھ تو ہے یہ راز ۔ ایک رازِ سربستہ ۔ میں کیسے سمجھوں، اس کھوج میں کہیں کوئی سکون کی امید نہیں تھی ۔ سوچا " تج دو اس ماحول کو اور پونچھو پسینہ اپنے ماتھے سے ۔ "

بس ایک ہی لمحے میں اس دھنک رنگ پردے سے میڈم نکل آئیں، اور مجھے لگا وہ ساری ہلکی ہلکی روشنی اور ہلکے ہلکے رنگ، جو ابھی میری نظر میں تھے، سمٹ کر میڈم کے چہرے کی ہلکی مسکراہٹ بن گئے ہیں، جس کو دیکھ کر میرے اندر مجھے ایک قرار کی سی حرارت محسوس ہوئی ۔ مجھے لگا جیسے وہاں تو میرا سواگت ہے ۔ میں تو شاید میڈم کے آجانے کے خیال کے ساتھ ہی صوفے سے اٹھ کھڑا ہو گیا تھا، میں نے میڈم کو وِش کیا تھا، تو انھوں نے اپنی مسکراہٹ میں کچھ زیادہ ہی قربت کا انداز پیدا کرتے ہوئے کہا تھا ۔ " بیٹھیے، بیٹھیے ۔ Please sit down " ۔

" So happy to see you in my house".

اور واقعی کچھ کھلے انداز میں، وہ میرے ہی صوفے پر میرے قریب بیٹھ گئیں ۔ لیکن میرے اندر سر سے پیر تک ایک دوری کے احساس کی لہر دوڑ گئی ۔ اس بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنا مجھے موزوں نہیں لگا ۔ سوچا، یہ مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں کے اخلاق و آداب کس قدر واضح اور آزاد آزاد سے ہوتے ہیں ۔ انھوں نے صوفے سے لگی ایک تپائی سے ایک چوبی ڈبیا اٹھائی، اور ڈبیا کھول کر میرے سامنے کر دی اور کہا ۔ " سگریٹ تو پیتے ہیں نا ......؟ " Must be somking "

میں نے بنا سوچے سمجھے No thanks کہہ دیا تو وہ ہنس پڑیں اور کچھ ہنستی ہوئی آواز میں کہا ۔

" Come on - Be free, we are friends here "

میں نے ایک سگریٹ لے لیا ۔ وہ ہنسنے لگیں ۔ So good of you -

کہتے ہوئے انھوں نے ایک اور سگریٹ ڈبیا سے نکال لیا۔ میں نے سگریٹ کی طرف دیکھا۔ سگریٹ قریب چار انچ لمبا تھا، میری نظروں میں حیرت کا انداز دیکھ کر میڈم نے کہا۔

" I get this stuff from London. My friend, Coleridge sends me every month. Such tall fags like his tall talk Oh, a real chalterbox."

وہ ہنس پڑیں جیسے انھوں نے اپنے دوست کولرج کو چھڑدیا ہے۔ تب انھوں نے اسی تپائی سے ایک لائیٹر اٹھایا اور لائیٹر جلا کر میرا سگریٹ جلانے لگیں۔ لیکن اس ایک لمحے میں، میں نے پتہ نہیں کیوں ان کے چہرے کی طرف دیکھ لیا، جو مجھ سے قریب تھا۔ اس لائیٹر کی روشنی میں ان کی آنکھیں کچھ اس طرح چمک گئیں جیسے وہ تو کوئی کالے دیشوں کی ساحرہ ہوں۔ کالا جادو تھا ان کی آنکھوں کی چمک میں۔ ان کے چہرے پر بھی پتہ نہیں کس طرح مجھے ایک ساتھ کئی رنگ نظ[illegible] مدھم سرخ، ہلکا گلابی، ہلکا چمپئی اور نیلا نیلا سا۔ اور ان کے ہونٹوں پر جامنی رس [illegible] رہا تھا۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ تب انھوں نے اپنا سگریٹ جلایا اور بڑا ہی لذت بھرا کش لیا، ایسا لگا مجھے۔ وہ کچھ سنبھل گئیں صوفے پر۔ میں نے بڑی ہی سرعت سے کہہ دیا" وہ کتاب۔ جو آپ نے مجھے .... " انھوں نے میری طرف نظر اٹھا کر اچھی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

" Oh trash – all trash – forget it "

میں نے سوچا، میں نے تو وہ کتاب اس طرح پڑھی تھی جیسے ساری عمر محنت و مشقت کی تھی کہ کہیں کوئی لفظ نظر سے نہ چوک جائے۔ آخر کچھ کہنا تھا اس کے بارے میں، کچھ لکھنا تھا، اس اسکالرشپ کے لیے اپنی موزونیت کو ثابت کرنا تھا۔ مجھے ایک اعتماد تھا کہ میں پڑھتا بھی اچھا ہوں اور لکھتا بھی اچھا ہوں۔ میں نے اپنے لہجے کو ذرا پراعتماد بن[illegible] کہا۔ "نہیں میڈم، وہ نوٹ میں نے تیار تو کر لیا ہے، لیکن .... "

" Oh, Stem the bloody rot. Flush it out from your brain. Feel free here my dear."

اپنی آنکھوں کے کالے جادو کو کچھ اور چمکا کر انھوں نے کہا۔ میں ان کے اس

انداز گفتگو پر کچھ چونکا ضرور، لیکن صرف اندر اندر ۔اور سوچا ان کو تو شاید یاد بھی نہیں کہ وہ کتاب انھوں نے مجھے دی تھی ۔وہ تو ایک لمحہ تھا ۔شاید اِن لمحوں سے آملنے والا، لیکن وقت کے بہاؤ میں پتہ نہیں کن گہرائیوں تک چلا گیا تھا ۔وقت کتنا ہی طویل کیوں نہ گزرا ہو، کبھی کبھی ایک لمحہ ہی معلوم ہوتا ہے، ایک بھرپور سانس جیسا ۔لیکن جب ذہن ہی خالی ہو جائے اور بالکل ایک خالی ڈبّہ لگے تو ایک لمحہ بھی کس قدر بد رنگ اور بد شکل لگتا ہے ۔میرا وجود بھی اب اتنا ہی بد رنگ اور ایک بگڑی شکل بن گیا تھا کیونکہ اب میرے پاس میڈم سے کہنے کو کچھ نہیں تھا ۔وہ بگڑی شکل والا لمحہ تو مجھ سے مطالبہ کرنے لگا تھا کہ میں اب چلتا بنوں ۔اور کہنے لگا کہ میری طرح تم بھی اب خالی ہو ۔خالی ڈبّہ ۔! میں مسکرا بھی پڑا اپنے اس سرعت سے گزر جانے والے خیال پر اور بے چین سا ہو گیا ۔اچانک میڈم میری طرف دیکھ کر مسکرا پڑیں ۔اور صوفے سے اٹھ کر تیزی سے مقابل کی دیوار پر لگی ایک کال بل کا بٹن دبا دیا، اور کچھ زیادہ ہی کھلی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور میرے اندر کے خالی پن کو اپنی اس مسکراہٹ کے رنگوں سے پُر کر کے یہ احساس دلا دیا کہ "ابھی تو آئے ہو، کس طرح جا سکتے ہو؟ تمہارے آجانے پر تو میں مسرور ہوں ۔بیٹھو ۔" وہ اس بار میرے ہی صوفے پر ذرا کچھ اور قریب بیٹھ گئیں ۔ان کے سارے بدن میں ایک عجیب سی مہک تھی ۔بالکل بدیسی ۔ان کی آنکھوں میں بھی نہ اس دیش کے چاند تھے نہ سورج ۔کچھ عجیب سی ایک ان دیکھی روشنی کی بِکھری بِکھری کرنیں تھیں، جو کہیں نہ کہیں مجھے چُبھ رہی تھیں ۔وہ پلٹیں میری طرف اور بالکل ہی ایک غیر رسمی انداز میں پوچھ لیا ۔"اب ہم کیا کریں گے؟ چلو کچھ پیتیں ۔کیا پیوگے؟ ۔" گھڑیال کے گھنٹے بجنے لگے، ٹن، ٹن ۔ٹن ۔میں نے ان گھنٹوں سے زیادہ ان کے اس سوال پر چونک کر نظریں اٹھائیں اور گھڑیال کی طرف دیکھا، ۶ بج رہے تھے ۔اس سے پہلے کہ میں جواب دے پاتا، انھوں نے کہا ۔

"میرے پاس ایک بہت ہی قیمتی ڈرنک آئی ہے ۔کولرج نے بھیجی ہے ۔بڑی ہی خوبصورت بوتل بھی ہے اس کی ۔دیکھو گے تو مچل جاؤ گے ۔اور اس کے ساتھ ایک نئے مزاج کے رنگوں کا بنا ہوا Tag ہے ۔اس پر اس ڈرنک کے کیریکٹر کا ایک

پورٹریٹ بنا ہوا ہے۔ ڈرنک کا کیریکٹر ...." وہ ہنسنے لگیں۔

میں نے ایک ڈوبتی سانس میں کہا۔" ڈرنک کا کیریکٹر ......" وہ مچل پڑیں اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ زور زور سے ہنسنے لگیں۔ پھر کہا۔ " A noble breed" اور پھر ہنسنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے کہتا کہ میرے خشک حلق کو کوئی اور ڈرنک نہیں، صرف ٹھنڈا پانی چاہیے، وہ خادمہ آگئی اور میڈم نے اس سے صرف اتنا کہا۔" لے آؤ۔" جیسے ساری ہدایات میڈم نے اس کو بہت پہلے ہی دے رکھی تھیں۔ خادمہ چلی گئی تو ذرا ہنستی ہوئیں میڈم پیچھے صوفے کی طرف ڈھلک گئیں۔ اور بڑے ہی ہلکے پھلکے لہجے میں کہنے لگیں۔

" وہ کولرج ہے نا؟ وہ ایسا ہی ہے۔ بس ناولٹیز کی دُھن رہتی ہے اس کو۔ دیکھو بوتل کے اس رنگ برنگے ٹیگ پر لکھا ہے۔

" The first feel-Alpine forest breeze"

ان کی ان باتوں سے مجھے پتہ نہیں کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے قدم اُکھڑ رہے ہیں۔ اور میں اب وہاں سے چلا جانے والا ہوں۔ میڈم نے بڑے ہی مطمئن انداز میں اپنا ہاتھ میری کلائی پر رکھا اور کہا۔" میں شاید کچھ دن میں لندن چلی جاؤنگی۔ As a visiting professor in London university - میں اچانک کچھ زیادہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

انھوں نے اپنی بات جاری رکھی۔" اور میں سوچتی ہوں کہ تم کو اپنے اس کالج میں کام مل جائے، تم قابل ہو اور کوالیفائیڈ بھی! I know the people here میں کوشش کروں گی۔"

میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ میں کن کن راستوں سے گزر رہا ہوں۔ تب انھوں نے ایک اور سوال کر دیا" کیا تم کیمبرج یا آکسفوڈ میں پڑھنا چاہو گے؟"۔

میڈم اگر میری کلائی تھامی ہوئی نہ ہوتیں تو میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا کہ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ یہ کیسی راہیں آگئیں ہیں سامنے۔ بہت سارے راستے ہیں۔ میں تو پیچھے، پیچھے، بہت ہی پیچھے چلا جانا چاہتا تھا وہاں تک جہاں سمی رہتی ہے۔" دھڑکنوں میں ایک دردِ سوا ہوتا تھا ہر گھڑی"۔ جس پر خود میں نے بہت کم

غور کیا تھا، لیکن تھا وہ درد۔

میرا کوئی جواب نہ سن کر میڈم نے کہا۔ "میں وہاں جانے کے بعد تم کو بتاؤں گی۔" Nothing like future the great, dear " ۔ اب میں ذرا ہمت کر کے ان کی طرف کچھ غور سے دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ خادمہ ایک زرق برق قسم کی ٹرالی لے آئی اور ہمارے سامنے لگادی۔ میڈم ٹرالی کی طرف جُھک گئیں۔

مجھے خیال آیا اب مجھے وہ ڈرنک پینی ہے۔ میں کیسے پیوں؟ کتنی پیوں؟ کب تک پیوں؟۔ اور پھر ولی میڈم کے ساتھ؟ ایک لیڈی کے ساتھ؟ پھر مجھے ایک گمان سا ہوا۔ جیسے دل میں کوئی چور ہو۔ شراب تو ہر عورت کی ہر عمر کو جوانی کی گپھاؤں تک واپس لے آتی ہے۔ میں ان خیالوں میں، اپنے اندر ہی اندر بکھر رہا تھا، لیکن اچانک ایک لمحے کے گزرنے گزرنے تک، ایک گرم لہر سی اٹھی میرے اندر اور میں جس تیزی سے بکھر رہا تھا اتنی ہی تیزی سے سمٹ آیا، ایک نقطے پر۔ اور ٹھان لی کہ ایک ہی سانس میں کہہ دوں۔ "میڈم میں نہیں پیتا شراب، مجھے اجازت دیجیے۔" میرے دست و پا میں ایک حرارت سی محسوس ہوئی اور، اور ایک جنبش بھی۔ ٹھیک اس لمحے پر میڈم جو ٹرالی کی طرف جھکی ہوئی تھیں، پلٹیں میری طرف اور میرے سامنے وہ ایک ساغر تھا، اس کے اندر جیسے میں خود ابل رہا تھا۔ ایسے میں انھوں نے اپنی ان آنکھوں میں بھی کچھ زیادہ ہی روشنی پیدا کر لی، جن میں کالا جادو بھرا تھا۔ ان آنکھوں میں مجھے ایک پھن نظر آیا، ایک ناگن کا۔ میرا وجود جو ایک عزم بن کر ایک نقطے پر سمٹ آیا تھا پانی پانی ہو کر بہنے لگا ایک چٹان پر اور چٹان کے نیچے مٹی میں جذب ہونے لگا۔ میڈم نے تو ایک بجلی کے سے کوندتے لہجے میں کہہ دیا۔ "چیرز --- چیرز --" وہ بے حد مسرور لگیں، ان کے چہرے پر ان کی آنکھوں میں، ان کے گالوں پر اور ان کے ہونٹوں پر ایک ایسی ہنسی پھیلی ہوئی لگی جیسے ان کے اندر ایک تڑپ، ایک بیتابی کی لہر اُٹھی ہو۔ " Let us drink " انھوں نے اپنا گلاس میرے گلاس سے اس طرح ٹکرایا، جیسے ان کے اندر بھی کچھ بج اٹھا ہے۔ میرے ہونٹوں سے میرا گلاس ایسے جا لگا جیسے میں پہلی بار پی رہا ہوں۔ انھوں نے بھی ایک چسکی لی اور ایک احساس مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ " OOh - Breeze from Alpine

Forest تب بڑے ہی منجھے ہوئے انداز میں ایک بڑا گھونٹ لیا۔ اور میری طرف دیکھ کر مطمئن ہو گئیں۔ میں بھی اب اپنی رفتار پر آرہا تھا۔ پھر وہ خوبصورت چوبی ڈبیا اٹھائی انھوں نے اور وہی لمبے سگریٹ میری طرف بڑھا دیے۔ میں نے سگریٹ لے لیا اور اس بار پتہ نہیں کیسے میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر وہاں تپائی پر رکھا ہوا لائیٹر اٹھالیا، جلایا اور کچھ آگے بڑھ کر اس کا شعلہ ولی میڈم کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے سگریٹ اپنے ہونٹوں پر رکھا اور کچھ جھک آئیں لائیٹر کے شعلے کی طرف۔ پتہ نہیں میں نے ان کو کس نظر سے دیکھا، ان کے چہرے کے رنگ مجھے کچھ بدلے لگے اور نقوش بھی۔ میں نے شعلہ بجھا دیا اور اپنا گلاس اٹھالیا۔

" Like the punch ? A pick me up rather " انھوں نے پوچھا۔

" A flash flood, madam " میں نے کچھ کھلے لہجے میں جواب دیا۔

میڈم نے قہقہہ لگایا۔

" Oh, You are an indian version of that Coleridge"

ہنستے ہنستے ہی میڈم نے کہا۔ جانتے ہو، کولرج ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ چھپے چھپے ڈنک مارتا ہے۔ میرا دوست بھی ہے تو بہت اچھا۔" A learned man " لنڈن یونیورسٹی میں ہسٹری پڑھاتا ہے۔ کیمبرج میں میرا کلاس فیلو تھا اور آج بھی ویسے ہی لگتا ہے۔ ویسا ہی ہے۔

" A stormy guy, I love him, I love him." ۔ انھوں نے ایک بڑا گھونٹ لیا اور نظر اٹھا کر سامنے دروازے پر لٹکے ہوئے اس دھنک رنگ پردے کو گھورنے لگیں۔ ان کی اس بات پر میں نے بھی ایک عجیب جذبے کو اپنی ڈرنک میں ملا کر اس کے ذائقے کو بڑھا لیا کہ میرے ذہن میں جو کچھ شکوک کے چھوٹے چھوٹے بلبلے پھوٹ رہے تھے اب وہ باقی نہیں رہے تھے اور اب اندر اتر جانے والی شراب کی سطح بڑی شفاف لگ رہی تھی۔

خیال آیا میڈم کی دھڑکنوں میں کوئی طرّاری نہیں ہے، ان کی دھڑکنوں میں تو ایک لنگ ہے" Limping heart " اب دل کی رفتار بڑھ بھی جائے تو شاید

وہ اپنی کچھ ٹوٹی پھوٹی یادوں کے ریزوں کو اکٹھا کریں گی اپنے ہاتھوں میں اور مجھ سے کہیں گی ۔ " دیکھو ۔ دیکھو کیسے ایک زلزلہ آگیا اور اور صرف میرے پُر شکوہ قصر کو، محل کو ڈھیر کر گیا ۔ " بس اب وہ کچھ ایسا کہیں گی تو میں بھی ایک قدیم محل کو دیکھنے کے اشتیاق کے ساتھ ان کو سر سے پیر تک دیکھوں گا اور سوچوں گا کہ اس ڈھیر میں کیا کچھ باقی رہ گیا ہے ۔ دو لمحوں میں ہی میں محسوس کرنے لگا کہ وہ ایک عجیب و غریب احساس کے بوجھ سے، جو وہاں میڈم کے وجود اور ان کی قربت سے مجھے زیر کیے ہوئے تھا، میں آزاد ہو گیا ہوں ۔ میڈم کی کہی ہوئی اس بات نے مجھے ایک بڑا ہی لطیف احساس دے دیا ۔ میڈم نے پردے کی دھنک سے نظر ہٹا کر مجھے دیکھا اور کہا ۔

" Oh, I love him " میں جب اس کو بے حساب چاہنے لگی تھی تو وہ بھی اتنی ہی شدت سے مِرانڈا کو چاہتا تھا ۔ اوہ، وہ "مِرانڈا" ۔

" She was just a storm in his tea cup, But very cute, so coquettish Ah, a slut, So torrid in her exposure. "

ان باتوں کو سن کر میرے ذہن میں کچھ ایسے گرد آلود خیال اٹھنے لگے جن کو میں صرف اپنے رومال سے صاف کر سکتا تھا ۔ اس گرد کو صاف کرنا بھی ضروری تھا ۔ لگتا تھا کہ کہیں اس کی تہیں میرے شفاف ذہن پر جمنے نہ لگ جائیں ۔ وہ تو صدیوں پرانی رقابت کے جذبے کا اظہار تھا، جو مشرق سے مغرب تک ہر ذرے میں ملتا ہے ۔ اس سے پہلے کہ میڈم اپنی انگلش کو کچھ اور کتابی بنائیں، میں نے آگے جھک کر اس ٹرائی سے وہ خوبصورت بوتل اٹھالی ۔ جس کی پتلی کمر اب میرے ہاتھ میں تھی، اور کچھ روشن روشن سینہ میری انگلیوں کو چھو رہا تھا ۔ وہ بوتل تو واقعی ایک زجاجی مجسمہ تھی، کسی دوشیزہ، ہوش ربا کا ۔ جس کو حسن و شباب کی کچھ زیادہ واضح بیتابیوں کے ساتھ بنایا گیا تھا ۔ میں نے سوچا یہ وہی کولرج کی مِرانڈا تو نہیں، ایک حسن بیتاب اپنی تب و تاب کے ساتھ، اس Torrid exposure میں ۔ میرے ہاتھ میں جیسے وہ بوتل مچل گئی ۔ میں نے میڈم کا گلاس اٹھایا اور اس میں شراب کی موزوں مقدار انڈیلی ۔ میڈم کی کچھ سلگتی آنکھوں کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا پڑیں، اپنی جلتی آنکھوں کے باوجود ۔ لیکن جب میں نے ان کی طرف گلاس بڑھایا تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور

مجھے دیکھا اس طرح جیسے ایک شکست کا شدید احساس ان کی روح کو ان سے جدا کر رہا ہے۔ان کی آنکھوں میں کچھ ایسا ہی اظہار تھا جیسے کوئی زہر بھرا خیال ان کو بار بار ڈس رہا ہے۔اس بار میرا ہاتھ جو انھوں نے پکڑ رکھا تھا، اس سے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے صرف غمخواری کی توقع رکھتی ہیں۔میں نے اس بار کچھ بے تکلفی کے ساتھ اپنا گلاس اٹھایا اور ان کے گلاس سے ٹکرا دیا۔اور کہا۔cheer up madam وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔اپنے گلاس کو اوپر فضا میں اٹھادیا، اور اسی طرح کھڑے ہوئے گلاس اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔شراب تو سچ مچ دھنواں دھار تھی۔ہر احساس ہلکے ہلکے رنگ کی ایک لہر بن رہا تھا۔ہال کی روشنی بھی کچھ روئی کے گالوں کی طرح اڑتی اڑتی نظر آرہی تھی۔میڈم کو اس وقت اپنی قدیم لیکن آج بھی بار بار یاد آجانے والی رقابت کی آگ کو سرد کرنے کے لیے شاید بہت ہی ٹھنڈی شراب کی ضرورت تھی۔انھوں نے تیزی سے ایک اور گھونٹ لیا اور پھر میرے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں، اپنے آپ کو ذرا کم سنبھالتے ہوئے۔میں نے اپنے آپ کو ان سے کچھ پرے لے جانے کے لیے ٹرالی پر جھک کر وہ چوبی ڈبیا اٹھالی جس میں سگریٹ رکھے تھے۔میڈم کو میں نے سگریٹ پیش کیا۔انھوں نے کہا۔

" Yes, Let us smoke off this long fag Coleridge

ہاں پی لیں اسے۔تم کو ایک اور بات صاف صاف بتادوں۔"

" That Coleridge of a dud خوب خوب جانتا ہے کہ میں اس کی دیوانی تھی"Mad - Mad " ۔میڈم کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔کہنے لگیں۔" وہ سمجھتا ہے کہ میں آج بھی۔آج بھی اس کی دیوانی ہوں۔اسی لیے تو وہ دنیا بھر کی ناولٹیز بھیجتا ہی چلا جاتا ہے میرے پاس۔میرے لیے۔بتاؤ .... بتاؤ۔یہ کیا ہے، نفرت یا پیار۔یا نفرت سے بدتر ایک ہمدردی؟ ہمدردی ....!

" Oh, the unkindest cut - in the words of that vile Bard. What a gash! "

میں اب کچھ زیادہ سنبھل گیا۔کیونکہ میرے اندر اتری ہوئی شراب کی زیادہ

مقدار بڑی ہی تیزی سے میرے تلووں میں محسوس ہونے والی نمی میں تبدیل ہونے لگی اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب میڈم اپنی بدحواسی میں وہ قدیم شاعر شیکسپیر کی طرف دوڑ رہی ہیں، اپنے علم کی طرف۔ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا بس ان کا علم تھا یا پھر ایک گرتی دیوار جیسا عشق۔ اور پھر علم ہوتا ہی کیا ہے، صرف ایک بہانہ، عشق کی تلخ ترین محرومیوں اور ناکردہ گناہوں کی اذیتوں سے بچنے کے لیے جائے پناہ۔ علم تو جسم و جان کی ساری لذتوں کو کتابوں میں دفن کر کے کرم خوردہ مٹی کے حوالے کر دیتا ہے۔

میں اپنے ان خیالات سے چونک پڑا، اس احساس کے ساتھ کہ میڈم کی کہی ہوئی باتوں میں آ کر میں کیوں ان کھنڈرات کی طرف جا رہا ہوں۔؟ میں نے اس خیال کے ساتھ اپنے گلاس کی پوری شراب ٹانچ لی۔ میڈم زیر لب کچھ کہہ رہی تھیں جیسے کولرج اور شیکسپیر کو اپنی شستہ انگلش کے بلند آہنگ الفاظ سے نواز رہی تھیں۔

پھر اچانک اپنے لہجے میں ایک نیش زنی کا سا انداز پیدا کرتے ہوئے تیزی سے کہنے لگیں۔

" I hate – I hate all these so called learned men–
and their crude – barbaric dignity_grace – pooh–
oh, smash all that – And see this fopish brand–
a cultured-noble Coleridge ! Ah, spit on him–
Tag him as a call boy – a hireling – Eh."

پھر پتہ نہیں کس طرح اچانک سنبھل گئیں۔ بالکل جیسے یہ ساری بات انھوں نے نہیں کہی ہے۔ یا ان کو یکلخت کوئی بات یاد آ گئی ہے۔" اوہ، اوہ، وہ تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔" دیکھو ہم کتنے قدیم ہیں آج بھی، بالکل اپنی اصلی شکل میں۔ تم ایک Caveman تھے، میں ایک Cave woman ہوں۔ اور ہم کو کچھ بنایا ہے تو ہماری اس ازلی خواہش نے۔ اسی خواہش کے روپ میں ہم کلچرڈ ہیں۔ دیکھو "That bloody cultured brat coleridge" اس نے میرے پاس ایک تحفہ بھیجا تھا، ایک آرٹ پیس۔ ہمارے آرٹ نے ہم کو کلچرڈ نہیں بنایا، آرٹ نے تو ہم کو بتایا ہے کہ ہم کتنے Uncultured ہیں، کتنے Original ۔" میڈم جلدی سے سامنے والے دروازے سے اندر چلی گئیں۔

شراب کی پیدا کی ہوئی کیفیتوں نے میرے سارے وجود کو بہت ہی جان دار اور مزاج دار بنادیا تھا۔ میں نے میڈم کے واپس آنے تک اپنے ساغر میں کچھ اور شراب بھرلی اور دوسرا ایک سگریٹ بھی جلالیا۔ میں اس بوتل یعنی اس زجاجی حسینہ کے مجسمے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھاکر دیکھنے لگا۔ آر پار، بہت ہی قریب سے۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خود بھی ایک زجاجی مجسمہ ہوں اور وہ حسینہ بھی مجھے کچھ ویسی ہی نظروں سے دیکھ رہی ہے، آر پار واقعی ہم بالکل وہی ہیں، ہر طرح، جیسے ہم اپنے وجود کے کانچ کے اندر پورے کے پورے نظر آجاتے ہیں۔

میڈم بڑی ہی تیزی سے واپس آئیں۔ وہ بڑی مسرور بھی لگیں اور کچھ مغرور بھی کہ "دیکھو، دیکھو یہ ہے وہ آرٹ پیس"۔ وہ بھی اس شراب کی بوتل کے سائز کا ایک مجسمہ تھا۔ کچھ مدھم مدھم رنگ و روغن سے بنایا ہوا۔ ایک حسنِ مغموم کی جوانی کی مکمل اور تر و تازہ شکل میں ڈھلا ہوا۔ مجسمے کے نچلے حصے پر لکھا تھا۔

" Statue of Venus from Pompeii, found in an old brothel."

میڈم نے کہا۔ "دیکھو صدیوں سے یہ ننگی ہے، عریاں ہے۔ اور آج بھی وہ ایسی ہی ہے۔ دیکھو .... آج بھی ..... وہ کولرج کی مِرانڈا جیسی .... مِرانڈا جیسی ہے .... مِرانڈا!!!" وہ چیخ پڑیں۔ دیکھا یہ ہے وہ مِرانڈا ..... " وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اچانک انھوں نے شراب کی بوتل اٹھائی اور ایک اضطراری کیفیت میں اپنے گلاس میں شراب انڈیلی اور ایک ساتھ دو تین گھونٹ لے لیے۔ میرے نشے کے باوجود مجھے خیال آیا۔ "اتنی شراب! اور یہ بانس جیسی سوکھی ساکھی عورت۔ رقابت کی آگ سے پہلے شاید شراب کی آگ ہی اسے جلا ڈالے۔" بڑی ہی لاپروائی اور بڑی ہی بے دردی سے اس مجسمے کو انھوں نے دوسرے صوفے پر پھینک دیا اور ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔ "آہ یہ آرٹ، یہ کلچر، یہ علم All false, just fraud اُف" کہتے ہوئے وہ پیچھے صوفے پر لُڑھک گئیں، جیسے ایک تھکن سی محسوس ہوئی ہو آنکھیں بند کرلیں اور جانے کس جذبے کے ساتھ اپنے پیرہن کے اس حصے کے بٹن کھول دیے جو ان کے سینے کی بے شکلی کو ڈھانکے ہوئے تھا۔ میرے اندر اُتری ہوئی

شراب، میرے رگ و پے میں دوڑنے والی شراب، سمٹ سمٹا کر واپس میرے حلق میں آگئی، مجھے اپنی سانس کچھ رکی رکی سی لگی۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے اپنی نظریں بھی پھیر لیں۔ لیکن پتہ نہیں وہ کونسا جذبہ تھا کہ اس یقین کے ساتھ کہ وہاں شاید ہی کوئی پرکشش شئے نظر آئے، میں نے پھر اپنی نظریں اٹھائیں، اور ان کے سینے کے اس کھلے حصے کو بھی دیکھا۔ وہ کیا بات تھی کہ اس طرح دیکھنے میں بھی ایک لذت سی محسوس ہوتی تھی، جیسے کسی پوشیدہ یا ممنوعہ شئے کو چوری سے دیکھنے سے ہوتی ہے۔

اچانک میڈم نے اپنی آنکھیں اس طرح کھول دیں جیسے ان کی بند آنکھوں میں ایک یقین تھا چھپا ہوا کہ میری نظریں ضرور ان کے پیرہن کے اس کھلے حصے پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھیں اور میری طرف اس طرح جھک آئیں جیسے ان کو اپنے آپ پر کوئی قابو نہیں، میں سہم سا گیا۔ ان کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی لیکن ان کے ہونٹوں پر کچھ ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جس نے مجھے ایک یقین دلا دیا کہ میں تو دراصل بے حساب وسوسوں کا شکار ہوں۔ اس مسکراہٹ کے ساتھ وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھ سے کہا۔

" Enjoy yourself – Back in a jiffy I am " اور دیکھتے دیکھتے وہ اس سامنے والے دروازے میں غائب ہو گئیں۔

گھڑیال کے گھنٹے بجنے لگے۔ زور زور سے اور لگا وہ تو مسلسل بج رہے ہیں۔ ۱۲ تو کب کے بج چکے ہوں گے۔ یہ گھنٹے تو رات کے سناٹوں کی گونج لگتے تھے جن کے ساتھ میرے خیال بھی گونج رہے تھے۔" دیکھو اس انسان کو جو ایک جسم لے کر پیدا ہوتا ہے، صرف ایک ڈھانچہ ہوتا ہے، ایک خول ہوتا ہے، جو بہت زیادہ بدوضع بھی ہوتا ہے اور بھیانک بھی۔ اور بہت ہی زیادہ وضع دار بھی، بانکا بجیلا، رنگیلا، پرکشش اور پرنور بھی، جو بے پناہ نشے کی شکل میں چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ یا پھر پتھر کی طرح بدرنگ، بے رنگ، کبھی کبھی بڑا ہی ملگجا۔ لیکن اس پتھر کی بھی ایک تیز دھار ہوتی ہے، ایک احساس جیسی، جو کسی اور شئے کو نہیں اپنے آپ کو کاٹ دیتی ہے، اسی لیے اس پتھر کے لیے شاید ہی ہم میں کوئی احساس جاگتا ہے۔ نہ اس کا کوئی واضح نقش نہ اس کی کوئی وضع۔ ویسے جوانی تو پتھر پر بھی آتی ہے۔ اس کو کسی کی نظر بھی لگتی ہے اور

اس نظر سے وہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن اس وجود کو کیا کیجیے جو سوکھے ببول کی طرح جنگل میں کھڑا کسی کی ایک نظر کا حقدار بھی نہیں لگتا۔ وہ تو اپنے غم کا کوئی سچا احساس بھی نہیں بن پاتا۔ کیا المیہ ہے، غم بھی معتبر ہوتا ہے تو صرف حسن کا ہوتا ہے، احساس نشاط بھی باوقار بنتا ہے تو حسن ہی کا بنتا ہے۔ اُف رے وہ حسن، کسی زجاجی جسم کا! رنگ شباب سے دمکتا ہوا، عشوہ و ناز و ادا کی تمکنتوں سے مرصع۔ یا الھڑ پن کی بے خبریوں میں سنبھلا، سنبھلا، بہکا، بہکا۔ یا پھر سنگ سیاہ میں ڈھلے جسم میں کوندتی ہوئی سخت جان بے قراریوں کا حُسن جس میں اظہار ہوتا ہے، پتھر کی عریانی کا۔ اور یہ سب کچھ نہ بھی ہو تو جوانی جیسی عمر کی چڑھتی ہوئی لہلہاتی بیل کی سرسبز فسوں گری کا حُسن، بس ایک حسن ہی حُسن، کوہ و دمن سے لے کر صحرا و قریہ و شہر تک۔ حسن ہی کی تو داد و دہش تھا وہ جذبۂ کوہکنی۔ حسن کی فقر نوازی ہی کی تو دین تھا وہ صادق جذبۂ صحرانوردی۔

اس عالم شش جہت سے وسیع تر ہے یہ اقلیم عشق و جنوں، پھر بھی بہ عجز و احترام یہ سرنگوں ہے پائے حُسن پر کہ رواں دواں رہے یہ کاروبار حیات، یہ کارزار حیات، حسن کی ایک ادائے بے نیازی سے، عشق کے سُرور بے نوائی سے۔ خواہ وہ خار زار حیات ہو یا مرغزار شباب، تاریخ کا خامۂ حق شناس تو رقم کر ہی دے گا۔ قصص حسن و عشق، خواہ ان کا تعلق سرائے آوارگان زیست سے رہا ہو یا ایوان ہائے شاہان وقت سے، اور رقم بھی کرے گا تو اس طرح کہ رزم ہائے خاقان ہیچ، اور بزم ہائے فاتحان علم و دانش ہیچ۔ کتنی بلند مقام ہوتی ہے یہ حسن کی ضو افشانی کہ ساری دنیا کے رنگ، ساری دنیا کی روشنیاں اس سے بنتی ہیں، پروان چڑھتی ہیں، قائم رہتی ہیں۔ لیکن اس نظم نظر و ہوش کی تابانیوں سے حیات انسانی کو محروم کر دو، اس کے رخ زیبا کو دھندلا دو، اس کو بے وجود کر دو تو دنیا کا یہ ڈھانچہ، یہ خول کیسا بے رنگ و نور، بھیانک، وحشت انگیز اور ویران ویران سا ہو جائے گا کہ وقت بھی اس کے ساتھ ایک سانس لیتی ہوئی لاش لگے گا۔ پھر کون آئے گا اس ویرانے میں۔ سب بھاگ کھڑے ہوں گے آسمانوں کی طرف۔

لیکن یہ میڈم، بانس جیسی شخصیت، ان کا نکیلا پن، اچھا خاصہ پوشیدہ۔ ہاں یہ

تراشیدہ بال اور ان کی نئی تراش کا عکس ان کے چہرے پر۔ اور وہ ان کی آنکھوں میں
کالا جادو۔ جیسے وہاں کوئی قدیم معبد ہے، جس کے سامنے بنی ایک قربان گاہ کی بھٹی
جل رہی ہے۔ اور سیاہی لیے ہوئے شعلے ان کی کالی آنکھوں میں کالے ناگ کے پھن
جیسے لگ رہے ہیں۔ ان آنکھوں میں کسی ساحرہ کی علمیت بھی ہے، جیسے کسی جنگل کی
جڑی بوٹی۔ ناگ کے کاٹے کا علاج۔ ایسے میں مجھے ضرور خیال آیا تھا کہ میرے سگریٹ
کے نیلگوں دھوئیں میں جو ایک ولایتی مہک تھی، اور اس نور و رنگ سے بنی شراب
میں بہکی بہکی سانسوں کی جو تپش تھی، اور میرے اندر اس رات کے سناٹوں کی
جو گونج تھی، وہ سب پتہ نہیں مجھے کہاں لے جاتیں، شاید ان پہنائیوں میں جہاں ایک
انسانی وجود صرف ایک احساس بن جاتا ہے اور جو زندگی کی لذتوں سے بھرپور ہوتا
ہے۔ میں شاید اپنے وجود سے اب بے خبر ہو رہا تھا، اور صرف ایک احساس اور خیال
بن کر اپنے وجود کی ہر گرفت سے آزاد ہو رہا تھا، چلو کہ راستہ تو وہی راستہ ہوتا ہے جو
منزل کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔

میں نے اپنی بہکی بہکی نظریں اٹھائیں تو میڈم میرے سامنے تھیں۔ اُف وہ
منظر، میڈم تو گلو تا قدم ایک راز سربستہ تھیں۔ کچھ دیر پہلے ان کے پیراہن کے کھلے
حصے سے میری نظروں نے جو گستاخی کی تھی کہیں وہی تو ایک گہرے رنگ کا احساس
نہیں بن گئی تھی ان کا، جس میں وہ اپنے سارے جسم کو محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔ کچھ
ایسی ہی بات ہوگی۔ بڑا ہی زرق برق گون تھا ان کا، جو وہ زیب تن کیے ہوئی تھیں۔
لیکن میری نظروں میں اب وہ یارا کہاں تھا کہ اس چمک دمک کی تاب لا سکتا، میں نے
کچھ ایسی ہی بکھری بکھری نظروں سے میڈم کی طرف دیکھا کہ مجھے اصل میں کوئی واضح
نقش یا واضح رنگ نظر نہیں آیا۔ میڈم نے میری ان نظروں کو دیکھا جن میں صرف
ایک راستہ ہی راستہ تھا اور کسی منزل کا گمان تک نہ تھا اور نہ ہی کسی منزل کی آرزو
ہی تھی۔ اُف ان کی نظروں میں تو ایک جہان آرزو کے ماہتاب بھی تھے اور آفتاب بھی
ہر طرف ایک روشنی ہی روشنی تھی۔ انھوں نے شراب کی وہ خوبصورت بوتل اٹھائی
اور دیکھا تو شراب کے کچھ ہی قطرے بچے ہوئے تھے جو اس بوتل نما عریاں مجسمے کی آبرو
بنے ہوئے تھے۔ وہ کچھ اس طرح ہنس پڑیں کہ یقین ہوتا تھا کہ ان کی ہنسی میں ان کی

آرزوؤں کی تکمیل کی اور اس تکمیل کے یقین کی بے پناہ لذت شامل تھی۔ انھوں نے ایک بڑے ہی بے قابو احساسِ مسرت کے ساتھ کہا۔

Let these last drops finish us – Oh Yes–the finish

انھوں نے دونوں گلاسوں میں وہ آخری قطرے ڈال دیے اور ہم دونوں نے بس ایک ہی لمحے میں وہ قطرے حلق میں اتار لیے۔ میڈم نے کچھ زور سے اپنا گلاس ٹرالی پر پٹخا اور ...... اور میرے ہاتھ سے میرا گلاس لیتے ہوئے میری کلائی تھام لی۔ بولیں ...... "چلو اور پئیں، رات بھر پئیں۔ چلو، بہت سی شراب ہے اندر ...... چلو ......" میرا ہاتھ پکڑ کر انھوں نے مجھے صوفے سے اٹھایا اور اب خود اس طرح لڑکھڑائیں کہ میرا سہارا لے لیا اور چلنے لگیں اس دروازے کی طرف جو سامنے تھا۔ اس ہال میں تھے ہم جہاں وہ موتی کی چمک جیسی روشنی کی کرنوں میں وہ نیلا آسمان نظر آرہا تھا جو اس وسیع و عریض فرش کی طرح پھیلی ہوئی مسہری پر چھایا ہوا تھا۔ مسہری کا مخملیں پھیلاؤ تو ایک جہانِ خیال و خواب کی بے جہت وسعتوں کی طرح لگتا تھا۔ میں اپنے آپ سے کچھ بے خبر بھی تھا اور باخبر بھی۔ بس وہ ایک احساس تھا میرا جو میری بصارت بنا ہوا تھا۔ جو کچھ مجھے محسوس ہو رہا تھا، وہ میں دیکھ رہا تھا۔ میرے اندر جیسے ایک جھکڑ سا اٹھا اور میری باہنوں میں وہ ایک بدن تھا، جو نرم تھا، گرم تھا، اور دبیز بھی۔ میرے ذہن میں ایک سوال سا اٹھتا لیکن خود ہی اپنا جواب بن کر میری نظروں کے سامنے آجاتا۔ یہ سب کیا تھا؟؟ میڈم کی روشن جبیں، ان کے پپوٹوں پر ہلکی نیلگوں چمک کے ساتھ، کاجل کی ہلکی سیاہ دمک لیے خمدار پلکیں، صفِ مژگاں، خم ابرو کی سیاہی کا عکس بنی ہوئی۔ گال اور رخسار پر گداز گداز سرخیوں کی تہیں۔ ناک پر تو ہلکی ہلکی شباب آور نمی پھوٹتی ہوئی اور ہونٹوں پر وہ جامنی رس، جو زباں سے گزرے تو جوش وجنوں کا نشہ بن جائے اور اندر سب کچھ تہہ و بالا کر دے۔ اور ان کے سخت جان شانوں پر کسی ثمر آور پیڑ کی ترو تازگی کی مہک تھی، لیکن دہائی اس ہوش و فسوں کی کہ اس مقام پر جہاں سے گزرنے کو نظریں کچھ دیر پہلے پس و پیش کرتی تھیں، وہاں اب جو کچھ بھی تھا، دشمن ہوش تھا، وہاں تو ایک شبابِ مکمل کی گولائیاں تھیں، زندہ، تابندہ، رکتے بڑھتے تنفس کا تلذذ لی ہوئیں۔ ساتھ ہی میڈم کی کالے کالے زاویوں والی نظروں میں

وہ کیسی چمک آ گئی تھی جو ان کی پلکوں کی پرکاری سے کبھی خمارِ شباب بن جاتی اور کبھی خمارِ شراب۔ کچھ سیال سی سرخیاں بھی تھیں، جن کے بیچ ایک لکیر سی بن جاتی، سبز بھی اور سیاہ بھی۔ زہر رنگ۔ وہ نظریں تو ہوش و خرد کی نوخیزی بھی بنتی تھیں اور شبابِ تازہ کی منہ زوری بھی۔

یہ سب کچھ کیا تھا، کسی تپتے ریگزار میں تشنگی کے بنائے ہوئے سراب، یا رگوں میں دوڑنے والی اس آتشِ سیال کے بنائے ہوئے گرداب یا پھر نئی تہذیب کے سائنسی کرشمے، سائنسی برکات۔

ہر طرف خاموشی تھی، بس آہ و کراہ تھی سناٹوں کی۔ کہاں کچھ تھا، جہاں بھی کچھ تھا نہ وہ میرے وجود کا کوئی حصہ تھا نہ میرے احساس کا۔ میڈم تو بس سارے میں پھیلتا ہوا ایک نشہ تھیں جو پھوٹ رہا تھا جسم کے سارے مساموں سے اور تحلیل ہو رہا تھا ساری فضا میں۔

گھڑی بھر کے لیے میری نظروں کے سامنے وہ موتی جیسی کرنوں میں پھیلا ہوا نیلا آسمان آ گیا جو اس زمین کی طرح پھیلی ہوئی مسہری پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اور کچھ نہیں دیکھا۔ ہر شئے میری نظروں سے غائب ہو گئی اور میں کچھ ایسی نیندوں کا ہو گیا جو آنے والی کتنی ہی راتوں اور کتنی ہی صبحوں سے گزر کر بھی نیند بنی رہیں۔

باب (۳۸)

جب میں اس نیند سے جاگا تو یہ ضرور محسوس کرتا رہا کہ میں زندہ ہوں، لیکن میری نظر کے سامنے جو بھی چیز ہے وہ اپنا رنگ کھو چکی ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا رہا کہ میرے جسم کی ہڈیوں میں اگر کوئی مغز ہے تو وہ بھی شراب جیسا سیال بن گیا ہے، اور سارے بدن میں بہنے لگا ہے۔ کچھ عجیب عجیب احساسات اور تصورات سے گزر رہا تھا میں، جیسے سرتاپا میں ایک آگ کا شعلہ ہوں، اور تیز ہوائیں اسے بھڑکا رہی ہیں یا پھر میں دفن کیا جا رہا ہوں برف کی سِلوں کے نیچے۔

میں نے اس طرح تین دن اپنے ہاسٹل کے کمرے میں گزارے، دروازہ بند کیے پڑا رہتا۔ صبح جاگتا اور میں Mess کو اس وقت جاتا جب یقین ہو جاتا کہ سب کالج جا چکے ہوں گے۔ میس سے واپس آتا اور پھر کمرے میں بند ہو جاتا۔ لیکن ایک امید میرے سارے احساسات اور خیالات پر چھائی رہتی کہ اس بند دروازے پر ایک زور دار دستک ہوگی اور ضرور ہوگی، پھر اس دستک کے ساتھ ایک ایسی انسانی چیخ سنائی دے گی جو ایک عالمِ سرخوشی کے ظہور کا سبب بن جائے گی، پھر ایک کائنات وجود میں آئے گی اور کاروبارِ حیات کا آغاز ہو جائے گا۔ اور وہ چیخ ہوگی فرزی کی ...... اس خیال کے ساتھ تو کچھ اتنا چپ ہو جانے کو جی چاہتا کہ بہتر ہے کچھ دیر اپنی سانس بھی روکے رہوں، اور کمرے کی ان بولتی خاموشیوں پر دھیان دوں۔ ان کو غور سے سنوں۔ اچانک لگا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوئی میرے کمرے کے بند دروازے تک آ پہونچا ہے اور اب وہ آنے والا بجائے کوئی ہلکی دستک دینے کے، دروازے کو زور زور سے پیٹنے لگے گا اور دروازے کے پیٹنے میں کوئی غصے کا انداز نہیں ہوگا بلکہ ایک چھیڑ کی ڈھکی چھپی لذت ہوگی۔ ایک سرگوشی کا سا انداز ہوگا۔ میں نے دروازے کو بہت غور سے اور ایک یقین کے ساتھ دیکھا، لیکن ایسا لگا وہ تیز تیز قدموں کی آواز، قدموں کی ایک ہلکی سی چاپ بن کر واپس ہو گئی۔

پھر وہی چپ۔ سناٹا۔ ساتھ ہی لگا کہ میرے کمرے میں ایک دھندلکا سا پھیل گیا ہے اور اب شاید مجھے اپنے احساس پر بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اس احساس ہی کی شاید ایک آواز آئی۔ ایک سسکی، اس سسکی نے مجھے میرے سارے وجود کا احساس دلا دیا۔ وہ سسکی بڑی ہی جانی پہچانی لگی۔ اس میں مجھے چھو لینے کا انداز تھا۔ ایک ایسا لمس جو سارے وجود پر چھا جاتا ہے اور ایک حرارت بن کر زندگی کا یقین دلاتا ہے۔ کس تیزی سے محسوس ہو جانے والی گہرائیاں تھیں اس سسکی میں، جیسے برسوں بہائے ہوئے آنسوؤں سے بنی تھی وہ ایک سسکی۔ اور وہ اب میرے جگر کو کاٹ گئی تھی۔

"ہوں تو سمی ہی" ۔ اس نام پر تو جیسے مکڑی نے جالا سا بن دیا تھا۔ وہ سسکی ضرور وہی نام تھی، بوسیدہ، ریزہ ریزہ، کرچی کرچی۔ پھر بھی وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"میں تو کسی یاد کی گرتی دیوار کا ملبہ ہوں، جس کے سائے میں کبھی ہم ملے تھے اور بچھڑ گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد یہ زمین اپنے محور پر کچھ اس تیزی سے گردش کرنے لگ گئی کہ اپنی دنیا کے سارے سورج، چاند، ستارے اپنے اپنے مرکز سے بھٹک گئے۔ دور دور تک پھینک دیے گئے۔ تم اور میں بھی بے زمین ہو گئے اور کبھی ملے بھی تو خیالوں میں، آسمانوں میں، امیدوں اور آرزوؤں کی جنتوں میں یا پھر تاریک ترین مایوسیوں کی دوزخوں میں۔ اب کیا اتا پتہ معلوم ہوگا تم کو میرا کہ میں کہاں ہوں۔ ہم تو بے نشان ہیں، کس طرح مل سکیں گے۔ کس راہ پر، کس موڑ پر، کس ڈگر پر، کس نگر میں یا کس گاؤں میں یا کس بیابان میں اپنا کوئی نشان چھوڑ کر گزر رہے ہیں ہم اس زندگی سے جو خود بھی اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتی۔"

ایک دھارا بہہ نکلا تھا میرے ان خیالات کا۔ ان وسوسوں کا۔ ایک جھرنا تھا خون کا جو پھوٹ رہا تھا اسی سسکی سے۔ اب یہ جھرنا پتھر پتھر ٹکرائے گا۔ کائی بن کر چمٹ جائے گا بے حس چٹانوں سے۔ اب یہ جھرنا کہیں جا کر بے آب ہو جائے گا۔ سوکھ جائے گا یا پھر بے رنگ ریت بن کر بکھر جائے گا۔

پھر بھی محسوس ہوا کہ اس سوکھی ساکھی ریت کو سیراب کرنے کے لیے اب بھی ایک جذبہ ہے میرے پاس، جو قطرہ قطرہ خون بن کر بہنے لگے تو شاید ایک معتبر وجود بن جائے۔ لیکن میرے دل کی دھڑکنوں کو کب اور کہاں کوئی اصول پسندی یا کوئی پابندی یا وفاؤں کی تہہ داریاں راس آئی ہیں۔ وفا بھی تو فطرت پر جبر قانون ہی لگی۔

اسکول میں میری فطرت کی بے راہ روی پر ہی تو مجھے سزا ملی تھی۔ میں اس سزا کا آج کس قدر مشکور ہوں، ممنون ہوں کہ زندگی کے کڑے اصولوں کی خلاف ورزی نے مجھے وہ سزا دلائی تھی کہ سزا پا کر میں راہ راست پر آجاؤں۔ کون جانتا ہے کہ راہ راست کیا ہوتی ہے، یا پھر ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔؟ اس سزا نے تو مجھے تم سے ملا دیا تھا وہ بے راہ روی مجھے تم تک لے آئی تھی۔ تم میرے سامنے تھیں، گاؤں کی شام کا جھٹپٹا بنی ہوئی۔ اور اس شام کو روشن کرنے والا ایک چراغ۔ کل تو اس چراغ کو ٹھیک سے جان نہیں سکا تھا، سمجھ نہ سکا تھا لیکن آج سوچ سکتا ہوں، سمجھ سکتا ہوں اس چراغ

کو۔

کس تیزی سے تم نے زمین سے پھوٹ پڑنے والے جھرنے جیسے ایک جذبۂ بے اختیار کے ساتھ اس چراغ کی لَو پر اپنا سرخ و سفید ہاتھ رکھ دیا تھا، ایک یقین کے ساتھ کہ ہونے والا اندھیرا تو ایک سچے جذبے کی چکاچوند سے عمر بھر روشن رہے گا۔ اور زندگی کی ہر راہ اور ہر موڑ ہماری نظروں کے سامنے روشن رہے گی۔

لیکن آج ان بے رنگ و نور اور ان بے کفر و لمان قسم کی کیفیتوں میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے میرے بیچ اب کتنے کڑے کوس حائل ہیں۔ دھندلاہٹوں کے، تاریکیوں کے، بھول بھلیوں کے، میری بے راہ روی کے، میری بے سرو سامان جفاؤں کے، بے وفائیوں کے، میری فطرت کی بسی بسائی بستیوں کے۔ لیکن ضمیر کے تہہ خانوں میں محبوس آج بھی ایک یقین ہے جو دراصل ہر ایسی کیفیت میں میرا سارا وجود بنا رہتا ہے۔ اور اس ایک یقین کے ساتھ میں آج بھی گرمِ سفر ہوں۔ یہی یقین کہ صرف اور صرف تم ہی ایک مرغزار ہو میری زندگی کے سفر میں، باقی سب ایک لامتناہی ریگزار یا کوئی صحرائے دگر۔ میرا یہ یقین میرا ایک محترم جذبہ ہے ورنہ ضمیر تو سدا سے بہت ساری دقیانوسی، غیر فطری صداقتوں کا نمک خوار رہا ہے، اور ان صداقتوں کی فسوں گری کے ایوانوں کا چوبدار ....

میں پہونچ جاؤں گا، تم تک ایک دن، ان کڑے فاصلوں کے باوجود، اپنے اس یقین کی بنائی ہوئی راہوں پر چل کر۔ اپنے ان خیالات کی ہلکی ہلکی روشنی میں۔

اس خیال کے ساتھ، پتہ نہیں کیسے میری آنکھوں کو میرے اس کمرے کے ماحول میں کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگا۔ میں نے پھر اپنے کمرے کی در و دیوار پر غور کیا۔ اب وہ پھیکے پھیکے، مدھم سے رنگ باقی نہیں رہے تھے۔ کمرے میں نئے رنگ نظر آنے لگے تھے۔ ارغوانی، لاجوردی، زمردیں اور شب تاب کہ میں جس آہ یا واہ کو ایک غلغلہ سمجھ رہا تھا یا سمجھ رہا تھا کہ کوئی مجھ پر آوازے کس رہا ہے، وہ تو میری فطرتِ اول کی آواز تھی، جو مجھ سے کہہ رہی تھی "ہنسو اور جیو" کہ انسان کی غرض اول ہی لذت حیات بنتی ہے اور غرض تو لایموت ہوتی ہے۔ میں نے اپنی اس غرضِ لایموت کے ساتھ وہ رات گزار لی۔

باب (۳۹)

اتنی روشن صبح شاید ہی میں نے کبھی دیکھی تھی۔ لگتا تھا آج ایک نہیں دو سورج طلوع ہوئے ہیں۔ بلا کا درجۂ حرارت بھی تھا اور ہر شئے دوہری تہری چمک دمک کے ساتھ نظروں کو روشن کر رہی تھی۔ اب میری نظر کے سامنے وہ ایک چہرہ بھی تھا، دوسرا سورج، لیکن میری نظر میں وہ تاب نہیں تھی کہ دو گھڑی اس کو جی جگر کے ساتھ دیکھ سکوں۔ لگتا تھا اس چہرے کی تابناکی نے میرے سارے وجود کی تاریکیوں کا قتل کر دیا ہے، کتنا عجیب منظر تھا، تاریکیوں کے قتل کا۔ میرے ہوش و خرد کی گدا گری کو تو اس چہرے کے عکس نے رشکِ منعم بنا دیا تھا۔ وہ کون تھا؟ وہ چہرہ کس کا تھا؟ اس پر تو اس لمحے ایک عجیب تاثر تھا، ایک تردد کا اظہار تھا کہ میں کہیں مرنہ جاؤں جواں مرگ، اور ایسا ہو جائے تو وہ چہرہ میری قبر پر خود کتبہ بن کر میری ہی مٹی میں گڑ جائے گا اور کل ادھر آنے جانے والے لوگ اس کتبے پر کندہ کی ہوئی تحریر پڑھیں گے کہ "ہم دونوں میں سے کوئی یہاں دفن نہیں ہے، اس لیے کہ ہم میں سے کوئی بھی حیاتِ جاوداں کی تمنا کا شکار نہیں رہا ہے۔ آگے بڑھ جاؤ۔"

وہ چہرہ فرزی کا تھا۔ اس وقت فرزی کی آنکھوں میں جو جلال تھا وہ شاید اس فکر کا نتیجہ تھا کہ اس نے تو صحرائے نجد کو ہی اپنی زندگی کی جولانگاہ بنا لیا ہے، لیکن مجھے اس طرح کسی میدان میں بے باگ و بے زنجیر کیسے چھوڑ دے۔

اس نے اپنے لہجے میں شگفتگی کا انداز پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں خوب جانتا تھا وہ آدم خور ہے، سمجھا؟ لیکن تو بھی تو آج بہت خوش لگتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھ تجھے ایک بات بتاؤں۔" جاڑوں کی صبح تھی، کالج گیٹ کے پاس والے پیڑ کے سائے سے بچ کر میں صبح کی نرم نرم دھوپ تاپ رہا تھا، اس وقت تیزی سے میڈم کی کار آکر میرے قریب دو گھڑی رک گئی تھی۔ اور پھر پتہ نہیں میڈم نے کچھ سوچا تھا یا پھر کار ہی کچھ سوچتی ہوئی تیزی سے آگے چلی گئی تھی کالج کی طرف۔ تب میں نے دیکھا تھا قریب ہی ایک ننھا منا، بڑا ہی پیارا پیارا، من موہنا سا لڑکا جو کالج میں نوزائیدہ لگتا تھا، میرے قریب آگیا تھا اور بنا مجھے جانے اور بنا مجھے کچھ

اپنے بارے میں بتائے بڑے ہی پر لطف انداز میں آنکھ مار کر مجھ سے مخاطب ہوا تھا اور اس کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تھا ۔ " جانتے ہو یہ موٹر والی ہے ، سنا تھا افریقہ کے تاریک جنگلوں میں ہوتے ہیں ۔ Cannibal لیکن یہاں تو اس شہر کے اس کالج میں ہوتے ہیں ۔ Cannibal " اور ہنستا ہوا وہ دور تک چلا گیا تھا ، مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتا ہوا ۔ مجھے بری طرح ہنسی آگئی تھی ۔ جیسے میں اس لڑکے کی آنے والی زندگی کی ایک شکل ہوں ۔ خیر چھوڑ اس بات کو ۔ تجھے تو میں نے سب کچھ بتا دیا اب میں کیا کروں بتا ۔ ؟

فرزی نے اپنی آزاد خیالی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔ " ایک ہی راستہ ہے ، جا اور اس آدم خور کے غار میں بسیرا کر لے ، ہمیشہ کے لیے ۔ اس جنگل سے راستے نکلیں گے تیرے لیے ۔ دنیا کے بڑے بڑے شہروں کو جانے والے راستے ۔ تو جائے گا یورپ ، آکسفورڈ میں پڑھے گا کیمبرج میں پڑھے گا ۔ پھر تو شہر غزالاں کی سیر کرے گا ۔ شہر میں جنگل کی آزادی کا لطف آئے گا تجھے ۔ تیرے سامنے کئی جگمگاتے راستے ہوں گے ، اور شہر ہی شہر ۔ انسانوں کی ایک بڑی بستی کو شہر کہتے ہیں ۔ یہ شہر دنیا بھر کی تہذیب اور تمدن کے مرکز ہوتے ہیں ، جہاں سب کچھ ہوتا ہے سوائے تہذیب و تمدن کے ...."

اس سے پہلے کہ فرزی یہ شہر وہر کے بارے میں کچھ اور کہتا ، میں نے فرزی کے سامنے وہ سگریٹ رکھ دیا ، جو میڈم کے گھر سے لے آیا تھا ۔ وہ چار انچ لمبا سگریٹ ۔ اور بولا " اب چھوڑ اس بات کو اور ذرا سگریٹ پی ۔ میرا بھی سگریٹ جلا دے ۔ اور میری پیٹھ بھی ٹھونک دے کہ میں اپنے جذبے میں ، اپنے عقیدے میں کتنا صادق ہوں کہ جب بھی تو میرے ساتھ نہیں ہوتا میں کتنی گہرائیوں میں اتر جاتا ہوں ۔ کیسی کیسی راہوں سے بھٹک جاتا ہوں ۔ دیکھ ، زندگی تو تجربہ گری بنتی ہے بھی تو غم ہی بنتی ہے ، اور نہیں بنتی ہے بھی تو غم ہی بنتی ہے ۔ بے وفائی بنتی ہے بھی تو غم بنتی ہے ، اور وفا بنتی ہے بھی تو غم ہی بنتی ہے ۔ ناکامی عشق بنتی ہے تو غم اور کامیابی عشق بنتی ہے تو غم ۔ لیکن یار اب چھوڑ ان باتوں کو ۔ سمجھنے سمجھانے والی باتوں نے آج تک کبھی کوئی خاطر خواہ اثر نہیں چھوڑا کسی انسان کی رغبتِ حیات پر ۔ زندگی اگر اپنے معنی مطلب

کے ساتھ گزرے تو زہر بنتی ہے اور زہر نہیں بھی بنتی ہے تو زہر رنگ ضرور ہو جاتی ہے، لیکن یہ جبر کا مارا پتلا تو ہر لمحے کو زندگی ہی کا نام دیتا ہے۔

اتنی ساری باتیں کہنے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میں ہذیان بک رہا تھا، فرزی پر ایک نظر ڈالی تو لگا وہ ایک بت ہے پتھر کا اور میں اس کے سامنے بیٹھ کر کسی قدیم مقدس کتاب کا پاٹھ جپے جا رہا ہوں، اس بت کی خوشنودی کے لیے۔ لیکن اس پاٹھ کے معنی مطلب خود میں نہیں سمجھتا۔

فرزی چپ ہی رہا، میں نے اس سے پھر کہا۔ "چل اب کچھ ایسے ہرے بھرے موسموں کی بات کریں کہ تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگیں۔ چل تجھے بتاؤں کہ ایک سرپرائز Surprise ہے تیرے لیے میرے پاس۔ میری اس میز کی دراز میں ایک سیل بند بوتل ہے۔ یہ بوتل میڈم نے دی ہے تجھے۔ اس پر ایک ٹیگ ہے لگا ہوا۔ "For Farzi from Kulsum"۔ میرے لیے یہ بوتل ایک راز سربستہ ہے۔ جب بھی اس ٹیگ کو دیکھتا ہوں تو میری سٹی گم ہو جاتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟"

فرزی نے بڑے ہی اطمینان سے اپنے کچھ مسکراتے الفاظ کے ساتھ مجھے چھیڑا۔ شراب پینے سے پہلے بھی اپنے دماغ سے کام لیا کر۔ تو تو کوئی جھینگر بھی ہوتا تو کسی شرابی کی شراب میں گر کر شراب کا ناس کر دیتا اور پھر شرابی کے جوتوں تلے کچلا جاتا .... "عورت اور شراب کے کاک ٹیل کا نشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"تو پھر اڑاؤں اس بوتل کا کارک؟" میں نے کہا۔

"نہیں، کچھ صبر سے کام لے۔" اس کا لہجہ کچھ سنجیدہ ہو گیا۔ "ایک بات تجھے بتاؤں میں۔ میں نے اب یہ ٹھان لی ہے کہ زندگی کو زندگی سمجھ کر بھی کبھی آزمانہ چاہیے۔ میں اب جو چھٹیوں سے آیا ہوں تو طئے کر کے آیا ہوں کہ میں پڑھوں گا اور خوب پڑھوں گا جی لگا کر پڑھوں گا۔ دیکھ اب ہم صرف پڑھیں گے۔ بے حساب پڑھیں گے، اور کرنا کیا ہے؟ ہم دونوں پابندی سے کالج جائیں گے۔ اور پڑھیں گے۔"

وہ دن شاید ہماری زندگی کا خشک ترین دن تھا۔ شراب کی بوتل نہیں کھولی، اور دونوں نے بڑی ہی بے رنگ اور بدمزہ باتیں کیں۔ بے لطف سنجیدگی کے ساتھ

پڑھنے پڑھانے کے پروگرام بناتے رہے اور زندگی کی تعمیر کی راہیں تلاش کرتے رہے

اب ہم لوگ روز وقت پر کالج جاتے اور واپس آتے ۔ کمرے پر ہی وقت گزرتا لیکن ایک شام فرزی کالج سے نہیں لوٹا ۔ میں نے یہی سمجھ لیا کہ آج وہ پھر مجھے جل دے کر چلا گیا ہے ۔ ساری شام میں نے اس کا انتظار کیا ۔ پھر سمجھ بیٹھا کہ شاید وہ ہمیشہ کی طرح ایک دو دن بعد آئے گا ۔ ویسے رات بھر میں نے اس کے لیے کمرے کا دروازہ کھلا رکھا تھا وہ شاید رات ہی میں کسی وقت لوٹ آیا ، صبح میں جب جاگا تو دیکھا فرزی بے سدھ سو رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں کچھ اس طرح گتھم گتھا لگ رہے تھے جیسے کسی نے اس کو ایک گٹھڑی کی طرح باندھ دیا ہے ۔ میں نے اس کو جگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ "کب تک سوئے گا اُٹھ ۔ کسی چمگادڑ کے ساتھ رات گزاری ہے کیا تو نے ۔ تجھے بھی کسی نے الٹا ٹنگا دیا تھا کیا ؟ اُٹھ ۔"

مجھے سنا ضرور اس نے لیکن آنکھ نہیں کھولی ۔ ذرا سا مسکرا کر اپنے آپ سے کچھ اور گتھم گتھا ہو گیا ۔ میں نہانے چلا گیا ۔ نہا کر لوٹا تو دیکھا میرے کمرے میں سورج طلوع ہو چکا ہے ۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بہت سرخ لگیں ، جیسے رات بھر جاگتا رہا ہو ۔ میں نے کہا " دیکھ میں اب میس کو جا رہا ہوں ، ناشتہ کرنے ۔ میرے وہاں سے لوٹنے تک مجھے جلدی سے اپنی خیریت کا خط لکھ دینا ۔ واہ ، رات بھر غائب !"

وہ اچانک جیسے پر جھاڑ کر اٹھا ۔ بولا ۔ " ٹھہر ، میں بھی ابھی آتا ہوں نہا کر ۔ بس دو گھڑی میں ۔ فریش ہو کر تیرے ساتھ ناشتہ کرتا ہوں ۔ آج دن بھر تجھے میرے ساتھ رہنا ہے ، بالکل ساتھ ساتھ ۔

وہ جلد ہی نہا کر لوٹ آیا ۔ تولیا سے اپنا بدن اور گیلے بالوں سے پانی صاف کرتا ہوا وہ کس قدر خوب رو نوجوان لگ رہا تھا ۔ آنکھوں میں اس کی ابھی بہت ساری نیند تھی ، سرخ ڈورے تھے ، اور اس نیند میں کچھ شراب کے نشے کا سا انداز تھا ۔ میں نے سوچا ۔ کیا واقعی یہ کوئی سچا عاشق ہے یا حرام خور ؟ بنتا ہے اور مجھے بناتا ہے ۔ جب ہم دونوں میس کی طرف جا رہے تھے تو بڑی ہی گلنار قسم کی سیٹی بجا رہا تھا وہ جیسے

اس کی نظر میں اس وقت کوئی چنچل چنیلی ہے اور اپنی آمادگی کا اظہار کر رہی ہے۔ خود فرزی کی مسکراہٹ میں ایک دل پھینک عاشق کی بے حیائی کا سا انداز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"سچ سچ بتا، رات کہاں گزاری تو نے؟ کسی تاریک کونے کھترے میں یا کسی اُجڑے پیڑ پر۔ آنکھیں تو تیری بوم کی سی لگتی ہیں۔؟"

"بتاتا ہوں، سب کچھ بتاتا ہوں۔ اسی لیے تو کہا کہ آج تو میرے ساتھ ساتھ رہنا، صرف میرے ساتھ۔ آج ہم کالج نہیں جائیں گے۔ ناشتے کے بعد ہم کمرے میں بند ہو جائیں گے۔ تُو، میرے سامنے بیٹھا رہنا۔ جب میں کہوں گا "سامعین محترم" تو تُو ہزاروں کے مجمع کی طرح چپ ہو جانا تجھے ایک آواز آتی رہے گی اور تو چپ رہے گا۔"

"تو ابھی تک اپنی نیند سے جاگا بھی ہے یا نہیں۔؟ یہ تو سب خواب کی سی باتیں کر رہا ہے تو۔"

تو وہ بولا۔ "تجھ سے زیادہ جاگا ہوا ہوں۔ چل ناشتہ کریں ...."

باب (۴۰)

ناشتے سے لوٹنے کے بعد فرزی کمرے میں اسی طرح سیٹی بجانے لگا۔ جیسے بڑا ہی مست و مسرور ہے۔ ایک چھوٹے سے اِسٹول پر سگریٹ رکھ دیے اور ادھر ادھر دو کرسیاں لگا دیں۔ خود بیٹھ گیا۔ مجھے بھی اپنے سامنے کی کرسی پر بٹھا دیا۔ اس نے دو سگریٹ جلائے۔ مجھے ایک دیا، اور خود ایک پینے لگا۔ اور بڑی ہی پیاری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتا ہوا بولا۔ "سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا۔"

میں نے کہا۔ "اصلی بات بول۔"

تو وہ بولا۔ "دیکھ بات تیرے فسانے سے شروع ہوتی ہے اور میری کہانی پر ختم ہوتی ہے۔"

اس کی اس بات پر میں کچھ چونکا، تو اس نے کہا۔ "اس میں کسی طرح حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے بیٹھ کر سُن۔ بات تو کچھ دلچسپ ہے۔ دیکھ کل

جب میں کالج کلاس روم سے نکل کر کوریڈر سے گزر رہا تھا تو لیڈیز روم کی ایک آیا نے میرے قریب آکر مجھے سلام کیا اور ایک بند لفافہ میرے حوالہ کیا۔ میں نے وہیں لفافہ چاک کیا، ایک خط تھا اس میں۔ وہ خط جو کبھی تو نے کلثوم کے نام لکھا تھا۔ اس خط کی پشت پر لکھا تھا۔ "یہ خط پڑھ لو اور دو منٹ کے لیے لیڈیز روم آجاؤ۔ کلثوم۔"

اس وقت تو شاید مجھے کچھ سٹپٹا جانا چاہیے تھا، لیکن میں نے پراطمینان لہجے میں آیا سے کہہ دیا "بی بی سے کہہ دو اب کالج بند ہو رہا ہے، کل ملوں گا ......"

آیا تو اچھی طرح سدھائی ہوئی لگتی تھی۔ تڑاخ سے اس نے جواب دیا۔

"نہیں، بی بی نے کہا ہے کل وہ کالج نہیں آئیں گی۔ دو منٹ ابھی آجایئے۔" میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ سوچا کلثوم ضرور کہے گی "تمہارے اس نمک حلال کے بارے میں کیا کرنا چاہیے؟" ۔ اور کچھ بات کرنا چاہے گی تو اس سے میں کہہ دوں گا۔ "اب تو شام ہو رہی ہے۔ سردی کا موسم ہے۔ سردی بڑھ رہی ہے۔ کل مل کر بات کروں گا۔"

کلثوم اکیلی تھی لیڈیز روم میں۔ مجھے دیکھا سامنے تو وہ اس طرح مسکرائی جیسے وہ مجھ سے کچھ خائف ہے۔ اور کچھ اندیشے سے ہیں اس کی نظروں میں۔ لیکن گھڑی بھر میں اس نے اپنے آپ کو سمیٹ لیا اور اپنے آپ میں ایک جماؤ پیدا کر لیا۔ اب وہ بڑی خرّانٹ لگتی تھی۔ مجھے کچھ ایسی نظر سے دیکھا جیسے اس کی آنکھوں پر موٹے موٹے عدسوں والی عینک ہے، اور وہ کسی پرانے اسکول کی معلمہ ہے۔ اور اب وہ غُرّانے والی ہے۔ اس نے کچھ ایسے ہی انداز سے مجھے پوچھا۔ "کیا خیال ہے آپ کے اس دوست کی ہمدردیوں کے بارے میں۔ Very silly no? ۔ پہونچا دوں یہ خط پرنسپل کے پاس؟"

میں نے بڑی ہی تیزی سے جواب دیا۔ "ضرور، اگر آپ نہیں پہونچائیں گی تو میں خود یہ خط پرنسپل کے حوالے کر دوں گا۔ تاکہ اس عاشقِ سرفروش کو زندگی کا کچھ مزہ آئے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ میرے اس عاشق دوست کو کالج سے بے دخل کر دیا جائے۔ اور اس کو اس کے گاؤں بھیج دیا جائے تاکہ وہاں اس کو کسی آشرم کے حوالے کیا جاسکے۔ اس کا سر مونڈھ کر اس سے روز کچھ ڈنڈ بیٹھک کروائے جائیں۔ یوگ آسن کی کڑی تربیت دی جائے تو وہ تپسیا کرتے کرتے تھوڑے ہی دنوں میں برہم چاری بن

جائے گا۔ بس پھر کیا ہے، یہ جا، وہ جا۔"

کلثوم میری اس بات پر کچھ اس طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے عرصۂ دراز سے اس کے اندر رُکی ہوئی ہنسی اب اس کے ایک ایک عضو سے پھوٹ رہی ہے۔ اور وہ کسی جکڑ سے آزاد ہو رہی ہے۔

"ہاں برہمچاری" کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نمی سی پھوٹ پڑی جس میں ہلکی سی جگمگاہٹ آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ایک عورت اپنے کتنے غیر فطری احساسات میں جکڑی ہوتی ہے۔ وہ احساسات تو کم و بیش ہر عورت کے تن پر ایک لبادہ ہوتے ہیں، نسوانیت کی عطا۔

کلثوم کی ہنسی سے اس کے اعضاء میں جو ایک بے ساختگی آگئی تھی، اس سے وہ موہوم سا لبادہ آہستہ آہستہ مسک رہا تھا۔ اور ایسے میں ایک آزادئ احساس کی حرارت بھی اس میں آگئی تھی، جس کی شہہ پر کلثوم نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا تھا مجھ سے ہاتھ ملانے کے لیے، یہ کہتے ہوئے کہ "کیا بات کہہ دی تم نے۔ واہ۔!" میں نے اس سے ہاتھ ملالیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک لہر سی نظر آئی سرخیوں کی۔ اس کے گالوں پر اس کے رخساروں پر ایک ہلکی سی دمک آگئی اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی کامیاب حملہ آوری کا انداز آگیا کہ لمحہ بھر میں نے محسوس کیا کہ اس کے میرے بیچ پتھر کی بنائی ہوئیں مضبوط ترین دس دیواریں بھی کھڑی ہوئی ہوتیں تو شاید اس کی زد سے بچ رہنا میرے لیے مشکل تھا۔ اس گھڑی تیری کہی ہوئی بات مجھے پہلی بار سچ لگی تھی۔ تو نے کلثوم کی بات کرتے ہوئے کہا تھا۔ "شمشیرِ نیم کش۔ نیم عریاں، مرحومِ مصر کی زندہ قلوپطرہ۔" اس خیال کے ساتھ ہی میں نے لیڈیز روم کے ادھر ادھر دیکھا تھا۔ باہر شام کی سیاہیاں بڑھ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "اچھا اب دیر ہو رہی ہے، شام بھی ہو گئی ہے۔ پھر کبھی ملیں گے۔ میں باہر جانے کو پلٹا تو کلثوم اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور کچھ قریب آگئی۔ کہنے لگی "چلو چلیں۔"

لیڈیز روم سے ہم نکل ہی رہے تھے کہ اس نے پتہ نہیں کیوں ایک ایسے لہجے میں بات کی جو اس جیسی حسیناؤں کی فطرت سے بعید ہوتا ہے، یعنی انکسار لیے ہوئے' ہلکا ہی سہی۔

" ابھی اپنی بات تو پوری ہوئی ہی نہیں ۔ تم پپّا سے بھی کبھی ملے نہیں ۔ میرے پپّا بڑے ہی پیارے اور Jolly آدمی ہیں ۔ تم سے مل کر وہ بہت خوش ہوجائیں گے ۔ چلو، دو گھڑی گھر چلیں ۔ وہاں میں تم سے بات بھی کرلوں گی اور پپّا سے تم مل بھی لوگے ۔"

میرے ذہن میں ایک جواب لفظ " نہیں " کی شکل میں تیزی سے اُبھرا لیکن فوراً اس کا کوئی سبب نہیں مل سکا۔

میں اس کے گھر پہنچ گیا۔

بڑی ہی اونچائی پر بنی ہوئی کوٹھی ۔ بڑی ہی بھاری بھاری اور چوڑی چکلی گیٹ، کھلا کھلا رنگ برنگا چمن، شام کے قمقموں کی ہلکی ہلکی روشنی ۔

مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھاکر کلثوم نے کہا۔ " ابھی آئی ۔ " وہ اندر چلی گئی میری نظریں اس ڈرائینگ روم کا جائزہ لینے لگیں جو اونچی تہذیب کی چمک دمک سے روشن تھا۔ اس تہذیب کی چمک میری نظر کو خیرہ کرتی تھی ۔ وہاں بہت ہی ہلکے رنگوں والی روشنی میں کچھ اَسرار تھے ۔ خود میرا تنفس مجھے وہاں عنبریں لگا تھا۔ ایک فنی کاوش سے مزین آتش دان میں میرے ہی جذبات جیسے ہلکے ہلکے شعلے روشن تھے ۔ مینٹل پیس Mantel Piece پر دو مسخروں کے پتلے اپنی ہیت کذائی پر ایسے نازاں جیسے ان کو دیکھ کر جگ سارا ہنس رہا ہے ۔

فنِ مصوّری کے شاہکار، فنِ سنگتراشی کے بے مثال کارنامے ۔ پتہ نہیں دنیا کے کتنے نامور فن کاروں نے اپنے جنونِ فن میں ، وقت کی بے مہریوں اور طوفانی موسموں کی بیداد سہتے ہوئے ، بھوک میں ، پیاس میں ، سستی مستیوں میں ، ایسے شاہکار تخلیق کیے تھے ۔ جن میں ہوش اڑا دینے والے مناظر تھے ۔ ساری تاریخ میں انسان پر ہونے والے ، انسان کے خونخوار مظالم کے مناظر، ننگی بھوکی اور دریدہ عصمتوں کے ہولناک مناظر۔ اطفالِ معصوم کی تہہ تیغ ہونے والی گردنوں کے مناظراور ان سارے مناظر کو ایک فنی تاثر کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، صرف انسان کو انسانیت کی طرف راغب کرنے کے لیے ، اس کو اس کی غیرت کا احساس دلانے کے لیے ، انسان کو انسان بن کر جینے کی پراثر تلقین کرنے کے لیے ، لیکن وہ فنی نقوش تو

صرف فن بن کر فن کے اعلیٰ ترین رتبوں تک پہونچے تھے ۔ ان نقوش نے شاہوں، سلطانوں، خاقانوں اور امیروں کے جہالت زدہ ذوق فن کو وجاہت و توقیر بخشی تھی ۔ ان فنی شاہکاروں نے تو بلند و بالا محلوں، ایوانوں، کوٹھیوں، حویلیوں اور قصورِ جنت نشان کی تزین کی تھی، ان میں فردوسی ماحول پیدا کیے تھے، عیش سامانیوں کے لیے، ہوسِ تونگری کی سجاوٹ کے لیے ۔ لیکن دوسری طرف ان مقامات بلند کی تہوں میں سڑتے گلتے انسانی وجود کے لیے اور بے آس و بے یار ازندگی کے مِٹتے ہوئے نقوش کے لیے تو وہ شاہکار یکسر بے اثر رہے تھے، ناکام رہے تھے، بے فیض و بےحس ۔ جیسے اس عالم ہست و بود کا ماضی، حال اور مستقبل بننے والا سارا وقت ہی یرغمال تھا ان مخصوص طبقات ِباوقار و باشعور کی لگائی ہوئی کڑی شرائط موت و حیات کی گرفت میں ۔

پتہ نہیں یہ کس قدر حقیر اور نحیف نام نمود جیسا جذبہ ہے، جذبۂ انسانیت، جو انتہائی متبرک و مقدس درس احساس و فکر بنتا ہے اور خود تاریکی زدہ، سلین زدہ زندگی کی دراڑوں میں پناہ مانگتا ہے، وقت کی اس سمت سے اس سمت تک ۔ کہاں، کب اور کیوں کوئی ضرورت آپڑی تھی اس اسفل ترین نظام حیات کی تزئین کرنے کی اس کو سجانے اور موقر بنانے کی ۔ بھلا کون، کس طرح کسی فوقیت کا حق دار تھا ۔ ؟ اس قسم کے سوالات اس آتش دان میں روشن میرے جذبات کے ہلکے ہلکے شعلوں کو بھڑکا رہے تھے ۔ اب کلثوم کی شخصیت بھی میری نظر میں جبر و استبداد کا ایک فطری جذبہ لگ رہی تھی، سرد پتھر جیسی بے حسی لگ رہی تھی وہ سر تا پا ۔

کچھ ایسے ہی خیالات کے ساتھ میں نے دیکھا تھا، مجھ سے کچھ دور ایک روشن کونے میں مُنقش اور دیدہ زیب اونچے قد کا ایک بک شلف ۔ اس میں طلائی پوشاکوں میں ملبوس وہ پُرشکوہ کتابیں تھیں جن کی جبینوں پر لکھے ان کے چمکتے دمکتے نام پڑھے جاسکتے تھے، تاریخِ فن و ادب کی دنیا کے گوشے گوشے میں گونجنے والے بڑے بڑے اور بھاری بھاری نام ۔ پتہ نہیں کس طرح وہ علم جو ان طلائی خلعتوں میں محفوظ تھا، ان ایوانوں، کوٹھیوں اور محلوں میں بنے ہوئے گوشہ ہائے عافیت کی رعونت اور وجاہت کو احساس فوقیت دلانے میں کام آیا تھا ۔ ؟ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس لمحے میں اپنے ہی اندر پلنے والے کتنے ہی زہریلے سپولوں کی زد میں ہوں ۔

کتنے پرانے زخم ہیں اور کتنا پرانا زہر ہے یہ، ہفت آتشہ ہشت آتشہ ۔

اچانک میری نظر پھر مینٹل پیس پر رکھے ان دو مسخروں پر پڑ گئی، محسوس ہوا ان میں سے شاید میں ایک ہوں، اور اپنا ہی مذاق اُڑا رہا ہوں ۔ میں نے اپنی نظریں جھکا لیں سامنے ایک بڑی ہی خوش شکل تپائی پر رکھا ہوا ایک البم نظر آیا جس کے کور Cover پر ایک کم سن بچی کی تصویر تھی، جو بے حد شریر اور طرار لگ رہی تھی ۔ اچانک خیال آیا ۔ "آخر کتنی دیر ہو گئی، کلثوم کو اندر گئے؟ پھر سوچا شاید آتی ہی ہو گی ۔ میں البم کے صفحات الٹنے لگا ۔ پہلے صفحہ پر سنہرے رنگ میں انگلش زبان کا ایک حرف لکھا تھا ۔ K ۔ ساتھ ہی تاریخ پیدائش لکھی تھی، ارغوانی رنگ میں ۔ وہ کلثوم کا البم تھا، اس میں اس کی بڑھتی عمر کے مدارج تھے، تصویروں میں اس کا لڑکپن، الھڑپن، کھلتی عمر، شباب کی آمد آمد، دل آرائی، دلفریبی کے انداز، شباب کے شگوفے ۔ رنگ برنگے پھول شام و سحر کھلتے ہوئے ۔ اسکول کے ساتھی، پکنکس کی تصویریں، کالج کے ساتھی ۔ پھر اچانک سوئٹزرلینڈ کے ہوش ربا مناظر، خوبصورت شہر ۔ برف پوش پہاڑیاں، مرغزار ۔ لینڈ اسکیپ، جھیلیں، جنگل ۔ کلثوم کی اڈتی جوانی، کھلے کھلے، بند بند لباسوں میں ۔ کشتی رانی، موٹر بوٹ ۔ ریتیلے ساحلوں پر دوڑتی ہوئی، یا پھر تیراکی کی تصویریں، کالج کا باوقار ماحول ۔ ہاسٹل کی ہلکی پھلکی زندگی، آزاد، آزاد ۔ پھر وہاں کی شامیں، سرد شام میں ہر طرح گرم گرم سرائے، رقص گھر ۔ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے گلاسوں میں رنگ برنگے مشروب ۔ پھلوں کی تازگی ۔ شراب و کباب کی محفلیں ۔ کتنی تصویروں میں وہ اپنے ساتھیوں کے جھرمٹ میں ہنستی ہوئی، ناچتی ہوئی، بے خود و بے سُدھ ۔ ایک بڑی عمارت کے انٹرنس کے قریب، لِفٹ کے سامنے کلثوم کھڑی ہوئی بے طرح ہنس رہی ہے، جیسے اس کے پیٹ میں بل پڑ رہے ہوں ۔ اس کی ایک انگلی لفٹ کے قریب ایک طرف دیوار پر لگی ایک تختی کی طرف اشارہ کر رہی ہے، تختی پر لکھا ہے ۔

" Funfair clinic "
" Chastity is curable – Contact the Doctor
on top floor

اور کتنی ہی تصویریں، ایک سلسلہ تصویروں کا ایسا بھی کہ ہر تصویر میں وہ ایک ساتھی

اس کے ساتھ ساتھ لگا لگا، جھرمٹ میں، تنہائی میں۔ کبھی کسی پب میں، ہوٹل میں، دونوں ساتھ ساتھ۔ کسی سرائے کے ایک محفوظ گوشے میں وہ نوجوان اس کے ساتھ۔ ویانا کے ایک قدیم، پروقار اور پراسرار سے ہوٹل کے ایک روم کی کئی تصویریں۔ اس روم کی ایک دیوار پر آویزاں ایک پلیٹ پر لکھا ہوا۔ "پریزادوں کی عیش گاہ"۔ اس کی روح موسیقی اور ہوائیں مئے ناب۔ وہ کلثوم کی آرام گاہ، صحرائی خوش رنگیوں سے بنی ہوئی، اس کی زیبائش و آرائش تو ہر طرح کافر نگاہ۔ وہاں سیاہ پتھروں سے بنائے ہوئے آتش دان سے قریب یہ تحریر آویزاں۔

" Remember, when Lady Macbeth ordered spirits to "unsox me here "

اس روم کی تصاویر میں میں کھو گیا۔ وہی ایک نوجوان نظر آتا تھا، ہر تصویر میں محوِ گفتگو، طرب انگیز کیفیتوں میں۔ اور ایسی ہی کچھ تصویریں۔ لیکن میں نے البم بند کر دیا۔ پتہ نہیں کیوں ان سیاہ پتھروں کے بیچ روشن وہ ہلکی ہلکی آنچ میرے سینے میں بھی سلگنے لگی۔ ہلکا ہلکا طیش کا انداز تھا اس میں، غصہ تھا۔ ناپسندیدگی کی کڑواہٹ تھی۔ میں نے ایک اکتاہٹ کے ساتھ وہ البم ایک تپائی پر رکھ دیا۔ تب مجھے میری ہی آواز سنائی دینے لگی۔ "نکل پڑو" چلتے بنو۔ یہ پہاڑی پر بنا ہوا مکان کوئی بلندی نہیں ہے۔ کوئی بلندی نہیں ہے۔"

یکایک دروازہ کھلا۔ اپنے ان ہی خیالات سے متاثر نظر اٹھائی میں نے، سامنے کلثوم تھی۔ ایک خجل سی مسکراہٹ کے ساتھ۔ " اس نے کہا۔ معاف کرو کچھ دیر لگا دی میں نے۔"

پتہ نہیں کیوں میری نظر اس کے رخسار پر بکھری بکھری زلفوں پر پڑی، جن میں پانی کے کچھ قطرے اس طرح اٹکے ہوئے تھے، جیسے اب ٹپکیں اور تب ٹپکیں، اول صبح کی شبنم جیسے۔ پتہ نہیں کتنی طراوت اور کیسی ٹھنڈک تھی ان قطروں میں، مجھے لگا وہ میرے سینے پر ٹپک پڑے ہیں اور ایک ایسی ہی آواز نکلی ہے جیسے گرم توے پر پانی کے قطرے پڑ گئے ہوں۔ لیکن میرے سینے میں کوئی دھنواں نہیں تھا، وہ تو ٹھنڈک لی ہوئی ایک لہر تھی۔ کسی حسینہ کے حسن میں یہ کیسی قدرت ہوتی ہے۔ مجھے تو لگا بس

اب صبح ہو رہی ہے۔ کلثوم واقعی صبح کی سفیدی جیسے لباس میں تھی جو یہاں وہاں شبنم سے نم لگتا تھا۔ میرے سینے کی اس جلن کی جگہ جادو اثر ٹھنڈک نے لے لی۔ ایک اشتیاق کے ساتھ میں نے کلثوم کی طرف دیکھ لیا۔ جو چائے لے آئی تھی، ایک کشتی میں۔ مجھے تو بس یہی خیال آیا۔ "حسن بہر حال حسن ہوتا ہے۔ خواہ وہ باوفا ہو یا بے وفا۔ بد قماش ہو یا کسی فریب کا جال۔ اور مرد وہی جو اپنے آپ کو اس مقتل میں قتل کیے جانے کے اعزاز کا حقدار سمجھتا ہے۔ اور جس کا ایمان یہی ہوتا ہے کہ حسن ہی اول اور حسن ہی آخر۔ اور باقی ساری کائنات ہیچ۔"

"معاف کرنا، مجھے بد اخلاق نہ سمجھنا۔ وہ کالج میں گزرے سارے دن کی گرد لیے تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دو منٹ ہاتھ لے لیا۔ چائے گرم ہے، چائے پی لیں گے۔"

میرے احساس میں ابھی ایک بد ضغگی ضرور تھی کہ آخر میں یہاں کیوں چلا آیا پھر بھی اس نے جب چائے کا کپ بڑھایا میری طرف اپنی ہنستی نظروں اور اپنی کلائیوں میں تھامے ہوئے، تو میں نے کپ لے لیا۔ نظریں نیچی کر لیں۔ جانے کیوں ایسا لگا کہ اس کو نظر بھر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ "ہاں اب چائے پی لیتا ہوں اور اجازت دو تو نکل پڑتا ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" کہتے ہوئے میں نے کلثوم کی طرف نہیں دیکھا۔ اور چائے پینے لگا۔ لیکن مجھے ضرور محسوس ہو رہا تھا کہ کلثوم بڑے ہی پر شوق انداز میں میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اس نے کہا۔ "چائے کے ساتھ کچھ نمکین؟"

میں دانستہ طور پر چپ رہا۔ اور چائے پیتا رہا۔ اچانک اس کا لہجہ کچھ کمزور سا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "کچھ خیال نہ کرنا۔ چاہتی تھی کہ پپّا سے ملاؤں تم کو لیکن ممی اور پپا ہمارے آنے سے پہلے ہی کہیں چلے گئے اور کہہ گئے ہیں کہ ان کا ڈنر بھی باہر ہی ہوگا اب اور کوئی نہیں گھر میں۔ کچھ تو نمکین لو۔ ایک کپ اور چائے بنا دیتی ہوں، سردی ہے اور چائے گرم۔"

اس کی یہ بات سن کر ایک بہت غیر واضح ہی سہی، لیکن مسکراہٹ ضرور آ گئی میرے ہونٹوں پر۔ جس کو کلثوم کی نظروں نے دیکھا نہیں بھی تو سمجھ ضرور لیا۔ اس

کے لہجے میں کچھ ہلکی سی حرارت لوٹ آئی اور وہ ایک کپ اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔" اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔ ایک کپ اور چائے پی لو۔ کچھ دیر تو ٹھہرو۔ میں بھی اکیلی ہوں۔ کوئی میوزک؟"

میں نے ذرا سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔" نہیں میوزک ویوزک نہیں چاہیے۔ اب اجازت دو۔ تمہارے ممی پپّا بھی نہیں ہیں جن سے ملانے کے لیے تم مجھے یہاں لے آئی تھیں۔"

اچانک کچھ بدل جانے والے لہجے میں اس نے کہا۔" اب چھوڑو نا وہ بات۔ میں نے اپنی بات تو تم سے پوچھی ہی نہیں۔"

چائے کی دوسری کپ پینے سے کچھ اتنی گرمی آگئی تھی میرے بدن میں کہ اس کی اس بات پر مجھے زیادہ ہی پسینہ آگیا۔ میں نے کہا" وہ بات تو وہیں کالج میں ہو گئی۔"

اس نے کچھ ڈھٹائی سے جواب دیا۔" نہیں، تمہاری بات۔ میں ایک بار، صرف ایک بار تمہاری کہانی سننا چاہتی ہوں۔ تمہاری کہانی۔ آخر ...."

میں نے بڑے ہی صاف لہجے میں کہہ دیا۔" میری اپنی کوئی کہانی نہیں ہے۔ تاریخ پیدائش تو یاد نہیں۔ کچھ بچپن، کچھ لڑکپن، کھلینڈرا پن۔ اسکول اور پھر کالج۔ کالج میں ہم ایک دوسرے کو جتنا جانتے ہیں، بس وہی سب کچھ ہے۔"

اب ہلکے سے طنز کے ساتھ اس نے مجھ سے پوچھا۔" بس! ارے واہ!" اور کچھ اعتماد کے ساتھ اس نے مجھے چھیڑا۔" تم جیسوں کو میرے پپا زٹل باز کہتے ہیں۔ زٹل باز۔" میرے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لیکن ماحول کچھ ایسا تھا جو صرف آداب و تمیز ملحوظ رکھنے کا حکم لگاتا تھا۔ میں نے جیسے اپنی زٹل بازی کو تسلیم کر لیا اور بات بدلتے ہوئے کہا۔

" تمہارا البم خوب ہے۔ کیا ترتیب ہے اس کی۔ اپنی ساری زندگی کی تاریخ مرتب کی ہے تم نے۔"

وہ بے تحاشہ ہنسنے لگی، اس طرح جیسے میرے سامنے کھل اٹھنے کا موقع مل گیا ہے اسے۔ وہ اسی طرح ہنستی ہوئی نمکین چبانے لگی۔ اور اسی کھلے ہوئے انداز میں پوچھا

"تو بنا اجازت ہی تم نے میری زندگی کی کتاب پڑھ لی ۔؟ میں خوش ہوں کہ تم نے ایسا کیا۔ کچھ تو سمجھ پائے ہوں گے ۔ بتاؤ ۔"

میں نے اسے اس طرح دیکھا جیسے مجھے اس سے ، اس کی ذات سے یا اس کی کہانی یا اس کی کسی بات سے کوئی دلچسپی ہے نہ کوئی تعلق ۔ لیکن اتنا کہا ضرور ۔ "ہاں کچھ اندازے تو ہوئے لیکن وہ بھی غلط ہی لگے ۔ چھوڑو اس بات کو ۔"

پہلی بار میں نے ایک جوان حسینہ کے گلنار چہرے پر ایک گہری نیلاہٹ پھیلتی ہوئی دیکھی ۔ جیسے اس کے خون میں کوئی زہر مل گیا ہے ۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈوروں کو تانبے جیسے رنگ میں بدلتے دیکھا۔ میرے لہجے یا احساس میں جو ایک خود اعتمادی کا انداز تھا ، اس کو جیسے کچھ ٹھیس سی لگ گئی ۔ میرے متوازن خیالات میں کچھ ادھر ادھر بکھر جانے کا انداز پیدا ہو گیا ، جیسے کچھ خس و خاشاک ہوا کے ہلکے جھونکوں سے بکھر جاتے ہیں ۔ مجھے خیال آیا پتہ نہیں کیوں اور کیسے وہ چہرے جو بلند دریچوں سے جھانکنے کے عادی ہوتے ہیں ، جب بلندیوں سے فرشِ زمیں پر اتر آتے ہیں تو بھی ان کی رنگتوں میں بلندیوں کا ایک احساس ضرور برقرار رہتا ہے ۔"

"کیا سمجھ رکھا ہے تم نے اپنے آپ کو ؟ ۔" اس طرح ایک ننگی تلوار کا سا وار کر دیا اس نے ایک انجانے لہجے میں ۔ "تم نہ بتاؤ میں بتاتی ہوں تمہاری کہانی ، تم کو ۔ مجھے صرف یہی ایک کہانی تو یاد ہے ۔ ہماری ساری کتابوں میں بھی تو یہی ایک کہانی لکھی ہے ، آغاز سے اختتام تک ۔ تم نے پتہ نہیں کس زعم میں ، کس گھمنڈ میں اس کہانی کو اپنی کہانی بنا لیا۔ گھمنڈی کہیں کے ۔"

لگا وہ مجھ پر رعب جمانا چاہتی ہے اور کچھ اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتی ہے ۔ ٹھیک ہے ، میں نے سوچا وہ جتنی جلدی اپنی برتری مجھ پر جتالے گی اتنی ہی جلدی مجھے اس سے چھٹکارہ مل جائے گا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اس نے اپنے لہجے کی اسی کاٹ کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "بھلا بھرے پرے شہر میں کوئی کیسے صحر نوادی کا ڈھونگ رچا سکتا ہے ۔ اس شہر کو کوئی بے ستون سمجھ کر صرف جذبۂ کوہکنی سے کوئی جوئے شیر لانے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے ۔؟ اے خوئے وفا کے کوہکن ۔" اس کی اس بات پر اس کی آنکھوں کا غرور جیسے ہنس پڑا ۔ ان میں ایک

چمک آگئی۔اس کے چہرے پر ایک تمازت تھی۔

میں نے سوچا، آخر یہ چاہتی کیا ہے، یونہی میرا مذاق اُڑانا چاہتی ہے یا کچھ ایسی جلی کٹی سنا کر اپنی تسلی کرنا چاہتی ہے۔کالج کی سائنس لیبارٹریز میں اکثر جو نیلے تھوتھیے یا تیزاب کی بو پھیلی ہوتی ہے، وہ یاد آگئی مجھے، جب میں نے اس کی خشم آنگیں آنکھوں کو دیکھا۔وہ نظر بھی تیزابی تھی۔اپنے لہجے کو کچھ بدلتے ہوئے اس نے کہا۔" دیکھو میں تم کو اپنے گھر لے آئی ہوں۔پورے عجز و احترام کے ساتھ۔تم میرے گھر مہمان ہو۔ اس لیے میں تم سے کسی ناگوار یا صبر آزما لہجے میں بات نہیں کروں گی۔لیکن میں تم سے ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ جناب محترم، یہ جنون ِوفا کا مال سالا تو صرف آزادی جسم و جاں کی ایک خواہش ِدوام کے مارے ہوئے عیش پسند ذہنوں کی تخلیق کی ہوئی داستانوں اور کہانیوں میں ملتا ہے اور ان عاشقوں کا مقدر ہوتا ہے جو بِنا کسی جرم و سزا کے یا بِنا کسی قاضیٔ شہر کے فیصلے کے، داستان گو کی ایک جنبشِ قلم کے ساتھ بِنا کچھ چوں و چرا کیے دار و رسن تک پہونچ جاتے ہیں، جہاں دراصل ان کے لیے ایک حیات جاوداں کا باب ِاول کھلتا ہے، اور پھر وہ وہاں بے حس پڑے رہتے ہیں صدیوں نہ وہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔اے صاحب فہم و خِرد! اتنا تو جان لے کہ زندہ انسان کی سانسوں میں اس کے سارے زندہ جذبات اور سارے زندہ احساسات کا اظہار ہوتا ہے، ان کے معنی ہوتے ہیں۔ایسا نہ ہو تو دم گھٹ جائے جینے والے کا۔یہ عرش سے پرے کوئی منزل بنانے کی خوش فہمی میں کیوں جی رہے ہو۔تمہاری تو ساری سانسیں رُکی رُکی لگتی ہیں۔"

کلثوم کی ان باتوں پر تو مجھے بھی ایک تلخ ترین اور زہر آلود جذبہ بن کر پھوٹ پڑنا چاہیے تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں اس کا وہ جلا بھنا لہجہ، جس میں شاید اس کے جلے بُھنے جی جگر کا دھواں بھی شامل تھا، اس کے چہرے کی وہ نیلاہٹ، اس کی نظروں کا وہ تیزاب، مجھے اچھا لگ رہا تھا اور یقین دلا رہا تھا کہ وہ اپنے ان خیالات و جذبات کے ایندھن میں خود کو اندر ہی اندر خاکستر کر رہی ہے۔راکھ بن رہی ہے، اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ، ٹھہراؤ یہ بتاتا تھا کہ اس کے اندر ایک شدید خواہش اسے تڑپا رہی ہے، اس کے دل کو برما رہی ہے کہ میں اس کی باتوں کی تاب نہ لا کر چیخ پڑوں، پھٹ پڑوں

لیکن میں نہ صرف چپ تھا، بلکہ ایک سرد پتھر بنا ہوا تھا۔

اس طرح مجھے چپ دیکھ کر وہ شاید لرز گئی۔اس کی آواز کانپ گئی، اس نے اسی لہجے میں کہا۔"تو تم میری ان ساری باتوں کو تسلیم کرتے ہو۔ان کو مانتے ہو، سچ ہیں نا یہ ساری باتیں، لگتی ہیں نہ سچ۔۔بتاؤ۔"

میں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے میں تسلیم کر رہا ہوں کہ اس کی کہی ہوئی باتیں سچ ہیں۔وہ سچ ہوں یا نہ ہوں لیکن میرے اس اظہار کو وہ سمجھ جائے تو مجھے ان ساری باتوں سے، اور اس سچ سے بہت جلد چھٹکارا مل جائے گا۔

شاید وہ سمجھ گئی۔اس کے لہجے میں ایک ملائمت آگئی۔ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا۔"سنو۔"

اس کے اس دھیمے لہجے پر میں چونک گیا اور تیزی سے اس سے کہنے لگا۔"تم نے تو آج وہ سچ کہہ دیا ہے جو آج سے پہلے کسی نے نہیں کہا تھا۔میں ہر بات سمجھ چکا ہوں۔ان کے سارے معنی مطلب سمجھ میں آگئے ہیں۔میں ضرور ان ساری باتوں پر غور کروں گا۔"

لیکن پتہ نہیں کیوں، وہ اپنے آپ پر جیسے قابو نہ پا سکی اور زور سے چیخ پڑی، "نہیں۔نہیں" اس طرح چیختی ہوئی وہ سر سے پیر تک کانپ گئی۔اور جیسے اس کے لہجے کا گرم گرم موم اچانک پگھلنے لگا۔ایک جلتی شمع جس طرح قطرہ قطرہ پگھلتی ہے، وہ بھی اسی انداز سے پگھلنے لگی۔مجھے ایسا لگا کہ مجھ میں وہ صلاحیت ہی نہیں کہ اس کیفیت کو سمجھ سکوں۔نہ میں چپ رہ سکوں، نہ میں کچھ کہہ سکوں۔صنفِ نازک کی زلف گرہ گیر کی طرح اس کی فہم و خرد بھی یقیناً گرہ گیر ہوتی ہے۔اور وہ گرہ کبھی کھلے تو شاید روزِ حشر ہی کھلے۔اب اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ بھی آگئی جس کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ کسی جلتی شمع کا کوئی درد ہی نہیں، بلکہ اس کی مسکراہٹ بھی پگھل پگھل کر ٹپکتی ہے۔اس کے لیے کوئی اور راہ اظہار بھی تو نہیں۔

ایک چھن کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ کلثوم کے ہونٹوں پر جو ایک زہر کی نیلاہٹ تھی، وہ تانبے کے سے مدھم مدھم رنگ میں بدل رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں عود آنے والی سرخیاں بھی تپی تپائی لگتی تھیں۔لیکن اس کے گالوں، رخساروں

اور اس کی پر تمکنت ناک پر ہلکا ہلکا شبنمی رنگ پھوٹ رہا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے بدن سے بھی کچھ پسینہ پھوٹ رہا ہے۔ وہ لمحہ گزر گیا میں نے اس کے ذہن کی اس کیفیت کو بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے، بڑے ہی ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑ دیا۔

"میں اب چلوں، سردیاں بڑھ رہی ہیں۔ سرما کی چاندنی تو غریبؔ کی جوانی ہوتی ہے۔ لیکن سرما کے اندھیرے بڑے امیر ہوتے ہیں۔ کٹھور۔"

میری اس بات پر بڑی بیتابی سے اس نے میری طرف ا[illegible]ھ بڑھا دیا۔ اور کہا "چلو ہاتھ ملاؤ۔ چلو سب Quits ۔ "تھو تھمبال"۔ وہ اپنی اس بات پر بیساختہ ہنسنے لگی۔ اس کے چہرے کی سرخیاں پوری طرح روشن روشن لگیں۔ اور بے طرح ہنستی ہوئی وہ کہنے لگی۔" یہ لفظ بچپن کے کھیلوں میں سیکھا تھا میں نے۔ "تھو تھمبال"۔ وہ ہنسے جا رہی تھی۔ غضب کی اصلیت ہے اس ایک لفظ میں، یہ ایک لفظ ساری دنیا میں امن قائم کر سکتا ہے۔

اس نے بڑی ہی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ مجھے اس طرح دیکھا جیسے اب وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ بولی "ارے ایک تو ڈھنگ کی بات کہہ سکوں تم سے۔ میں نے شاید تمہاری ساری شام تباہ کر دی۔ ایسی بدمزہ شام شاید ہی کبھی گزاری ہو تم نے۔"

مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا۔ لیکن میرے اس ہاتھ میں جو اس کے ہاتھ میں تھا ایک واضح اظہار تھا کہ میں اب وہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ وہ اس بات کو شاید بھانپ گئی۔ بولی۔ "مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ تم بھی سرما کے اندھیروں جیسے امیر ہو کٹھور۔ مجھے آج تم نے میرا بچپن یاد دلا دیا۔ دو گھڑی تو ٹھہر جاؤ۔ ایک بات کہوں تم سے۔ کہنا ضروری ہے۔ اس لیے کہہ رہی ہوں شاید پھر کبھی موقع نہ ملے۔"

غیر محسوس انداز میں اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور مجھے دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں سے کہنے لگی۔ "بس کچھ دیر اور"۔ پھر وہ گویا ہوئی۔

"مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے البم میں تم نے جو کچھ دیکھا، سوئیٹزرلینڈ کی تصویروں میں، وہ خوش رنگ مناظر تمہارے جی جگر کو کاٹ گئے۔ لہولہان کر گئے۔"

اس کی یہ بات مجھے پھر بد مزہ لگی۔ میں نے کچھ چُبھتی نظر سے دیکھا اسے۔ اس نے میری نظر کی چُبھن کو محسوس کر لیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ آگئی جو اس کی جھکی جھکی سی آنکھوں کو زیب دیتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی جھکی پلکوں کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں وہ غیروں کا شہر۔ وہ پچّھم، اُف ری وہاں کی ہوائیں، جس رُخ سے بھی چلتی تھیں ایک سندیس لیے چلتی تھیں، چلو۔ چلو، آگے چلو۔ کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ہر رکاوٹ تمہارا احساس ہے بے معنیٰ، خیال ہے بے معنیٰ۔ وہاں کی ہوائیں اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرواتی ہیں۔ جانے کس طرح جسم کے ایک ایک مسام میں اتر جاتی ہیں۔ اور ہر رگ کے رگ کے احساس کو ایک بہاؤ بنا دیتی ہیں۔ ٹھہرے ٹھہرے جذبے کو اوپر اچھال دیتی ہیں جیسے ہمارے اندر جو کچھ بھی ہے وہ سب کچھ ان ہی کا ہے۔ ہمارا کچھ نہیں۔ کہتی ہیں، جینا ہے تو کھلی کھلی ہواؤں کی طرح جیو، کھلی فضاؤں میں۔ زندگی ان آسمانوں اور زمینوں کی حدود سے نہیں بنتی۔ زندگی تو بے حساب خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی ان اڑانوں سے بنتی ہے، جو آسمانوں سے پرے نکل جاتی ہیں۔ پتہ نہیں کیا محسوس کیا تھا میں نے، ان فضاؤں میں۔ جیسے میں مَیں نہیں ہوں، بلکہ میری جگہ صرف وہ وجود ہے جو میری کچھ نو خیز خواہشوں اور تمناؤں سے بنا ہوا ہے۔ اور ان ساری خواہشوں کی تکمیل اور ان کی سیرابی کا سامان وہاں بالکل بے مول ملتا ہے، ہواؤں کی طرح۔ اسے میں نشہ کہوں نہ جُنوں کہوں نہ طلسم یا جادو۔ مجھے تو میرا ہر احساس خیر خواہ لگتا تھا اور اس خیر خواہی میں ایک عجیب سی چُبھن تھی۔ ان ہواؤں کی خوشبو کی چبھن، جس کو میری سانسوں نے پہلی بار محسوس کیا تھا اور راہ دے دی تھی اس خوشبو کو اپنے ہر جوش و جذبے میں سماں جانے کی۔ وہ چبھن بھی تھی، تو خوشبو تھی۔ اس خوشبو نے مجھے کچھ اس طرح اپنا لیا تھا کہ مجھے ایک یقین ہو گیا تھا کہ یہاں ہمارے اس ماحول میں ہم جس کو شباب، جوانی یا جاں لیوا لذتوں کی تڑپ کہتے ہیں وہ تو کچھ رکے رکے، سنبھلے سنبھلے اور ایک قید و بند میں محفوظ جذبات اور امنگوں کے نام ہیں۔ لیکن وہاں۔ اس دیش میں خصوصاً وہاں کے سبزہ زاروں میں، لالہ زاروں میں، برفیلی پہاڑیوں میں میرا ایک ایک احساس، ہر صبح، ہر

شام افق و شفق کی ساری رنگتوں سے ایک تیر کی طرح گزر کر دوسری طرف نکل جاتا آر پار، اور دور ان پرانے نیلے آسمانوں سے بھی دور بنے ہوئے دوسرے نئے نئے آسمانوں تک پہونچ جاتا، جو نئے نئے رنگوں میں رنگے ہوتے۔ احمریں، زمرّدیں، طلائی سمیں، زرتار، آسمانی۔ آزاد نظروں میں کیسے کیسے انوکھے رنگ ہوتے ہیں، بار بار خیال آتا ہے کہ ہم نے تو جانا ہی نہیں شباب اور آزادیٔ شباب کیا ہے۔"

مجھے ایک لفظ کہنے کا بھی وہ موقع نہیں دیتی تھی۔ بول پڑی " دیکھو، تم یونہی بھڑک مت اٹھنا۔ میں نے آج تک یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ لیکن آج تم سے کہہ رہی ہوں۔ میری بنتی ہے، میری ارج ہے تم سے، تم یقین کرنا کہ ان فضاؤں میں اگر تم ہوتے تو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ہی وہ پرنس چارمنگ ہوتے جس کی آنکھوں میں مجھے ایک نہیں ہزار ارضی جنتیں نظر آتیں۔ ارضی اس لیے کہ زمین کی فطرت میں کچھ اتنی لذتیں ہیں، اتنی دیوانگیاں ہیں کہ مجھے سوئیٹزرلینڈ ہی میں نہیں شاید دھرتی پر ہر طرف تم ہی تم نظر آتے۔ لیکن آج۔" کہتے ہوئے اس نے بڑی ہی بے چین نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔" مجھے معلوم ہے میری اس بات پر تم اپنی جڑوں سے اکھڑ چکے ہوں گے۔ تم شاید اب ایک لفظ بھی آگے سننا نہیں چاہتے۔ ایک لمحہ بھی یہاں ٹھہرنا اب تمہارے لیے ممکن نہیں۔"

مجھے اس وقت ایک ایسی وحشت ہو رہی تھی، میرے اندر کچھ ایسی کیفیت تھی کہ اس وقت میری زبان سے صرف "ہاں، ہاں" نکل گیا۔ اور میں اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے تھام لیا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ ارے، تم تو سچ مچ اکیلے ہو۔ دنیا میں۔ نہ کبھی تم کو کسی نے کچھ سکھایا نہ تم نے کچھ سیکھا۔ میں نے اتنی ساری باتیں جو کی ہیں نا وہ تو تمہیں ایک Surprise دینے کے لیے تھیں۔ وہ ساری باتیں جھوٹ ہیں، سراسر جھوٹ۔ ذرا ٹھیک سے بیٹھو نا۔ بس تھوڑی دیر۔ صرف میرے لیے۔ اس لیے کہ مجھے اب یقین ہو چلا ہے کہ مجھے اب کبھی ایسی شام نصیب نہیں ہوگی نہ ایسے کبھی تم سے اکیلے میں ملنا۔ اور نہ ایسی چاندنی سرما کی۔ غریب کی جوانی۔" وہ زور سے ہنس پڑی۔

میں نے پوری طرح اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔" دیکھو، میں سب کچھ

سمجھ چکا ہوں۔ تمہاری ایک ایک بات سمجھ لی ہے۔ اور یہ بھی جان گیا ہوں کہ آگے تم کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے، اس نے تیزی سے کہہ دیا۔" تم کس طرح سمجھ سکتے ہو، یہ باتیں۔؟ کیسے جان سکتے ہو کہ میں کیا کہنے والی ہوں۔ یہ جھوٹ ہے۔ ٹھیک ہے، جھوٹ کے جواب میں جھوٹ کہنا دانشمندی کا ثبوت ہوتا ہے، لو ایک اور جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ تم بھی اس پر ایک اچھا جھوٹ کہنا۔ لگتا ہے زندگی کی کتابوں میں جس طرح صرف سچ کہنے کی تلقین ہوتی ہے، اس کی جگہ صرف جھوٹ کہنے کی تلقین ہوتی تو شاید یہ کتابیں بھی سچی ہوتیں اور زندگی بھی۔" اپنی اس بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اور اس کی آنکھیں کچھ نشہ آور ہو گئیں۔

"ہائے کیا بتاؤں تم سے۔" وہ کہنے لگی۔" تم نے جب کہا تا کہ میرا سارا البم تم نے دیکھ لیا ہے، تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے کسی نازک ترین جذبے کو ایک کچوکہ لگا دیا ہے تم نے۔ لیکن یہ یقین بھی ہو گیا کہ تمہارے جی جگر تو کٹ نہیں گئے ہوں گے۔ اس لیے کہ نہ تم نے مجھے کبھی چاہا، نہ پسند کیا کہ رقابت کا جذبہ جاگتا تم میں اس ایک بانکے چھبیلے نوجوان کو ان تصویروں میں دیکھ کر جو ہر منظر میں میرے ساتھ لگا لگا نظر آتا ہے۔ کالج میں، بازاروں میں، ہوٹلوں میں، سیر گاہوں میں، محفلوں میں اور میری تنہائیوں میں۔ ہاں لیکن بتاؤں تم کو بڑا بدحال تھا وہ، خستہ جاں، خستہ جگر۔ اور آنکھیں تو ساری کشکول تھیں۔ کشکول۔ کاسہ، دریوزہ گری۔ اسی لیے تو اس کا نام میں نے کشکول رکھ چھوڑا تھا۔ اس لیے کہ نہ صرف اپنی آنکھوں سے، اپنے لہجے سے بلکہ اپنے سارے وجود سے وہ کشکول ہی نظر آتا۔ خالی، خالی۔ نیلی آنکھوں والا تھا۔ سرخ رنگ والا۔ وہ ویانا کا رہنے والا تھا۔ کہاں کہاں نہیں گھومتے ہم لوگ۔ صحراؤں میں، پہاڑیوں میں، جھیلوں پر۔ وہ گاتا بہت اچھا تھا، کہتا تھا

I am from Mozart's Pedigree ، (میں موزارٹ کی نسل سے ہوں)

اپنی اس بات پر ہنستا بھی اور گاتا بھی۔

ایک لالہ زار میں تھے ہم لوگ ایک دن۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ تو وہ گا اٹھا تھا۔ میں نے کہا" بند کر دیہ گانا۔ ہم ان لال لال پھولوں کے ساتھ بھیگیں گے۔ تو

وہ چہک اٹھا تھا۔اس لالہ زار کو بڑی ہی لگن سے دیکھ کر بولا تھا۔

" You know, there is a Scotch saying " Kissing is not in season when the gores are not in bloom"- Actually, gores bloom throughout the year."

(یہ بوس و کنار کا موسم نہیں کہ گورز کے پھول ابھی بہار پر نہیں آئے) یہ کہہ کر آہستہ سے بولا تھا۔ گورز کے پھول تو سدا بہار ہوتے ہیں۔ وہ ہنسنے لگا تھا اور مجھے دیکھے جارہا تھا۔ہم وہاں سے نکل آئے عجیب موسم تھا۔

ایک شام ہم جنیوا میں تھے۔ ہم دونوں ہی۔ جنیوا لیک کو لگی لگی ایک سرسبز پہاڑی کے ڈھلانوں پر بسا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پریزادوں کا دیش۔ وہاں لیک کے کنارے پری زادوں کی شب بسری کے لیے بنایا ہوا ایک خوش رنگ ٹھکانا تھا۔ ایک گھونسلے جیسا ہوٹل۔ ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ ہم وہاں ایک چھوٹے سے گھونسلے میں تھے۔اس کے دروازے پر لکھا تھا۔ Solitude - اندر ایک چھوٹے سے آتش دان سے گھونسلا گرم گرم تھا۔ دریچے پر لگے شیشے سے دور کی پہاڑیوں پر گرتی برف کو دیکھ کر میں دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ بے قابو ہوئی جارہی تھی۔ نچلی منزل سے اوپر آتا ہوا وہ گا رہا تھا۔ سریلی آواز میں۔ کمرے میں آیا۔ سامنے ٹیبل پر پتہ نہیں کیا کیا لاکر ڈال دیا۔ مرغ و ماہی، گرم گرم۔ کباب ہرن کے جلتے ہوئے۔ پھل پھلاری۔ ہنستے ہوئے بولا " اور یہ دیکھو، یہ سب کچھ ہے پینے پلانے کے لیے۔ رنگ برنگے مشروب' یہ ہے تمہارے انڈیا کی Refined Finy - سب کو نہیں ملتی۔ صرف امیروں کے لیے ہے۔ اور یہ، یہ ہے Sippy - میں نے پوچھا " یہ کیا ہے " تو وہ بولا " بس ایک ہی سِپ کافی ہے۔ اس نے ایک سِپ لیا اور گانے لگا۔ میری طرف ایک بلوریں کپ بڑھا دیا' وہ ناچ رہا تھا۔ گا رہا تھا۔ میرے قریب آگیا، میرے کان میں کچھ کہہ گیا، جو میں کچھ سمجھ سکی۔ پھر بولا۔

Sippy is just a flame. No ? A flame.

وہ سیدھے میرے پاس آگیا۔ برفیلی شام میں وہ شعلہ میرے اندر بھی تھا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے اس قدر قریب آگئیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ آنکھیں میری آنکھوں میں سما گئیں۔ میری آنکھوں میں اتر گئیں ...."

اس طرح ہم ملتے رہے، ساتھ ساتھ رہے، کئی دلفریب سیر گاہوں میں۔ زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ لیکن .... یہ کہتے ہوئے کلثوم رُک گئی۔ اپنا گلا صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی جیسے گلے میں کچھ اٹک گیا ہے۔ پھر رکی رکی آواز میں بولی۔ " اس نے مجھ سے دغا کی۔ دغا۔ ہم یہاں جس کو دغا کہتے ہیں اس کو وہاں Unseasoned split کہتے ہیں۔ جیسے ایک موسم بدل گیا، اور کچھ نہیں۔ وہ موسم پھر آئے تو آئے، نہ آئے تو نہ آئے، کوئی بات نہیں۔ وہاں اس کو کوئی cheating نہیں کہتا۔ دھوکا نہیں کہتا۔ بے وفائی نہیں کہتا۔ اف، اُف ایک گرم گرم سی سلاخ اتر جاتی ہے سینے میں۔ میں اپنی نظروں کی بلندی سے ایک ایسی کھائی میں گر گئی کہ اب تک اس کی گہرائیوں میں سانس لے رہی ہوں۔ جہاں سے میرے کسی جذبے کی بلندی مجھے نظر نہیں آتی۔

میں اپنے دیش چلی آئی۔ یہاں کالج میں تمہاری کہانی سنی۔ تم کو دیکھا تو نہیں تھا، لیکن جب دیکھا تو لگا کہ تم تو افق تا افق پھیلا ہوا ایک ساگر ہو دکھ کا۔ اور اپنی ہی گہرائیوں پر سایہ کیے ہوئے ایک بلند ترین آسمان ہو۔ سمندر بھی بے کنار، آسمان بھی بے کنار۔ سمندر بھی ہے تو پر سکون، آسمان بھی ہے تو پر سکون۔ انسان کی شہرت و ناموری کوئی قوت نہیں ہوتی، یہ تو وہ سہارے ہیں جو نادار و نادان، بے کس و مجبور انسانوں کے ہجوم کے کمزور شانوں سے ملتے ہیں، ورنہ سچی عظمت یا بلندی تو وہ ہوتی ہے جہاں پہونچنے والا، اپنی جگہ اکیلا ہوتا ہے، تن تنہا اور زمین کے لمس کو کھو کر اس بلندی کا درد سہتا رہتا ہے۔ تم مجھے وہاں نظر آئے، اس بلندی پر، یکا و تنہا۔

جانے کیوں ایسا لگا کہ میں اپنے آپ کو جن پستیوں میں تلاش کر رہی ہوں، وہاں میرا سارا وجود بوسیدہ ہو چکا ہے، اور اس کی جھڑتی مٹی میرے سامنے بار بار میری موت کا ایک ایسا منظر پیش کرتی ہے جیسے میں اپنے ایک انتہائی گھناؤنے احساس میں دفن ہوں۔ وہ احساس میری ایک ایسی قبر ہے جہاں مجھے میری موت کے یقین کے باوجود ایک آس و امید کی دہکتی آگ کے جہنموں میں جھونکا جاتا ہے اور مجھے پھر اس زندگی کی سطح پر پھینک دیا جاتا ہے کہ سرِ شام قبر میں لوٹ جانا ہے۔ یہ قہر ہے، یہ قہر دراصل صرف تمہاری نظروں میں سمندر کی طرح پھیلا ہوا ایک بے کنار غم ہے، اسی

غم میں سما جانے کو میں اپنی نجات سمجھتی ہوں۔ اسی نجات کی امید نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا ہے۔ میں سچ مچ تمہاری دیوانی ہو چکی ہوں۔ تم میری نجات ہو۔ تم میری نجات ہو۔" کلثوم کی آواز ڈوب گئی۔

میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور ایک سرشاری کے عالم میں جوش و جنوں کے ساتھ، اس کے نازک نازک ہاتھوں کو ہلکے ہلکے دباتا رہا، تسلی دینے کے انداز سے۔ کلثوم کے ہونٹوں پر ہلکی سی سرخی پھوٹ پڑی۔ ایک گہرا سانس لیا اس نے اور کچھ میری طرف ڈھلک گئی جیسے ایک دھواں سا اٹھا دونوں طرف سے آہوں کا۔ میں صرف ایک بات کہہ سکا۔

"کلثوم میں تم کو کیسے بتاؤں، ابھی ابھی جو ایک طوفان سا آیا تھا، وہ گزر گیا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ میں اس طوفان کی زد میں آکر گرنے والے پیڑوں کے بیچ اسی طرح کھڑا ہوا ہوں، اپنے پیروں پر۔ دیکھو، میں کہیں کبھی کسی سبب ٹھوکر کھا کر گر بھی جاؤں، شراب کے بے حساب نشے میں سنبھل نہ پاکر تمہارے قدموں میں بھی گر پڑوں، تو بھی تم آنکھیں کھول کر دیکھو گی تو شاید تم مجھے اسی طرح سیدھا کھڑا پاؤ گی، بالکل اس طرح کہ وہاں ہمیشہ میرے سامنے مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا اور میری آنکھوں سے کبھی نہ ڈھلکنے والے آنسو اس مٹی میں ایک نمی سی پیدا کرتے رہیں گے۔ کسی درد کی گہرائیوں کے لاحاصل اظہار کو بھی زندگی کہتے ہیں۔"

اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میرا ہاتھ چھوڑ کر اس نے سر جھکا لیا اور میرے ہاتھ پر اس کے دو آنسو ٹپک پڑے۔

میں اب وہاں سے نکل سکتا تھا۔ میرے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لیکن عشق سے زیادہ بے معنی جذبہ، شاید جذبۂ انسانیت ہوتا ہے۔ وہاں اب ایک لمحہ بھی ٹھہرے رہنے کا کوئی سبب تھا نہ کوئی جواز، لیکن میں ٹھہر گیا۔ بے وجہ بے سبب۔ اور وہ ایک شدید اکتاہٹ جو کچھ دیر پہلے میرے ہر خیال و احساس میں سرایت کر گئی تھی، اب ایک سخت اور سرد لوہے کی کڑیوں کا بنا ہوا شکنجہ لگی۔ وہ دو لمحے خاموشی کے جو کٹے نا دہ بہت سے ان کہے الفاظ کے معنی ہی معنی بن رہے تھے اور اس کے ان دو آنسوؤں کی نمی کے احساس کو اس طرح پھیلا رہے تھے کہ وہی نمی اب اس کے ہونٹوں کی

کپکپاہٹ بن رہی تھی۔ ان ہی دو لمحوں کی طرح وہ چپ تھی۔ بھیگی بھیگی سی، سرد، سرد کیا منظر تھا وہ ایک غیور اور مغرور حسینہ کی بے مائیگی اور لاچارگی کا۔ ایک واضح سا خیال بلکہ یقین مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اس کیفیت کو کوئی فریب یا بھید بھاؤ کا نام دینا، وہ بھی ان لمحوں میں خود فریبی کی ایک بدترین مثال ہوگی۔

کچھ لمحوں میں میں وہاں سے نکل پڑا۔ اس کے گھر کی گیٹ تک پہونچ گیا۔ کلثوم پیچھے دوڑتی ہوئی آئی۔ "فرزی ٹھہرو۔ میں ابھی گاڑی لے آتی ہوں، تم کو پہاڑی کے نیچے تو چھوڑ دوں۔ چاہو تو تمہارے ہاسٹل تک بھی۔"

میں نے کہا۔ "نہیں، ضرورت نہیں، رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اندھیرے گہرے ہوگئے ہیں اور سردی بھی بڑھ گئی ہے۔ تمہیں واپس بھی تو آنا پڑے گا، جاؤ، واپس جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔ اس ڈھلان سے ایسے اتر جاؤں گا جیسے ہوا کا جھونکا۔" میں تیزی سے نکل پڑا۔ پہاڑی سے نیچے اترنے لگا، تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا۔ بس ایسا لگ رہا تھا کہ اس سردی میں بھی میں پسینے میں بھیگ رہا ہوں۔ میرے قدموں کی چاپ میں کسی اور کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہلکی سی ہواؤں میں ایک ہلکی سی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ "ذرا ٹھہرو ذرا، سنو ...." میں تیزی سے نیچے اتر رہا تھا، تیزی سے چلتی ہوئی میری سانسوں میں کلثوم کے پسینے کی خوشبو بھی محسوس ہو رہی تھی محسوس ہوتا تھا کہ میرے قدم رک رک کر آگے بڑھ رہے ہیں، کبھی لڑکھڑا جاتے ہیں، کبھی سنبھل جاتے ہیں۔ میرے لڑکھڑاتے قدموں کی آواز میں ایک دو ہچکیاں سنائی دے جاتیں، شاید کلثوم کی۔ پھر سانسوں میں وہی پسینے کی خوشبو۔ میں نے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا اور سوچا۔ "یہ سب کیا ہے؟۔ انسان کس قدر مجبور ہوتا ہے، قید رہتا ہے، اپنے ہی جذبات میں، احساسات میں، اپنے ہی طئے شدہ ارادوں میں اپنے ہی ضمیر کی زنجیروں میں۔ اور بھی کتنے ہی احساسات ہیں، جذبات ہیں جن سے وہ آزاد ہو سکتا ہے آخر یہ قید کون لگاتا ہے؟ ایسے لڑکھڑاتے اور سنبھلتے سنبھلے قدموں کا حساب کہاں ہوتا ہے، کون کرتا ہے؟ یہ تو ایک کسک ہوتی ہے، اس کو محسوس کرو تو اندھیرا جس کو ہم دوسری طرح اجالا کہتے ہیں، اور محسوس نہ کرو تو اجالا ہی اجالا، جسے ہم دوسری طرح اندھیرا کہتے ہیں۔ وہ جو ایک آہ ہوتی ہے، اس کو کچھ سمجھو ہی نہیں

تو بس ایک خیال، بس ایک احساس، جو شاید پل بھر بھی ہمارے ساتھ نہ رہتا ہو، یا پھر اس آہ کو کچھ سمجھو تو ایک راز، ایک غم، ایک طلسم، ایک ان دیکھی زندگی، ایک سچی عقیدت، جو زندگی کی راہ پر بار بار سامنے آنے والی ایک سنگین موڑ بن جاتی ہے۔ ہماری فکر واحساس کے کتنے تقاضے ہم کو اس موڑ تک لیجاتے ہیں، اور وہاں چھوڑ دیتے ہیں ہم کو تنہا، آس وامید کی دھندلی سی روشنی یا ہلکے سے اندھیرے کے ساتھ۔

اس کیفیت میں بھی میں اتنی تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا، جیسے میں اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا۔ پہاڑی سے اتر کر میں اب دور تک نکل آیا تھا۔ راستہ خاموش تھا۔ شہر بھی خاموش تھا، سویا ہوا تھا۔

جانے کیوں ایک نظر میں نے پیچھے کی طرف دور تک دیکھا تھا، وہ منظر بہت تکلیف دہ لگا تھا۔ دھندلاہٹوں میں نظر آنے والی وہ پہاڑی کی چوٹی پر وہ کوئی تارا ٹمٹما رہا تھا یا کوئی بجھی بجھی سی روشنی تھی۔ میں آگے چلنے لگ گیا۔ ہاسٹل پہونچ گیا۔ ہاسٹل بھی سو چکا تھا۔

باب (۴۱)

فرزی نے اپنی کہانی ختم کی اور یکلخت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور میس کی طرف دوڑ پڑا۔ وہاں سے ٹھنڈے پانی کی صراحی اٹھا لایا۔ پھر گلاس میں پانی بھر بھر کر پینے لگا۔ ایک گلاس، دو گلاس، تین گلاس .... میں نے کہا کیا ہو گیا ہے تجھے، کیوں پی رہا ہے اتنا پانی ؟۔"

اس نے کہا۔" پیارے، ویسے تو پہاڑی سے اترنے کے بعد ہی بڑی شدید پیاس محسوس ہوئی تھی۔ ہاسٹل پہونچ کر بہت سا پانی پی لیا تھا۔ لیکن اب جب سے کہ میں نے سارا قصہ سنایا ہے تو لگتا ہے دوسری بار پہاڑی سے اتر کر آیا ہوں۔ پیاس کچھ اتنی شدید ہو گئی ہے، لگتا ہے ساری زبان پر کانٹے اگ آئے ہیں۔ ٹھہر مجھے پانی پی لینے دے "

اس کے پانی پینے کے انداز سے لگتا تھا فرزی کے سارے بدن میں جیسے آگ لگی

ہوئی ہے، اس کے سینے میں جیسے ایک آنچ سلگ رہی ہے۔ اس کے پیٹ میں جیسے انگارے بھرے ہوئے ہیں۔ پانی پیتے ہوئے یکبارگی وہ ایسے رُکا جیسے وہ کسی تپتے صحرا میں دوڑتا رہا ہے اور اچانک اسے سامنے ایک گھنا سایہ دار پیڑ مل گیا ہے۔ جہاں ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ ہے اور وہ وہاں سستانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا اور دو گھڑی بعد میں نے دیکھا اسے نیند لگ گئی تھی۔

ویسے میں آج جب اس کی کہانی سُن رہا تھا تو یہی محسوس کرتا رہا تھا کہ میرے اندر بھی ایک زخم ہے اور وہ زخم میرے سارے احساسات و جذبات کی بنیادوں میں پھنسا ہوا ہے۔ کس ٹوٹتی بنتی امیدوں کے ساتھ سنا تھا میں نے وہ قصہ ٔ یک درویش، بار بار لگتا تھا کہ اپنا زخم اب بھرنے کو ہے، تب بھرنے کو ہے، لیکن ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ لگتا تھا یہ وہی زخم تو ہے جو اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا کر فرزی کی شکل میں میرے سامنے سویا ہوا ہے۔

پتہ نہیں کیوں ایسے ہی کچھ خیالات آنے لگے تھے ذہن میں۔ کیا انسان کے ذہن کی صحت کے لیے سوچتے رہنا اتنا ضروری ہے؟ خیالات کا آنا جانا اتنا ضروری ہے؟ ان ہی خیالات نے تو اسے سوچنے پر مجبور کیا ہے، زندگی کو سمجھنے پر مجبور کیا ہے۔ لیکن اس طرح سوچ سوچ کر ہی تو اس نے زندگی کو بے معنی بنا دیا ہے۔

لکڑہارا ہی تو تھا جان و جسم کا بھی اور بُدھی کا بھی۔ لکڑی کاٹ کاٹ کر آگ جلاتا، لکڑی کاٹ کاٹ کر گھر بناتا۔ پھل پات کھاتا اور رات کو ان لکڑیوں اور اپنی ساتھی کے بدن کی آگ تاپتا اور سو جاتا۔ صبح جھرنوں میں لوٹتا پوٹتا اور گاتا گنگناتا رہتا، مست۔ وہی سب کچھ اچھا تھا یا پھر زندگی کے اتنے سارے دکھ دکھڑے اتنے سارے غم آڑے ترچھے وار قسمت کے۔ وہ مہذب بنا تو قسمت کا تصور اس کی گردن پر تسمۂ پا کی طرح سوار ہو گیا، جس پر وہ بھروسہ بھی کرنے لگا ورنہ اس قسمت کے تصور سے پہلے تو اس کو صرف اپنے آپ پر بھروسہ تھا۔ وہ تو صرف ساہس اور ہمت کی بات کرتا تھا، اور اس طرح وہ اپنے غم اور دکھڑوں کا ہو کر نہیں رہ جاتا تھا۔ کیا مِلا اسے مہذب بننے میں؟ ہے کسی میں اتنی ہمت کہ اس حقیقت کو جھٹلا سکے کہ جنگل کا جانور، وحشی اتنا دکھی اور غموں کا مارا نہیں ہو گا جتنا کہ آج کا یہ کمبخت نیم جاں انسان۔

فرزی سویا ہوا تھا، اور میرے ہاتھوں میں اس کی ڈائری تھی جس میں میں اپنے غم و غصے کے ساتھ یہ خیالات رقم کر رہا تھا، یہ سوچ کر کہ وہ میری یہ تحریر پڑھ کر کچھ غیرت حاصل کرے گا۔

غیرت!! مجھے اس لفظ پر ہنسی آ گئی یہ سوچ کر کہ انسان نے اپنے آپ کو بامعنی بنانے کے لیے، کتنے بے معنی لفظ ڈھال لیے ہیں اپنی زبان میں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ فرزی جب یہ سب کچھ پڑھے گا تو کہے گا کہ کتابی علم تو سارے کا سارا ایک پھکڑ قسم کا علم ہوتا ہے، انسان کو کسی علمِ حقیقی کے عرفان سے یکسر محروم کر دیتا ہے اور دماغ کو کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ کالج سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والا تو ایک ایسا دماغ لے جاتا ہے اپنے ساتھ جس میں دراصل ایک دوسرا جنگل اُگ آتا ہے، گھنا گھنا سا ...."

اچانک فرزی اُٹھ بیٹھا۔ میرے ہاتھ میں اپنی ڈائری دیکھی تو جھپٹ کر ڈائری چھین لی۔ اور اس میں لکھی میری تحریر دیکھ کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

"واہ، آپ قلم سے لکھتے ہیں یا اپنے استرے سے۔؟ کمال کر دیا۔ دیکھیے یہ ایک بڑے آدمی کی ڈائری ہے، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ایک چھوٹا آدمی بھی اس میں کچھ لکھ دیتا ہے تو اس کی بات بھی بڑا اونچا فلسفہ بن جاتی ہے۔ اور آپ کا لکھا ہوا یہ فلسفہ تو فلسفہ آخر لگتا ہے کہ اب اس میں ایک لفظ بھی بڑھانے کی گنجائش نہیں۔ ہر علم یہاں آکر ختم، ہمیشہ کے لیے۔ واہ۔"

ڈائری بند کر کے وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا "ماننا پڑے گا استاد، اللہ میاں بھی بڑا ہوشیار ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر چلاتا ہے کاروبار دنیا کے۔ آپ جیسوں کو آخر پیدا کر ہی دیا۔"

اس کی بات پر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ میں نے سوچا، چلو مست ہے میرا یار۔ وہ تو صاف ستھرے انداز میں ہنستا بولتا رہتا ہے اور میں ہی ہوں کہ اس کو ہر گھڑی دکھی جان کر، اپنے دل کو بے معنی وسوسوں کے حوالے کر دیتا ہوں۔ اب ہلکی سی نیند سے اُٹھ بیٹھا ہے تو کتنی کھلی اور صاف باتیں کر رہا ہے۔"

"دیکھ پیارے۔" فرزی کہنے لگا۔ "مجھے تو ٹھیک سے معلوم نہیں یا پھر یاد نہیں کہ میں دن کے وقت پیدا ہوا تھا یا رات کے وقت۔ لیکن آج مجھے ایسا احساس

ہو رہا ہے کہ یا تو میں آج پھر سے پیدا ہونے کی تیاری کر رہا ہوں یا پھر میرے دل و دماغ کچھ نئے نویلے خیالوں اور ارمانوں کی ایک نئی بستی تعمیر کرنے پر تلے ہوئے ہیں، جہاں کے پیڑ پات بھی ہرے بھرے ہوں گے، ان پر نئی نئی کونپلیں بھی پھوٹ رہی ہوں گی۔"

اس کی اس بات پر میں اپنی ناسمجھی کی پیدا کی ہوئی کچھ امیدوں پر زیادہ غور کرنے لگا۔ لگتا تھا، سمجھداری سے تو ناسمجھی زیادہ مرغوب ہوتی ہے انسانی فطرت کو۔ کتنی لذت ہوتی ہے اس میں۔ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے میں فرزی کی طرف گھورے جا رہا تھا۔"

"ایسے کیوں گھور رہا ہے مجھے؟ فرزی نے پوچھ لیا اور کچھ لہجہ بدل کر مجھ سے کہنے لگا۔" بات اتنی ہی ہے میری جان۔ یہ سارے احساس مجھے یقین دلا رہے ہیں کہ دن کے وقت پیدا ہونا بڑا اچھا شگون ہوتا ہے۔ اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ آج دن ہی میں کچھ پینا پلانا چاہیے۔ اپنی جنم گھڑی کے ساتھ۔ تیرے پاس شراب ہے نا، اُڑا دے اس بوتل کا کارک۔ آج دن میں پئیں گے اور رات کو چھٹی منائیں گے۔"

میں نے کہا۔" بس اتنی سی بات؟ واہ رے میرے گرو۔ یہ شراب کی ایک بوتل کے لیے پھر سے پیدا ہونے کا کشٹ کیوں اٹھا رہا ہے تو۔؟"

"یہ اَوش ہے، میرے بھگت۔" اس نے کہا۔" لگتا ہے آج پو پھٹنے کے ساتھ ہی میرے پہلے جنم کا انت ہو گیا۔ اس جنم میں تو میں رات میں پیا کرتا تھا، لیکن اب جو میرا دوسرا جنم آرنبھ ہو رہا ہے تو لگتا ہے کہ اب دن ہی میں پینا پڑے گا ورنہ یہ جنم بھی ختم ...."

ہم دونوں ہنس پڑے۔ میں نے اپنے میز کی دراز سے بوتل نکالی۔ دو گلاس لے آیا۔ ایک دوسرے سے بڑے ہی پرجوش انداز میں چیرز کہہ کر ہم پینے لگے۔ اس نے دو ہی گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کر دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔" اس طرح کیوں پی رہا ہے شراب؟"

فرزی نے میری بات پر غور تک نہیں کیا اور بوتل اٹھا کر دوسرا گلاس بھرنے لگا۔ میں نے کہا۔" کیا ہو گیا ہے تجھے، جس طرح پانی پی رہا تھا، اسی طرح شراب پی رہا

ہے، ذرا ڈھنگ سے پی، شرافت سے پی اور کچھ اچھی اچھی باتیں کر میرے لاڈلے۔"

میری بات ختم ہونے ہونے تک اس نے دوسرا گلاس بھی خالی کر دیا۔ اور کہنے لگا" اور تھوڑی سی "۔بس تھوڑی سی ڈال دے، ذرا اپنے لیول پر آجاؤں گا، ڈال نا؟" میں نے شراب ڈال دی اس گلاس میں۔ وہ خوش ہوگیا اور بولا۔" ارے دیوانے، شاید تو نے اردو شاعری نہیں پڑھی ہے! اگر پڑھی ہوتی تو آج اس کے سایہ، عاطفت میں ہوتا تو۔ اے انسان نما ویرانے۔ لگتا ہے تیری زندگی کی دیوار پر تو اس شاعری کی کائی تک اُگی نہیں کہیں۔ سُن، یہ بات سُن ....

مت سہل اِسے جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اب تھوڑی سی اور ڈال دے۔ بس نکل آؤں گا اس پردے سے انسان بن کر۔ بس تھوڑی سی۔ اب میں اپنی شراب تیری شرافت اور تیری سوجھ بوجھ کے ساتھ پیوں گا، Promise ۔ اس لیے کہ آج ہم دن بھر پئینگے اور رات کو جائیں گے اس بھولے بسرے کوچۂ یار کو۔ اس ماہ لقا کے پاس۔ وہی بسنت کی قمری، سُرور ہی سُرور، رقص ہی رقص۔ چھنا چھن چھنا چھن۔ پھر تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال، دلِ گم گشتہ۔ ہاں دلِ گم گشتہ۔ کیا کہا تھا چچا نے۔؟ بالکل اپنے جیسا تھا اپنا چچا۔ اور آج ہم بھی بالکل اس جیسے ہیں۔ لیکن کیا کہا تھا چچا نے .... بول نا۔ وہ دلِ گم گشتہ، اچھا وہ چھوڑ یار یہ ٹھیک رہے گا .... دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز .... ہنوز .... دیوانے، ہنوز۔ واہ ...." وہ میری طرف پلٹا۔ چل جلدی سے شراب پی یار، آج پھر اپنے دوست رئیس کے کمرے کو جائیں گے۔ وہ آج بھی ضرور ایک شادی کر رہا ہوگا۔ ارے رئیس ہے، رئیس شہر۔ روز ایک شادی نہیں کرے گا تو جیے گا کیسے؟ تیری میری طرح؟ تھو ہے تجھ پر۔ تھو۔ خیر وہ نہیں کرتا آج کوئی شادی تو چل ہم اپنے رفیق اعظم نواب فرخندہ کی کوٹھی کو جائیں گے۔ اس نے کہا تھا نا کہ اس کے محل میں دو نوخیز جوانیاں ہیں گل بکاولی اور انار کلی، سجل، سریلی اور تابند۔ واہ، کس عزت سے بلایا تھا اس نے ہم کو، کہ کبھی فرصت سے آجایئے، سج دھج کر آجایئے۔ دل بہلائیں گے یاد ہے نا؟ .... تھوڑی اور شراب دے۔ دے نا ...." قرزی مسلسل شراب

پیے جا رہا تھا۔" دے دے یار تھوڑی شراب۔ تو تو کسی نواب کی اولاد بھی ہوتا نا تو تجھے نواب کی اولاد کوئی نہیں مانتا تھا۔ ارے نواب بڑا دل والا ہوتا ہے، دل کھول کر محبت کرتا ہے، ایک سے نہیں، دس سے۔ اور دل کھول کر عزت کرتا ہے سب کی۔ ارے واہ، بولا تھا نا، کبھی آجایئے فرصت سے۔ واہ، وہ دولت کا نواب۔ ہم فرصت کے نواب۔ اب تو فرصت ہی فرصت ہے، عمر بھر کی چھٹی۔"

فرزی نے اچانک اپنا گلاس تپائی پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا، جیسے باہر چلا جانا چاہتا ہو۔ لیکن پھر بیٹھ گیا اور اپنا گلاس پھر ہاتھ میں لے لیا۔" بول چلتا ہے نا اس قمری کے پاس، بول نا، چپ کیوں ہے۔ پیسے نہیں ہیں تو جا تیری اس آدم خور کے پاس۔ سب جائز ہے، دیوانے، جا تیری میڈم کے پاس۔ انگریزی سکہ لے آ۔ دس پونڈ دے گی تجھے وہ۔ پھر بگھی میں بیٹھ کر جائیں گے ہم، نواب کے پاس ٹھاٹھ سے۔ چل اُٹھ۔ کر دے بوتل خالی۔ چل۔" اچانک اس نے بوتل اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنے گلاس میں بہت ساری شراب ڈال لی اور میرے گلاس میں بھی۔ بولا" ڈر مت، چیرز، چیرز۔"

فرزی نے بہت تیزی سے پی اور بہت زیادہ پی۔ وہ میرے بستر پر ڈھیر ہو گیا، جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔" چل نا ؟۔ وہ نواب .... نواب .... وہ نواب زادی ..... میں جا رہا ہوں ..... میں۔"

وہ اب بالکل خاموش تھا۔ اس کی سانسوں میں نہ بگڑا پن تھا نہ سنبھلا پن۔ میں سوچنے لگا۔

یہ فرزی بھی ان دنوں جانے کن کن کیفیتوں سے گزر رہا ہے۔ ان کیفیتوں میں شاید ایک کیفیت کلثوم بھی ہے۔"

سنتے آئے ہیں کہ زندگی کے کچھ درد و غم ایسے ہوتے ہیں جو پرانے ہو جائیں تو عقیدے بن جاتے ہیں۔ ایمان بن جاتے ہیں۔ دل ان کی پرستش کرنے لگتا ہے، عبادت کرنے لگتا ہے، لیکن اگر وہ درد و غم زخم بن جائیں تو اندر ہی اندر زہر بنتے رہتے ہیں اور باہر باہر سوکھنے لگتے ہیں۔ خون کے ٹھہراؤ کے ساتھ زخم کے احساس میں بھی ٹھہراؤ سا آنے لگتا ہے۔ اور نا امیدیاں اور مایوسیاں جب کچھ سیاہیوں میں پھنسے ہوئے یقین بننے لگتی ہیں، تو برداشت کرنے کا اظہار بے اثر بن جاتا ہے۔

شاید یہی ہوا ہے اس کے ساتھ بھی، جب اس نے کلثوم کے ساتھ وہ گہری نیلی شام گزاری تھی جس پر اندھیروں کا گمان ہوتا تھا اسے۔ اور ان اندھیروں میں اس کو ایک ساتھ جانے کتنی ظالم جراحتوں سے اور مہربان جراحتوں سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ جن سے اس کے زخم کھل کھل گئے تھے۔ زہر بھرے زخم کچے ہو گئے تھے اور اس کے سارے پرانے درد پھر سے ہرے اور جواں ہو گئے تھے۔ اور اب وہ آہ بھی کرتا تو وہ آہ کسی شدید تکلیف کا اظہار نہیں بن پاتی۔

اس نے تو مجھے ہر بات بتادی تھی اس شام کی کتھا سناتے ہوئے۔ کیسی انوکھی چمک دمک تھی اس کے ماتھے پر، اس کی آنکھوں میں، اس کے گالوں پر۔ جیسے جشنِ چراغاں تھا وہاں اس کے سارے چہرے پر اس کی فتح یابی کا۔ کہ ہاں کس شتابی سے وہ اس پہاڑی سے اتر گیا تھا بستی کی گہرائیوں میں، رات کی تنہائیوں میں۔ اسی جشن کا ایک سلسلہ تھا یہ بھی کہ آج میرے ساتھ اس نے اتنی بے حساب شراب پی تھی، وہ بھی ایک غضبناک تیزی کے ساتھ۔

جتنا بھی دن باقی تھا وہ سوتا رہا اور رات بھی وہ سوتا رہا۔ اس رات مجھے بھی کچھ زیادہ ہی نیند آگئی تھی۔ میں سو رہا تھا۔ لیکن اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میری پیشانی پر کسی نے اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میں گہری نیند سے چونکا۔ آنکھیں کھولیں تو کمرے کی مدھم روشنی میں ایک پرسکون چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ فرزی مسکرا رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیوں اٹھ بیٹھا تو اتنی جلدی، ابھی تو صبح نہیں ہوئی؟"

وہ بولا۔ "ہاں ابھی تو صرف آدھی رات گزری ہے۔"

"تو جا، سو جا۔" میں نے کہا۔

اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "نہیں، میں جارہا ہوں۔"

میں تقریباً چیخ پڑا۔ "اب!" "اس وقت! اتنی رات گئے۔ کہاں جارہا ہے، اور کیوں؟"

اس کا ہنستا ہوا چہرہ مجھ سے اور بھی قریب آگیا۔ "میں جارہا ہوں۔ اس پہاڑی پر مجھے کلثوم نے بلایا ہے۔" میں نے کچھ تلخ لہجے میں کہا۔ "دیکھ، تو یا میں، یا ہم دونوں

کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔" نہیں، میں جارہا ہوں۔"

میں نے کہا۔" دیکھ مجھے تنگ نہ کر۔سونے دے مجھے۔"

اس نے کہا۔"سو جا۔تو سو جا۔میں جارہا ہوں۔"

میں نے کچھ غصے میں اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس کو جھنجھوڑ کر بولا۔" پیارے جا۔اپنے بستر پر سو جا۔کیوں جان لے رہا ہے اس آدھی رات کو۔جا۔جا مر وہاں۔کل صبح میں ساری بات سنوں گا، پھر اجازت دوں گا تجھے کہیں جانے کی۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے اور کچھ سنجیدہ لہجے میں بولا "سن، میں نے آج تجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی۔کلثوم نے مجھے آج بلایا ہے، وہ بھی آدھی رات گزر جانے کے بعد۔شام میں اس کے گھر آج اس کے پپا اور ممی کے دوستوں کی پارٹی تھی۔آج کل کی پارٹیاں راتوں میں ذرا دیر تک چلتی ہیں نا، تو اس نے کہا تھا، آدھی رات گزر جانے کے بعد آنا، میں تمہارے ہاسٹل کی نکڑ تک گاڑی بھیج دوں گی، اس میں چلے آنا۔" لگتا تھا یہ سب کہتے ہوئے وہ بڑے ہی صدق دل سے مسکرا رہا تھا۔اس نے پھر کہا۔" دیکھ میں نے بھی ٹھان لی ہے، طے کر لیا ہے میں نے بھی کہ اب ایک بھرپور زندگی گزاروں گا۔میں نے آج جو کہانی تجھے سنائی تھی، وہ آدھا سچ تھی اور آدھا جھوٹ۔آج شام تو نے مجھے جس کیفیت میں دیکھا تھا وہ دراصل وہی تو کیفیت تھی جس میں مَیں اپنے پرانے جنم کو تج رہا تھا۔اس سے اپنا رشتہ توڑ رہا تھا۔کتنے تانے بانے ٹوٹ گئے۔واہ۔وہ سب جذباتی باتیں تھیں۔تھیں نا؟ ہاں، اب کی چھٹیوں سے واپس آکر بھی تو میں نے تجھ سے کہا تھا، ہم اب صرف پڑھیں گے اور خوب پڑھیں گے۔آج کلثوم سے بھی میں نے وعدہ کیا ہے کہ اب ہم صرف جئیں گے، اور خوب جئیں گے۔زندگی پھر بھی زندگی ہوتی ہے، ماننا پڑا یار۔"

میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا، لیکن کچھ ایسا بھی لگ رہا تھا کہ وقت سے پہلے ہی طلوع ہو جانے والی صبح کی سفیدی ہے اس کی مسکراہٹ میں، اور خیال آرہا تھا کہ جمنا میں وہ سبک سار لہریں اُٹھ رہی ہیں آنے والے سویرے کی اور ان لہروں میں بہتے ہوئے فرزی کی نیّا کنارے لگنے والی ہے۔والہانہ انداز میں، مَیں نے اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔بِرِنداون سے لگا ہوا کنارہ جمنا کا میری نظر میں تھا، دھندلکوں میں چھپا ہوا تھا

میں نے کہا۔

"ایک بہت بڑی قینچی ہونی چاہیے یا کوئی ایسا ہتھیار، جس سے جی چاہے تو گھڑی بھر میں رات کو کاٹ کر اس کے دو ٹکڑے کر دے سکو، تاکہ ان میں سے صبح نکل آئے۔ اور ہم جب چاہیں صبح ہو جائے۔ سب کی صبح ایک ہی دم کیوں ہونی چاہیے" فرزی بڑی دلداری سے ہنس پڑا اور بولا "ارے دیوانے، مجھے تو وہاں رات کے اندھیروں کی ضرورت ہے۔" تو میں کچھ زیادہ ہی خوش ہو گیا اور بولا۔ "پیارے، خدا کرے تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صرف سچ ہو اور سچ کے سوا کچھ نہ ہو۔" میں اپنی بات پر کچھ ہنس پڑا اور اس سے کچھ قریب ہو کر کہنے لگا" دیکھ۔ تُو تو برسوں کا پیاسا ہے اور وہ جس کے پاس تو جا رہا ہے، ایک سمندر ہے۔ سارا سمندر پی جانا۔ اور ساری پیاس بجھا لینا۔ اور کچھ نہ سوچنا۔ پچھلا نہ اگلا۔ سب برابر ہوتا ہے۔ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ سب چلتا ہے۔ اپنی پیاس بجھانے والے اس سمندر کے سوا دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہیں۔ بے خوف و بے خطر، بے دھڑک، بے دریغ نکل جا اپنے سفر پر۔ جا۔ جا۔ اس لمحے مَیں تو بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں تجھ سے، لیکن وقت کم ہے، جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ سب کچھ لکھ رکھوں گا۔ پڑھ پڑھ کے تب مزا لینا۔ جا۔ نکل جا۔"

سارا ہاسٹل سویا ہوا تھا۔ سارا شہر خوابِ غفلت میں تھا۔ ہاسٹل کی گیٹ تک اسے چھوڑنے کے لیے میں اس کے ساتھ گیا۔ گیٹ کے قریب چوکیدار سو رہا تھا۔ گیٹ کھول کر فرزی باہر نکل گیا۔ رات کے اس پہر، وہ گلی کیسی نظر آ رہی تھی۔ اکیلی، اکیلی جس سے ہوتا ہوا میں پہلی بار ہاسٹل میں داخل ہوا تھا۔ میں فرزی کو دیکھتا رہا۔ فرزی گلی کی نکڑ تک پہونچ گیا۔ سوچا، یہ موڑ جانے فرزی کی زندگی کی کونسی موڑ ہے۔؟ فرزی اس موڑ سے آگے نکل گیا۔ شاید وہیں کہیں کلثوم کی بھیجی ہوئی گاڑی کھڑی ہوئی ہو۔

میں اپنے کمرے کو لوٹ آیا اور بستر پر لیٹ کر فرزی کے بارے میں کچھ اس عجیب و غریب انداز میں سوچنے لگ گیا جیسے میں چاہتا ہوں ایک ہی لمحے میں بہت کچھ سوچ لوں، کچھ ایسا بھی ہو، کچھ ویسا بھی، بڑی ہی تیزی سے میں اس کا ایک ایک قدم گننے لگا۔ کلثوم کی ڈیوڑھی کا گیٹ کھلی ہے۔ وہ کار سے وہیں اتر گیا ہے۔ اور دھندلکوں

میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پہلی ہی دہلیز پر کلثوم نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا ہے، وہ دونوں گھر کے اندر چلے گئے ہیں۔ شاید اوپر کی منزل پر اس کی خوابگاہ ہے۔ اس نے اس کو اپنی خوابگاہ میں لے جانے کا اہتمام کر رکھا ہے۔ وہ دونوں صبح سے پہلے خوابگاہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور ان کی بے تابیاں کسی قرار کو پاس آنے نہیں دیتیں۔ بیتابیاں تپتی جائیں۔ جلتی جائیں۔ دو بدن آگ ہی آگ۔ یا پھر کسی ندی کا رُکا ہوا سیلاب، اس پر لگے بند کو توڑ دے۔ تو کیا نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے کو چُور چُور کر دیا ہوگا دونوں نے۔ پتہ نہیں۔ میں اپنی سُدھ میں کہاں سے کہاں چلا گیا۔ خبر ہی نہیں ہوئی کہ رات ختم ہو چکی ہے اور کمرے کے باہر قریب کے ایک پیڑ پر اچانک کوئی طائرِ سحری بول گیا ہے۔ میں خوش خوش اٹھ بیٹھا، صبح کے پھیلتے اجالوں میں، اس صبح کی ہواؤں میں سُرور ہی سُرور محسوس کرتا رہا۔

باب (۴۲)

تین دن گزر گئے، فرزی نہیں لوٹا، ویسے میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس بار جن حالات میں فرزی ہاسٹل سے گیا تھا ان حالات میں تو اسے جلد ہی لوٹ آنا چاہیے تھا۔ میں کچھ عجیب عجیب وسوسوں میں وقت گزار رہا تھا، اس کا انتظار تو اتنا شدید تھا کہ ہر لمحہ مجھے کہیں نہ کہیں کسی بھی رُخ پر ایک ہلکی سی آہٹ سنائی دے جاتی، جیسے فرزی آگیا ہے، یا کسی نے اچانک مجھ سے کہہ دیا ہے "دیکھ، آگیا وہ تیرا فرزی۔ یا جیسے فرزی ہی بول پڑا ہے "یہاں کیوں مر رہا ہے، چل، چل کمرے میں چل۔ تجھے سب کچھ بتاؤں گا۔ ایک ایک سانس کا حساب دوں گا۔ میری ہی نہیں، اس کی بھی ہر سانس کا حساب .... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ نہیں آیا تھا۔

تین دن بعد آج میں اپنے آپ کو باضابطہ گھسیٹ کر لے گیا کالج کو۔ کالج پہونچا تو سب سے پہلے یہی خواہش سر مارنے لگی سینے میں کہ سیدھے چلا جاؤں لیڈیز روم کو۔ لیکن شاید کلثوم بھی نہیں آئی ہو کالج کو۔ اس کو تو اب زندگی بھر کا سوئیٹزر لینڈ مل گیا ہے۔ پھر بھی وہی خواہش زیادہ شدید ہو گئی کہ لیڈیز روم کو چلا جاؤں۔ شاید مل

بھی جائے کلثوم وہاں ۔ کچھ تو معلوم ہو گا فرزی کا اتا پتہ ۔ اور کلثوم کا آپا سراپا بھی تو دیکھوں ۔ وہ طلعت زیبا، زرّین مسکراہٹ، لجائی چھب، بے سبب ہی بگڑی چتون ۔ ایک ناز سا اپنے وجود پر، کچھ کامرانیوں کا تیج، یقین ۔ مجھے دیکھ لے گی تو چھکتی ملے گی، بہکتی ملے گی، مہکتی ملے گی ۔ بہت ممکن ہے، اکیلی ہو تو جوش میں آگے بڑھ کر میرے گال چوم لے ۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں آج لیڈیز روم کی طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ۔ آج کالج بھی کچھ معمول سا نہیں تھا ۔ عجیب و غریب قسم کا شور تھا اِدھر اُدھر ۔ عجیب گہما گہمی تھی ۔ کالج کے ورانڈوں میں جا بجا نوجوان لڑکے، لڑکیاں اپنے اپنے گروپس میں کھڑے کچھ زیادہ ہی اونچی آواز میں بات کر رہے تھے ۔ میں نے یہ تو دیکھا تھا کہ کچھ دنوں سے شہر کا رنگ ڈھنگ بھی بدلنے لگا تھا، جیسے یہاں سب کچھ بدل جانے والا ہے ۔ سیاست ہی سیاست تھی کالج کی باتوں میں کہ شہر میں کرفیو لگنے والا ہے ۔ یہ لفظ میرے لیے ہی نہیں، سارے شہر کے لیے نیا نیا تھا ۔ اس لیے میں نے ڈکشنری میں دیکھا تھا کہ اس کرفیو کے کیا معنی ہیں ۔ راتوں میں کچھ راستوں کی روشنیاں بجھادی جاتی تھیں ۔ لوگ کہتے تھے Black Out ہونے والا ہے ۔ اور فوجیں آ رہی ہیں ۔

میں نے سوچا تھا ۔ پھر وہ فرزی کا کیا ہو گا ۔ وہ کرفیو، وہ بلیک آوٹ، وہ سائرن وہ لڑائی ۔ کبھی رات میں سائرن بھی بجتے تھے خطرے کے ۔ یہ شہر اور یہ کالج ۔ ہائے خیال آیا تھا، یہ پُرسکون شہر، یہ پُرشباب کالج ۔ یہ عشق و فلسفے کا کالج ۔ حُسن و منطق کا کالج ۔ لطافت شباب اور ریاضی اور سائنس کی کلوں کا کالج ۔ ادب و شعر کی فصاحتوں کا کالج، حدیث ہائے دلبراں کا کالج، جواں جواں رفاقتوں اور رقابتوں کا کالج، داستانوں اور حکایتوں کا کالج ۔ کتنا گڈمڈ ہو جائے گا سب کچھ ۔ آخر یہ سیاست ہی سیاست کیوں ہے ہر طرف، یہ تاریخ کی غلط بیانیاں کیوں، اور یہ تاریخ کیوں؟ دنیا بھر کے علم و فکر کی ساری کتابوں کو اکٹھا کر کے ان کا ایک مینار کھڑا کر دو ۔ پھر بھی انسانی تاریخ کی ایک شہتیر جیسی کتاب، اپنی ضخامت اور اونچائی میں اس مینار سے اوپر ہی نکلی ہوئی لگے گی ۔ اتنی ساری تاریخ کے بعد اب اور تاریخ کی ضرورت کیا ہے؟ یہ تاریخ کا چلن چھوڑ دو ۔ یہ سب بیکار ہے انسان کی فطرت کو تو سب سے زیادہ آسان اور سہل ترین

بات وہ لگتی ہے جو ہر عالِم اور اَن پڑھ کو یکساں بنا دیتی ہے۔ سب کی سمجھ میں آجاتی ہے وہ بات تو صرف حق و صداقت کی بات ہوتی ہے، جس کو سمجھنے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن وہ بات ہم کیوں نہیں کہہ پاتے۔ شاید اس لیے کہ ہم سب اس سے ڈرتے ہیں۔ یہ آسمانوں کو چھونے والے نعروں میں جو بات چھپی ہوتی ہے، نعروں جیسی اونچی صداقت لگتی ہے، لیکن وہ صداقت نہیں ہوتی، سچ نہیں ہوتی، سچ یا صداقت تو صرف وہ بات ہوتی ہے جو ایک نتیجے کی شکل میں سامنے آتی ہے، جو ایک عمل بنتی ہے، وہ بات جو کتابوں میں ہوتی ہے، صداقت ہی ہوتی ہے، اپنے معنی مطلب میں۔ لیکن کوئی ایسی صداقت نہیں بنتی جو ایک جیتی جاگتی زندگی بن کر سامنے آئے۔ صدیوں سے چل رہا بنجارہ، گاتا ہوا ان ہی صداقتوں کو مست مست اپنی دُھن میں۔ جن کو سن کر پیڑ پات ہلتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں، بس اور کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں۔ اور یہ بات، یہ صداقت، کسی بادشاہِ وقت کی یا شہنشاہِ وقت کی یا کسی حکمرانِ وقت کی جاگیر نہیں ہوتی، یہ تو ہر انسان کی زبان ہوتی ہے، اس کا دل ہوتی ہے، جان ہوتی ہے، اسی لیے جب اس کو قتل کیا جاتا ہے تو کروڑوں، دکھی و بے در انسان قتل ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی کتاب اور دبیز اور ضخیم بن جاتی ہے اور اس کے سامنے دنیا بھر کے عِلم و فکر کی کتابوں کے مینار کا قد اور گھٹ جاتا ہے۔

میں نے سوچا، چلو کلثوم سے اس موضوع پر بات ہو سکتی ہے۔ یہ موضوع آج کلثوم سے مِل لینے کا آسان اور واجبی بہانہ ہو سکتا ہے۔ میری ہمت بڑھی۔ میں نے دو قدم بڑھا دیے ادھر۔ لیکن کیا چھینکا ٹوٹا قسمت سے، سامنے کالج کی وہی تجربہ کار آیا نظر آگئی۔ وہ میرے قریب آکر ایک نویدِ صبح دے گئی۔ "بی بی بلا رہی ہیں آپ کو۔ اکیلی ہیں وہ ...."

میں تو جیسے دو ہی قدموں میں لیڈیز روم پہونچ گیا۔ کلثوم اکیلی تھی، اپنے خیالوں میں کھوئی کھوئی۔ مگن مگن۔ لیکن ایسی تو نظر نہیں آئی تھی پہلے کبھی۔ میری نظر تو اس کی ناک میں لگے نگ پر جم گئی جو ہر رُخ پر چمک دمک رہا تھا۔ پھر وہ اس کے کانوں کے زمرّدیں بُندے جو میری آنکھوں کو روشن کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تو فرزی کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی روشنی ہو گی۔

پتہ نہیں کیسے میں جب بھی دیکھتا تھا، وہ مجھے طلوع ہوتی ہوئی صبح لگتی تھی ۔ ایک نئی صبح کی طرح فضاؤں پر چھائی ہوئی ۔ اور آج اس وقت بھی اس کو دیکھتے ہوئے اس کے آس پاس صبح کی ٹھنڈکوں کا سا گمان ہوتا تھا ۔ وہ آج عجیب سے سحر رنگ لباس میں تھی ۔ سحر کی کھلی کھلی سفیدیوں سے بنا لباس اور موگرے چنبیلی کی کلیوں کی ٹھہری ٹھہری خوشبو میں بسا ہوا ۔ بال اس کے آج کھلے تھے جیسے گجرے بجرے تو اجڈ گنوار ہوتے ہیں، بندش بن جاتے ہیں بیکار کی ۔ اس کی روشن پیشانی اور اس کے گُل رنگ رخساروں پر اس وقت جو نمی تھی اس کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ساری رات خجل خجل سی رہی ہوگی اور صبح فرزی کہیں چلا گیا ہوگا اس سے کچھ کہہ کر ۔ کیسے پوچھوں اس سے ۔؟ اس نے میری آہٹ سنی تو چونکی اپنے خیالوں سے، اور کچھ اس طرح چہک اٹھی

" Oh you fruity – You are back on Your beat again – so much longing to see you "

وہ آج ایک نئے انداز سے بات کر رہی تھی، بار بار مسکرا رہی تھی، مجھے لگا تھا کہ وہ خوب جانتی ہے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے ۔ میں نے پوچھ لیا ۔ " اس رات کے بعد .... " اس نے بات کاٹ دی اور پوچھا ۔ " کونسی رات کے بعد ؟ " میں کچھ سہم گیا اور اس کی نظروں کو دیکھ کر چپ ہو گیا ۔ سوچا کہ شاید وہ بات وہ مجھ سے چھپانا چاہتی ہے لیکن میرے اندر میرا سارا وجود مُصِر تھا کہ میں پوچھوں اس سے فرزی کے بارے میں .... میں نے پھر کہا ۔ " وہ فرزی ۔ " تو اچانک وہ بول پڑی ۔ " ارے وہ فرزی !! " اور ایک زوردار قہقہہ لگایا اس نے ۔ " وہ ؟ ٹھہرو، تم نے دیکھا ہوگا آج کالج میں بڑی گڑبڑ ہے، بڑا ہنگامہ ہے، کیا چیخ و پکار ہے، ایک خوشخبری ہے کہ ہمارے Exams postpone ہونے والے ہیں ۔ شاید آج نوٹس لگ جائے ۔ میں سوچتی ہوں اس occa sion کو celebrate کیا جائے ۔"

میں یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ وہ اور فرزی آج میرے ساتھ شام گزاریں گے کچھ رنگ ہوں گے ۔ لیکن اس نے کہا ۔ " چلو ہم مِلک بار چلتے ہیں ۔ مینگو فول (Mango fool) پئیں گے وہاں ۔ اتنا بہت سا آئس ملا کر ۔ ٹھنڈا ۔ چلو ۔ " تیزی

۔ سے وہ اپنی سیٹ سے اُٹھی ۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا ۔ " چلو ۔ " کالج کے سامنے کی سڑک پار کر کے ہم مِلک بار پہونچ گئے ۔ ملک بار تھا بہت ہی اونچے قسم کا ، نام تھا Kadar - ایک رُخ پر دو تین گھنے پیڑ تھے اور کچھ دھوپ میں اور کچھ ان پیڑوں کے سائے میں جو ایک لان تھا وہاں مہندی کی تر و تازہ باڑھ کو تراش کر کیو بیکل بنائے گئے تھے ۔ ان پر لکھا تھا Hide - Out - ہم وہاں بیٹھ گئے وہ مجھے بڑی مسرور لگ رہی تھی اور اس قدر تر و تازہ کہ اسے دیکھ کر زیادہ یقین ہونے لگا تھا کہ ایک شاعر کے تخئیل کی طرح شبِ وصال کے بعد دوشیزگی اور نکھر آئی ہے ۔ ان پیڑوں کے گھنے سائے میں بیٹھے ہوئے اور ٹھنڈے مشروب کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا ۔ " ولی میڈم تم سے بہت اِمپرس ہوئیں ۔ وہ تم کو بہت پسند کرتی ہیں ۔ وہ تم کو یورپ لے جانا چاہتی ہیں وہاں کے انٹلیکچول سرکل میں تم کو انٹروڈیوس کرانے کے لیے ۔ ان کی دی ہوئی کتاب پر تم نے جو نوٹ لکھا ہے اس کے بارے میں وہ کہہ رہی تھیں کہ بڑا ہی (Fantastic) نوٹ ہے ۔ "

میں نے اپنا گلاس ٹیبل پر رکھ دیا اور اوپر پیڑوں کے پتّوں سے جھانکتے ہوئے آسمان کو دیکھنے لگا ۔ وہاں ایک کالا کالا سا پرندہ نظر آیا جو اپنی کالی بولی میں کہے جا رہا تھا " نوٹ .... نوٹ .... نوٹ ۔ کونسا نوٹ ..... ؟ " میرے حیرت زدہ ذہن نے مجھے سہارا دیا ۔ " ہاں نوٹ ۔ چپ رہو ۔ دیکھو جھوٹ کتنا بڑا دیوتا ہوتا ہے ۔ کہاں کہاں اور کس کس طرح پوجا ہوتی ہے اس کی ! .... "

میں اپنے اس خیال پر مسکرا پڑا کہ کیا مزے کا جھوٹ ہے کہ کہنے والا بھی جانتا ہے اور سننے والا بھی جانتا ہے کہ یہ ایک جھوٹ ہے اور ان دونوں کے بیچ کیسی مزے مزے کی سمجھداریاں ہیں ۔ "

پھر کلثوم نے کہا ۔ " تم جانتے ہو اب قریب دو مہینے کالج بند رہے گا ۔ پتہ نہیں کیا کیا ہونے والا ہے شہر میں ۔ ؟ ہم سب بکھر جائیں گے ۔ تم کہاں رہو گے ؟ "

" ہاسٹل میں ۔ " دبی آواز میں میں نے کہا ۔

" تب تو ٹھیک ہے " کلثوم جیسے میرے جواب پر اسی طرح مطمئن ہو گئی جس طرح وہ ہونا چاہتی تھی میں بہت رک رک کر وہ ٹھنڈا مشروب پی رہا تھا ۔ تاکہ وہ

یہاں سے نکلنے میں عجلت نہ کرے اور مجھے موزوں ترین لہجہ اور الفاظ مل جائیں فرزی کے تعلق سے کچھ پوچھنے کے لیے اور ساتھ ہی اس وصال سے نکھرے چہرے کو دیکھتے رہنے کا کچھ اور وقت بھی ملے۔

اچانک وہ اس طرح ہنس پڑی جیسے اس کے کسی خیال نے اسے گُدگُدا دیا ہے اس نے مجھ سے پوچھا "کیسی لگیں تم کو ولی میڈم۔ بڑی ہی مہربان قسم کی ہیں نا؟"

میں چونکا بھی اور سنبھل بھی گیا اور کہہ دیا "ہاں"۔ پھر اسی طرح ہنستے ہوئے کلثوم نے کہا۔ "بہت ساری خوبیوں کی مالک ہیں ولی میڈم۔ ہیں نا؟"

اس کی نظروں میں، اس کی ہلکی سی مسکراہٹ میں مجھے ہلکی سی شرارت کا گمان ہوا۔ تب کچھ میری بھی ہمت بڑھی۔ میں نے کہا۔ "یہ بالکل سچ ہے، بالکل سچ۔ لیکن لیکن ...."

"لیکن کیا؟" وہ میری طرف کچھ جھک آئی، جیسے فوراً کچھ سننا چاہتی ہے مجھ سے۔ میں نے دانستہ طور پر اپنا لہجہ کچھ بدل کر کہا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔" وہ اور آگے جھک آئی اور کچھ کمزور لہجے میں پوچھا۔ "بتاؤ نا کیا کہہ رہے تھے۔؟"

میں نے اس کے لہجے کی ہلکی سی بناوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی تو نہیں ..... میں دراصل یہ کہنے والا تھا کہ وہ ہے نا میرا دوست فرزی ...."

فرزی کا نام سن کر وہ پھر اپنی کرسی پر ٹھیک سے بیٹھ گئی اور کہا۔ "اوہ، وہ فرزی"؟ تو میں نے تیزی سے کہہ دیا۔ "چار دن ہو گئے وہ ہاسٹل نہیں آیا۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ کہیں نظر آیا وہ تم کو۔؟"

اس نے اپنی گلاس میں آئس کو زیادہ گھولتے ہوئے کہا۔ "فرزی نا؟"

"ہاں فرزی۔"

"ہاں ملا تھا مجھ سے وہ، قریب دو ہفتے ہو گئے۔"

"دو ہفتے!!" پوری کوشش کے باوجود میں اپنے لہجے کو ہلکی سی چیخ بننے سے روک نہیں سکا۔ اب میری توجہ زیادہ تر میری اندرونی کیفیت پر تھی جو اچانک بدل گئی تھی۔ اور میں اب کلثوم کی باتوں کو کچھ کم توجہ سے سن رہا تھا جو کہہ رہی تھی۔

" ارے کیا دھرا ہے تمہارے فرزی میں ؟ ہیں ؟ بتاؤ۔ کیا رکھا ہے اس میں ؟
یکلخت اس نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ میں پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا وہ اپنے گلاس کو ذرا پرے ہٹا کر کچھ میری طرف جھک آئی اور بولی۔

لگتا ہے تمہارا فرزی تو کسی پنساری کی پانچ پڑیوں پر جیتا ہے۔ وہ تو کسی فقیر کے دیے ہوئے کالے دھاگو ا ۔ سے بندھا ہوا ہے۔" کلثوم یہ کہتے ہوئے برابر مسکرا رہی تھی اور مجھے دیکھ رہی

مجھے کلثوم کی یہ ساری با ۔یں اچھی تو نہیں لگ رہی تھیں، لیکن یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہی ہے۔ تب اس نے اچانک اپنا خالی گلاس اٹھایا اور کہا۔"اُف، اس سرسبز اور ٹھنڈے Hide - out میں بھی پیاس نہیں بجھتی، چلو اور ایک ایک گلاس ہو جائے۔ اس نے بیرے کو آواز دی اور بیرے سے کہا۔" دیکھو، دو اور۔ مگر بہت سا آئس ڈالنا۔"

میں نے کہا۔" نہیں، ڈرنک میرے لیے کافی ہے۔ میں نے بیرے سے کہا۔
" دیکھو ایک ہی لانا۔"

کلثوم غرانے کے انداز میں بول پڑی۔" ارے چھوڑو۔ پیو نا۔ میری بات بری لگتی ہے کیا۔؟ پھر بیرے سے بولی۔" جاؤ لے آؤ دو۔ پھر مجھ سے کہا" ارے یار۔ یہ فرزی تمہارا بڑا اقدیم آدمی لگتا ہے۔ کیا Stone age کے لوگ آج بھی رہتے ہیں دنیا میں۔؟"

میں نے فوراً کہہ دیا۔" ہاں۔ Very original "

وہ بیساختہ ہنس پڑی۔ اس کی بیساختہ ہنسی مجھے اکثر عجیب و غریب خیالات کا سامنا کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ مجھ پر جیسے باضابطہ ایک عذاب نازل ہو جاتا تھا۔ وہ اس قدر کھلے اور واضح انداز میں بے باک ہو جاتی تھی لگتا تھا اس بیساختگی کے ساتھ وہ مجھ پر جھپٹ پڑی ہے، مجھ سے لپٹ گئی ہے، اور۔ اور پتہ نہیں کیا محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس کے اس سارے انداز سے یہ یقین بھی ہو رہا تھا کہ وہ ساری باتیں جو کلثوم کہہ رہی تھی وہ اس کے دل کی آواز نہیں تھیں۔

بیرا ڈرنکس رکھ گیا تھا۔ ہم پھر ڈرنکس پی رہے تھے۔ ہنسی کی بیساختگی ... اس

کے رخساروں پر ہلکی سی روشنی پیدا کر دی تھی جس کو دیکھ کر میں یہ سوچنے لگ گیا تھا کہ فرزی اور کلثوم نے طئے کر لیا ہے کہ فوراً وہ مجھے کوئی بات نہیں بتائیں گے اور مجھے کچھ ایسی ہی غیر یقینی کیفیت میں رکھیں گے۔ کلثوم پھر کہنے لگی، لیکن اس کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔

" دیکھو یار۔ وہ جو ایک جنگلی پرندہ ہوتا ہے نا جو سدا پی ہُو، پی ہُو کی رٹ لگائے رہتا ہے، شہر میں ایسے پرندے کیسے پنپ سکتے ہیں۔ واہ ری رٹ۔ پی ہُو، پی ہُو، کب تک۔ جنگلی ہے نا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچھ عجیب انداز سے پورا گلاس ٹانچ گئی۔ اس پر بھی جیسے اس کی پیاس بجھی نہیں۔ گلاس میں بچی ہوئی برف کی ایک ڈلی لے کر اس نے اپنی پلکوں پر رکھ لی جیسے اس کی آنکھیں جل رہی ہوں اور وہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچانا چاہتی ہے۔ تب آنکھیں کھول کر اس نے اوپر اونچے پیڑوں کی طرف دیکھا۔ اس کی پلکوں کی اَنی پر ہلکی ہلکی چمک آگئی، شبنم کی ننھی ننھی بوندوں جیسی۔ مجھے یقین تھا وہ برف کی نمی ہے لیکن جانے کیوں یہ گمان بھی ہوا تھا کہ کہیں وہ آنسوؤں کی نمی نہ ہو۔ میں کوئی یقین نہیں کر پایا۔ اس کی کہی ہوئی باتوں پر بس ایسے ہی کسی خیال نے یا احساس نے بتا دیا کہ صرف شکوک ہی شکوک تھے میرے پاس۔ میں یہ طئے نہیں کر پایا تھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔

کلثوم اچانک اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جب ہم اس کیوبیکل سے نکل رہے تھے اس نے بلا جھجھک مجھ سے کہا۔ "پیارے"۔ اس اندازِ تخاطب پر تو میرے ذہن سے زیادہ میرے پیروں کو قوت بخشنے والا خون جیسے سفید ہو گیا اور کسی جگہ تھم گیا۔ اس نے کہا۔ " میں زندگی میں پہلی بار تم سے اس طرح مخاطب ہو رہی ہوں، صرف اس لیے کہ کم از کم اس لمحے تم زندہ رہو۔ پیارے تم سچ سچ بتاؤ کیا واقعی تمہارا کوئی یقین تم کو سکون کی نیند سونے دے گا؟ یا یہ بات بتاؤ کہ کیا تمہارے سارے شکوک تم کو تمہاری نیند سے محروم کر دیں گے۔ اونہہ، یہ سب بکواس ہے، بکواس ہے ..... چلو ......"

میں اس کے ساتھ بڑے ہی غیر مستحکم قدموں سے چلتا ہوا مِلک بار سے باہر آیا وہ کچھ مجھ سے آگے بڑھ گئی تو اس کی پیٹھ اور اس کے شانوں پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے

سوچا کہ یہ کتنی مضبوط ہے۔ ثابت ہے، جس کو یہ پورا علم ہے، یقین ہے کہ اس کا کردار ٹوٹ چکا ہے اور کہیں کوئی امید نہیں کہ وہ پھر سے بن سکے‘ تعمیر ہو سکے۔ لیکن اچانک نیم کی کڑواہٹ جیسا اور ببول کے کانٹے جیسا ایک خیال بھی آیا اور چلا گیا۔ "کہ کون جانے ہر کردار ایسا ہی ریپیر Repair کیا ہوا نہیں ہوتا۔ اُف یہ کردار کا تصور ہی کس قدر بہروپ قسم کا ہے۔ آج کچھ، کل کچھ۔"

اچانک کلثوم کی دلفریب آواز میرے ان خیالوں کی آواز بن گئی اور میں سننے لگا کہ زندگی آج تک کوئی حقیقت بن پائی نہ کوئی مستحکم کردار۔ یہ سب کچھ ایک تصور ہی تصور ہے جو آدمی کی زندگی کے ڈھکے چھپے واقعات و حادثات کو کسی بھی زبان کے خوبصورت الفاظ میں چھپا کر محفوظ کر دیتا ہے اور اس کو ایک ثابت کردار بنائے رکھتا ہے۔ اور کیا چاہیے۔؟ اپنے علم اور اپنی نظر میں اپنا کردار اگر داغدار بھی لگتا ہے تو اس کو ہم اعلیٰ یا ثابت کردار بنائے رکھنے کے لیے بیسیوں مراعات اپنے آپ کو دے لیتے ہیں۔ دوسروں تک اگر ہمارا کردار داغدار بن کر بھی پہونچتا ہے تو ہوتا کیا ہے وہ تو یقین اور شکوک سے پُر نظروں میں معلّق لٹکا ہوتا ہے ایک مدّت تک۔ بس۔

باب (۴۳)

اپنے ان خیالات میں، میں ضرور کچھ کھوسا گیا تھا۔ مجھے اچانک محسوس ہوا تھا کہ سڑک پار کر کے اپنے کالج کی باؤنڈری کے اندر پہونچ چکا ہوں۔ مجھے یہ بھی خیال آیا تھا کہ کلثوم بھی بہت تیز تیز چلتی ہوئی کافی آگے نکل گئی تھی۔ لیکن یہ بھی یقین تھا کہ اس نے کہا تھا اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے "میں لیڈیز روم جا رہی ہوں۔ پھر کبھی ملیں گے۔ میں Contact کروں گی۔" اس وقت شاید کالج کے اندر میں نے اپنے آپ کو ایک پیڑ تلے اکیلا پایا تھا۔

میں ہاسٹل کی طرف چل پڑا۔ اس وقت مجھے شدید احساس تھا کہ کلثوم سے مل کر مجھے کچھ نہیں ملا تھا۔ میں خالی ہاتھ لوٹا تھا اور میرا ذہن زیادہ منتشر تھا۔ یہ احساس

اور بھی زیادہ شدید تھا کہ اس میں کلثوم کا کوئی قصور نہیں تھا، قصور تو میرا ہی تھا کہ کلثوم سے مل کر اس کے کھلے کھلے حسن سے اور اس کی بے باک گفتگو سے شاید میں بے حد مرعوب تھا اور اندر اندر اس بھیانک خیال سے لرزیدہ کہ کلثوم مجھ سے کوئی ایسا سچ ہی نہ کہہ دے کہ فرزی اس سے نہیں ملا تھا۔

میرے سامنے ہاسٹل تھا۔ اور ان سارے خیالات اور حالات کے باوجود سینے میں ایک امید کہ فرزی آگیا ہوگا۔ میں تیزی سے ہاسٹل میں داخل ہوگیا۔ سینے میں ایک جوالا لے کر فرزی نظر آجائے تو پہلے اسے سینے سے چمٹا لوں گا۔ اس کو سینے میں دھنسا لوں گا، میں اس کے سینے میں دھنس جاؤں گا۔ پھر اپنی پوری تشفی کی خاطر اس کے گالوں پر دو تھپڑ ماروں گا زوردار، اور چیخ کر کہوں گا۔ "آپ حرمزادے ہیں، آپ ذلیل ہیں، کمینے ہیں۔ ایک فریب کا جال، سب سے بڑا۔ ارے اپنی اس چترنگی، چلتّر باز کے جادو پر مرمٹا ہے اور وہ تجھ پر مرمٹی ہے تو یہ گھمنڈ کیوں؟۔ مردوں کی طرح بول کہ۔ ہاں۔"

سامنے میرے کمرے کا دروازہ تھا۔ اس پر تالا پڑا تھا۔ اچانک پھر وہی اندھیرا چھا گیا۔ میرے دماغ میں۔ وہ اندھیرا جو چھٹتا ہی نہیں تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ اندر کمرے میں بھی وہی اندھیرا تھا۔ فرزی نہیں آیا۔ اس لمحے میرے ذہن کے اندھیرے میں اچانک ایک یقین ایک بھیانک شکل بن کر ابھر آیا کہ "فرزی نہیں آئے گا۔" میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ میں خود ایک انتہائی بھیانک شکل بن کر اپنے سامنے آؤں اور اپنے آپ سے کہوں کہ "فرزی نہیں آئے گا۔" پتہ نہیں میں آج کیوں اپنا ہی دشمن بن رہا تھا اور اندر اندر بڑے ہی صاف الفاظ میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ تمہارے اندر بھی تو یہ بات ایک یقین بن رہی ہے کہ "فرزی نہیں آئے گا۔ آخر آج صبح سے کلثوم نے کس کس انداز سے یہ بات نہیں سمجھادی تھی تم کو کہ فرزی اس سے نہیں ملا تھا۔ فرزی نے اس کے ہر سچے جذبے کو جھوٹ کہا تھا۔ اس کے ہر خواب کی، ہر خیال کی، ہر جذبے کی تذلیل کی تھی۔ وہ کس طرح ملنے جائے گا اس سے اس کے گھر۔ کس طرح سمجھ رہے تھے تم کہ کلثوم نے جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ تھا۔ اس نے تو دو گلاس برف پیا تھا آج مِلک بار میں، اور اپنی جلتی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے

برف کی ایک ڈلی رکھ لی تھی اپنی پلکوں پر اور تم نے پورے یقین کے ساتھ سوچا تھا کہ اس کی پلکوں پر چمکتی ہوئی شبنمی ٹھنڈک برف کی ٹھنڈک ہے، لیکن تمہارے اس یقین کو تمہارے ہی اس گمان نے بری طرح زمین پر پٹخ دیا تھا، چاروں خانے چت کہ وہ برف کی چمک نہیں تھی، وہ تو تیزی سے نکل پڑنے والے آنسوؤں کی چمک تھی۔"

"فرزی نہیں آئے گا۔" اب یہی یقین میرے اندر کی ساری دھرتی کو خاکستر کرتا ہوا ایک شعلہ فشاں لاوہ بن کر ہر طرف بہہ رہا تھا۔

اُس آدھی رات کے اندھیروں میں کس آسانی سے اور کس سُبک اور سرل انداز میں وہ مجھ سے جدا ہو گیا تھا ایک گمان کی طرح ہلکا سا اندھیرا بن کر۔ وہ تو جیسے کبھی میری زندگی میں آیا بھی تھا تو صرف ویسے ہی اندھیرے کا ایک غبار بن کر۔ میرے ساتھ بھی رہا تھا تو جیسے وہی اندھیرے کا ایک غبار بن کر۔ اور اس رات کے اندھیروں میں غائب ہو گیا تھا تو وہی غبار بن کر، جسے نہ چھو سکوں، نہ دیکھ سکوں۔ وہ میری دھرتی پر آیا بھی تھا تو شاید اس سمت سے جہاں نہ کبھی کوئی سورج طلوع ہوا تھا نہ کوئی چاند ڈوبا تھا۔ وہ دھرتی کی کوکھ سے اٹھنے والے اندھیرے کا ایک غبار بن کر اس سمت سے اٹھا تھا اور ساری فضائے بسیط سے بے نام و نشان گزر گیا تھا اور اس افق تک پہونچ گیا تھا جہاں کبھی کوئی رنگ ہی نظر آیا ہو گا نہ کوئی سرخی یا سپیدی۔ لیکن یقین ہے کہ اس افق کے اَسرار میں اِس دھرتی کے رنگ و نور سے زیادہ وجاہت ہو گی، وقار ہو گا اور زندگی کی عظمتوں کا مقام ہو گا۔ اس رات کا اندھیرا بن کر وہ اس بے رنگ و نور افق کی دوسری طرف، اس کے ڈھلانوں سے اتر گیا ہو گا، جن کی اتاہ گہرائیوں کا عکس شاید یہ آسمان کی بلندیاں ہوں۔

پتہ نہیں اس شام، جو فرزی نے کلثوم کے ساتھ گزاری تھی کلثوم کی کوٹھی پر، بے خوف تنہائیوں میں، کیا کچھ ہوا تھا اور کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ کیسے جانیں کہ کلثوم نے کس کمالِ دلبری و دلربائی سے اپنے غاصب و بے رحم حسن کو پُرنم بنا کر مِنت و سماجت کی تھی فرزی سے اور ایک لذّت افزا لگن و لگاوٹ سے فرزی کے ایک ایک زخم کو گِنا تھا، اور ان پر اپنے ہونٹوں کی سرخیوں کا مرہم لگانے کی کوشش کی تھی۔ کیسے جانیں کہ اپنی ان بے خبر نزاکتوں سے اس نے فرزی کے زخموں کو ٹھنڈک

پہنچائی تھی یا ان کو دھکا دیا تھا۔اس نے تو فرزی کے حضور سرنگوں ہو کر اپنے ہی زخمی ضمیر کی دوزخ کی آگ سے نجات مانگی تھی یہ کہتے ہوئے کہ "فرزی تم میری نجات ہو۔" قیامت تو جیسے دو گھڑی کی بھی ہوتی ہے، ان دو گھڑیوں میں اس قیامت کی زد میں آکر فرزی کس طرح اُکھڑ گیا تھا، اپنی بنیادوں سے، اپنی اصلیتوں سے۔لیکن شاید اس سے بڑی قیامت یہ تھی کہ وہ سنبھل بھی گیا تھا اور اس طرح اس نے ایک جہنم کو بھڑکا دیا تھا، کلثوم کے اندر، اور آہستہ سے اس جہنم کا دروازہ بند کر کے نکل گیا تھا وہاں سے، کلثوم کو اس آگ میں جلتا جھلستا چھوڑ کر۔

اب کون راہ نجات مل پاتی کلثوم کو، نہیں فرزی کو، جو کلثوم کو ایک جہنم دے کر، خود کئی ایسی جہنموں کے شعلوں میں گھر گیا تھا، جو آسمانوں کو بھی پناہ مانگنے پر مجبور کرتے تھے۔

اس پہاڑی سے اتر کر وہ میرے پاس ہاسٹل تو آگیا تھا۔اپنی زبان پر آنے والے جلتے بجھتے الفاظ میں۔اس شام کی ایک داستان تو سنا دی تھی۔لیکن اس نے کتنی شراب پی تھی اور کس تیزی سے؟ اس کے بعد تو جیسے واقعی وہ ابدی نیند سو گیا تھا۔

کسی حسنِ عالم تاب نے ایک طلسمِ لازوال بن جانے کی ہَوس میں، خیر و شر کے کھنڈر جیسے تصور سے نکل کر فرزی جیسی عظیم صداقت کو اپنا زہر پلا دیا تھا۔لیکن جس زخمی ناگن نے اس کو وہ زہر پلایا تھا اس نے پتھروں اور چٹانوں پر خود اپنے سر کو پٹخ پٹخ کر لہولہان کر لیا تھا جب کہ دوسری طرف فرزی اپنے اندر کی چیختی چلّاتی خاموشیوں کو لے کر اپنی یادوں کی بھولی بسری شاہراہوں پر نکل آیا تھا، ایک ایسا جنون بن کر جس کا عروج بھی زوال ہو اور زوال بھی زوال۔کس نے دیکھا ہے اس جنونِ لازوال کو؟ کس نے سنا ہے ان چیختے چلّاتے زخموں کو۔تپتے سورج اور تپتی دھرتی کے بیچوں بیچ۔

میرے ان خیالات کے طوفان کے ساتھ، اچانک ایک ایسا لمحہ بھی آگیا جس نے مجھے میری اس کیفیت سے چونکا دیا۔میں نے اس لمحے کی ترغیب پر سوچا تھا کہ میں آخر کیوں اپنے وحشت بھرے وجود کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہا ہوں آج۔؟ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ آخر ہوا کیا ہے جو میں آج اپنے کمرے کی خاموشیوں میں اتنی ساری چیخ و پکار

سن رہا ہوں ۔ میں اپنے آپ پر جتنا جبر کر سکتا تھا، میں نے کیا۔ میں نے صبر و تحمّل جیسے باوقار الفاظ کے سارے معنوں کو اپنے ذہن و دل میں راہ دے دی ۔ اور اب اپنی بھیگی بھیگی پیشانی کو اپنے رومال سے صاف کیا ہے ۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر خاصی روشنی تھی ۔ کمرے کی کھڑکی کے مقابل والے پُر شکوہ مکان کا وہ خوش رنگ چمن تھا ۔ اور رنگین پردوں والا ورانڈہ تھا ۔ اب وہاں وہ دوشیزہ تو موجود نہیں تھی لیکن اس سے زیادہ دلفریب اس کا تصوّر لگتا تھا اس وقت ۔ وہی منظر جو میں نے دیکھا تھا جب میں نے پہلی بار ہاسٹل میں قدم رکھا تھا ۔ اس کمرے میں اپنے آپ کو پایا تھا ۔ اور اپنے بکھرے بکھرے خیالات کے ساتھ اس ورانڈے پر اُچٹتی سی نظر ڈالی تھی تو اس دوشیزہ نے کس ادائے خاص سے فرش پر گرا ہوا ایک پھول اٹھالیا تھا اور پھول اٹھاتے ہوئے اپنے چہرے پر آجانے والی زلفوں کو سنوار لیا تھا اور یوں دیکھا تھا میری کھڑکی کی طرف جیسے اس کمرے سے وابستہ اس کی کوئی پچھلی یاد بن کر میں اس کے سامنے آگیا ہوں ۔ ان سارے واقعات کا میں آج ممنون تھا کہ مجھے آج میرے کمرے کی خاموشیوں میں گونج جانے والی وحشتوں سے انھوں نے مجھے دَم بھر کے لیے نجات دلائی تھی ۔

شاید یہی تو بات تھی کہ اس لمحے مَیں نے اچانک اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پُھلکا محسوس کیا ۔ باتھ روم جاکر نہایا، سیٹیاں بجا بجا کر ۔ باتھ روم سے لَوٹنے کے بعد یہ بھی سوچنے لگ گیا کہ آخر فرزی کے چلے جانے کے بعد مجھے یہ ساری فکر، یہ ساری سوچ کس نے دے دی ہے ۔ میں تو ہلکی پھلکی خوشیوں کا دیوانہ تھا، ہلکے پھلکے غم کی لذتوں کا مارا، اپنے وقت پر آنے جانے والے شب و روز کا سدھایا ہوا کہ جو اچھا لگے وہ کام کرو ۔ اچھا نہ لگے نہ کرو ۔ لذّت ملے تو دیوانے ہو جاؤ، کڑواہٹ ملے تو منہ موڑ لو ۔ کس نے ڈال دیا ہے تمہارے ہلکے پھلکے دل و دماغ پر اتنا بوجھ کہ جینے کو ایک ذمّہ داری سمجھو اور جینا ایک بوجھ لگے بھی تو جیو ۔ سچ تو یہ ہے کہ فطرت جو بھی سکھاتی ہے، وہی فطری زندگی ہوتی ہے ۔ یہ اتنی ساری اٹھا پٹک کیوں ۔ ؟ اتنی ساری ادھیڑ بن کیوں ؟ اپنی اس انسانیت نما سوچ کی بھیڑ میں تو شاید تم اس نتیجے پر پہونچ رہے ہو کہ کالج کی زندگی ہی، زندگی کا آخری پڑاؤ ہے اور یہ کیسے یقین کر لیا تم نے کہ فرزی نہیں آئے گا ۔ ؟ اس ہزاروں اَسرار و رموز سے بنی زندگی کی راہ و رفتار سے تم کتنا واقف ہو ۔ ؟ وہ تو اپنے

ذہن کی نارسائی کو ایک راز بنا کر اپنے آپ کو معتبر بنائے رکھنے کے لیے انسان نے اپنی سہولت کے لیے زندگی کو کچھ نام دیے ہیں، کچھ کام دیے ہیں۔ مایوسی نہ زندگی کا پہلا نام ہے نہ آخری۔ اس انجانی راہِ حیات پر چلتے ہوئے تو تم کو کسی جگہ بھی، کسی لمحے بھی، نہ صرف فرزی ہی مل جائے گا بلکہ تمہاری سمی بھی تو تمہاری ہی زندگی جیسا ایک انتظار ہے۔ اس راہ پر تو کہیں بھی کسی وقت بھی یہاں وہاں کچھ بھی، ہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ رہے نہ اس بات پر یقین، موہوم ہی سہی۔ ارے یہ کتابوں کے حساب کتاب سے بنائے ہوئے، انسانیت، دوستی اور وفا کے اصول یا نرم خُو فطرت کے بنائے ہوئے اندازے، زندگی بن کر سامنے آنے والے ہوتے تو انسان شاید انسانیت پر زیادہ راغب ہوتا۔ لیکن یہاں کی یہ کمزور زندگی تو شاید اندیشوں پر زیادہ جیتی ہے اور امیدوں پر کم۔ چلو اٹھو اور اُٹھ کر شام کا کوئی اہتمام کرو۔"

میں نے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میرا چہرہ مجھے اچھا لگا، لیکن ایکبار ایسا بھی لگا کہ وہ چہرہ مجھ سے کہہ رہا ہے۔" دیکھو۔ تم اس وقت جن جن الفاظ میں اپنے آپ کو تسلیاں دے رہے ہو، دلاسے دے رہے ہو، وہی الفاظ خون چوسنے والے کیڑے بن کر دھیرے دھیرے تمہارے زخموں کو نوچتے رہیں گے۔ سدا۔

اس خیال کے باوجود میں نے شام ہونے ہونے تک اپنی دلجوئی کی خاطر یا اپنے ان خیالات سے فرار کی خاطر یہ طئے کر لیا کہ آج مجھے شراب پینی چاہیے اور زیادہ اچھا یہ لگا کہ اس شام میں ولی میڈم کے ہاں چلا جاؤں۔

باب (۴۴)

چار مہینے گزر گئے۔ فرزی نہیں آیا۔ ان چار مہینوں میں سیاسی انقلاب آیا بھی اور شہر میں براجمان بھی ہو گیا۔ کالج کھلے بھی اور بند بھی ہو گئے۔ امتحانات ہو گئے اور نتائج بھی نکل گئے ہاسٹل بھی بند ہو گئے۔ لیکن فرزی نہیں آیا۔

فادر فریرا نے اپنے پیار و خلوص کو مجھ پر پوری طرح لاد دیا تھا۔ شہر کی ایک خوبصورت اسٹریٹ پر بنے ہوئے ایک پُر شکوہ چرچ کے قریب کے علاقے میں میرے

رہنے سہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے ہر اس شخص کو جس کا ہاسٹل سے تعلق تھا، یا جو فرزی کو جانتا تھا، اس مقام کا پتہ نوٹ کروا دیا تھا جہاں میں اب رہنے لگا تھا اور ان سے التجا کی تھی کہ کبھی کسی لمحے فرزی آجائے تو میرا پتہ بتا دینا۔

ولی میڈم لنڈن یونیورسٹی کے آفر پر لندن جا چکی تھیں، اپنے کولرج کے پاس۔ میرے لیے پتہ نہیں کیسے میڈم نے اپنے اثر و رسوخ سے میرے ہی کالج میں ایک عارضی کام کا انتظام کر دیا تھا۔ میری کتنی ہی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے میڈم نے لندن سے بے حساب تحائف بھیجے تھے میرے پاس۔ ایک بڑا ہی طویل خط بھی لکھا تھا مجھے، جس کے ہر لفظ میں ایک ہی بات پر اصرار تھا کہ میں لندن آجاؤں اور کسی بھی لمحے یہاں سے کوچ کرنے کے لیے تیار رہوں۔ مجھے لکھا تھا .... "ضرور آجانا۔ سارے یورپ کے حسین ترین گلی کوچوں سے اور ان کے زود اثر اَسرار سے تم کو متعارف کراؤں گی۔ یہاں کی خزاؤں سے بھی اور بہاروں سے بھی تم کو ملاؤں گی۔ تمہارے ساتھ شہر شہر، بستی بستی اور جنگل جنگل یعنی، اس جہانِ رنگ و بو میں جتنی بھی باغ و بہار قسم کی مزاج دار اور دل و جان سے ہمارے قریب آجانے والی وادیاں ہیں، ان ساری گلبدن قسم کی وادیوں کی سیر کراؤنگی۔ سارے زمستانی، تابستانی اور سارے برشگالی موسموں میں۔ ان معشوق نظر، معشوق صِفت وادیوں کے گلفشاں دامنوں میں جتنے بھی گل تر ہوتے ہیں ان کی مہک تو مہک وہاں کے کانٹوں کی چبھن بھی چھوئی موئی انداز میں گزر جانے والی شب ہجر کی ایک کسک ہوتی ہے اور وہ کسک حدیثِ دلبراں سناتی ہے، بس ایک گلگوں پیامِ دلبری کی ہلکی ہلکی ٹیس جیسی۔ بس یہاں آجانا۔ اپنے ماضی کی یاد کرو تو کرو لیکن اپنے حال اور مستقبل کی کبھی، کسی لمحے، کسی پل بھی، آنے والی صدیوں تک تم کوئی فکر نہ کرنا، جلدی آجانا"۔

اس خط کے پڑھنے کے بعد میری نظروں کے سامنے ہزار رنگ کے پھولوں سے لدی لدی، ایک نہیں کئی معشوق صفت وادیاں پھیل گئی تھیں میرا مستقبل بنی ہوئیں، جہاں کے پھولوں پر شبنم کی ٹھنڈک بھی ایک گرم گرم سا احساس ہوا کرتی ہے۔ جیسے وہاں کے ماہ و مہر اور ان کے نظام بھی انسان کے ہر احساس کو ایک نظامِ سرور و لذت بنائے رکھنے کی خاطر محوِ سفر ہیں۔ مجھے تو بس ایک ہی قدم بڑھانا ہے ادھر،

میرے ذہن کو ایک ہی موہوم سی جست لگانا ہے ادھر، پھر کیا ہے ۔ ایک ہلکا ہلکا سُرور بنے ہوئے جذبہ و احساس، اور ان سے ہو کر گزرنے والے شب و روز، بدلے بدلے پیمانوں کی بدلی بدلی عنایتیں ۔ بدلے بدلے لطف و کرم ۔ آہستہ خرام حسن و شباب قربتوں کی کھوج میں ۔ رنگ و خیال جیسے نازک نازک جسم، عریانیوں کے بندھے بندھے تصوّر کی گرہیں کھولتے ہوئے، جیسے دیوارِ شفقت شق ہو گئی ہے اور ہزار راہیں کُھل گئی ہیں، ساری زمینی لذتوں کی بلندیوں تک پہونچ جانے کے لیے ۔ ہواؤں میں تیر جانے والی آزادیاں ۔ نیلے آسمانوں کو چھو جانے والی آزادیاں ۔ پھر وہاں دل کو مِل جانے والے محفوظ و مامون آشیانے ۔ باہر جھانکو تو بہاریں ہی بہاریں، اندر جھانکو تو سُرور آگیں خواب ہی خواب ۔ اور یہ سب کچھ کوئی گمان نہیں، ایک یقین ہے ۔ کوئی تصوّر نہیں، نظروں کے سامنے گزرتی ہوئی زندگی ہے ۔ اور میں دلدادۂ شوق و شغب پل پل وہ زندگی گزار رہا ہوں ۔ بس ایک قدم، ایک جست ادھر لیکن ...... لیکن ...... یہ سب کچھ کیا ہے ؟ یہ بھی تو کوئی گمان نہیں لگتا ۔ یہ سب کچھ بھی تو ایک ٹھوس حقیقت ہی ہے کہ میرا سارا وجود ۔ میرا اپنا جسم جیسے کسی صاف ستھری مٹی سے بنا ہوا نہیں ہے ۔ یہ سارا وجود تو جیسے دلدل ہے، کیچڑ ہے جس میں زندگی کے بے حساب سڑے گلے، فرسودہ تصورات پھنسے پھنسے ہیں، دھنسے دھنسے ہیں ۔ جن میں وہم و خوف کے کتنے ہی کیڑے رینگ رہے ہیں یا کسی قدیم دور کے کھنڈرات کی بدبو دار مٹی میں پائے جانے والے کیڑوں جیسے یقین ہیں، خیال ہیں، جو بے جان تو لگتے ہیں، لیکن رینگتے نظر آتے ہیں ۔ یہ کیسے کیسے اندیشے ہیں، خوف ہیں، یہ دیانتِ دل، دیانتِ ذہن دیانتِ احساس ۔ یہ وفا، یہ جفا جیسے گھسے پٹے تصورات ۔ یہ ضمیر جس کا کوئی وجود نہ ہونے پر بھی اپنی بھیانک بد شکلی کو بار بار کسی گہرے سرد غار کے اندھیروں میں اُڑنے والے چمگادڑوں کی شکل میں پیش کرتا ہے ۔ اور میری نظروں کے سامنے بار بار ایسے منظر آتے ہیں ۔ میں نے کونسا جرم کیا ہے، جس کی پاداش میں میرے اپنے احساسات، خیالات، میرے سارے وجود کو سرد سرد لوہے کی کڑیوں میں جکڑے رہتے ہیں، نہ ہاتھ پھیلا سکوں نہ پاؤں بڑھا سکوں ۔ آخر یہ ساری اذیتیں کیوں اور کس لیے مجھے دی جا رہی ہیں ۔ فرزی نہیں آیا ٹھیک ہے وہ نہیں آئے گا ۔ یہ اس کی رَوِش

ہے ۔ یہ یقین بھی اب اچھا لگتا ہے کہ سمی اب میرے لیے گزرے وقتوں کے ویرانوں میں بھٹکتی ہوئی ایک پرچھائیں ہے ۔ کلثوم سے بھی بھلا میرا کیا تعلق ؟ کچھ بھی تو نہیں ۔ زندگی کا ایک بھٹکا ہوا تصور ۔ میں کس سے وفا کروں ، کس سے جفا کروں ۔ میں تو آزاد ہوں ہر طرح ۔ میں تو شفق کی شق ہونے والی سرخ سرخ دیوار سے گزر کر ان ساری نیلی نیلی ، اودی اودی ، ہر رنگ میں رنگی ہوئی آزادیوں تک پہونچ سکتا ہوں اور زندگی کو ایک سبک سار سفر بنا سکتا ہوں ۔ لیکن .... لیکن یہی تو وہ خیال ہے ، احساس ہے ، یقین ہے جو میرے ذہن کے ایک نامعلوم گوشے سے نکلتا ہے ، میرے دل کی دھڑکنوں تک اُترتا ہے پھر ہر طرف ایک زہریلی بے حسی بن کر پھیل جاتا ہے ، ہر رگ وپے سے گزرتا ہے ، جیسے کوئی سانپ ۔ سنپولا ۔ لگتا ہے کوئی شئے میرے حلق تک آکر رک جاتی ہے ، سانسوں کو راستہ نہیں دیتی ۔ اور دو پل بعد واپس پھر اندر اُتر جاتی ہے ۔ پھر میں بڑی ہی آسانی سے سوچتا ہوں ۔ یہ تو صرف وسوسے ہیں ، وہم ہیں ۔ آتے جاتے خیال ہیں ، ڈوبتے تیرتے احساس ہیں ، ڈوبتے ہیں تو بھاری لگتے ہیں ، تیرتے ہیں تو ہلکے ہلکے ۔ ارے چھوڑو ، کہاں کے یہ وسوسے ، کہاں کے یہ خیال و وہم ، ذرا سر اٹھا کر کھلی فضاؤں کی طرف دیکھو ۔ محسوس ہوجائے گا کہ یہ سب ایک ہوا کے جھونکے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں ۔ کچھ نہیں ۔

ان ہی کیفیتوں میں دن گزر رہے تھے ۔ فادر فیریرا سے ملاقاتیں ہوجاتی تھیں کبھی کبھی اس گلڈا والے ہوٹل میں ایک آدھ اچھی شام بھی گزر جاتی تھی ۔

ایک شام یونہی اکیلا پہونچ گیا اس ہوٹل کو ، اس توقع میں کہ شاید فادر خود ہی آجائیں ۔ معلوم ہوا کہ آج گلڈا نہیں آئے گی ۔ ان دنوں پیسے کی کمی نہیں تھی ۔ میں اپنی نشست پر بیٹھا ڈانس ہال کی طرف نظریں جمایا ہوا تھا ۔ اچانک مجھے وہاں کلثوم نظر آگئی ۔ کلثوم ......! مجھے ایسا لگا تھا کہ میرے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی ہے ۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور ، اور تیزی سے میری طرف اس طرح آئی جیسے اس کو میری ہی تلاش تھی ۔ قریب آتے ہوئے وہ چیخ پڑی ۔ " Here is the Target " اور کچھ اس قدر میرے قریب آگئی جیسے مجھ سے لپٹ جانا چاہتی ہے ۔ شاید لپٹ بھی جاتی اگر میری طرف آنے والے بیرے پر اس کی نظر نہ پڑجاتی ۔ اس نے ایک عجیب کیفیت میں

میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، ایسا کرنے میں اس کے رخساروں پر جو ایک سرخی چمک اٹھی تھی وہ ایسی تھی جو شاید اس کے بدن کے ہر حصے سے اُٹھ آئی تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں، تمہارے ساتھ نہیں تو اور کس کے ساتھ بیٹھوں گی؟۔" وہ ہنس پڑی۔

میں نے کہا۔ "کیا پیو گی، چائے یا کچھ ٹھنڈا۔؟"

"نہ چائے نہ ٹھنڈا۔ بس شراب۔" اس نے اس طرح کہا جیسے بڑا ہی برجستہ جواب دیا ہو۔ اس نے ایک خاصہ دلفریب قہقہہ لگایا اور میری طرف جھک آئی۔ کہنے لگی

Ah, that drone of a chap – stone – age lover– that fussy pal of yours-a vanity Kid ....

آہ، یہ سب کچھ کہتے ہوئے ایسا لگ رہا ہے جیسے ہر لفظ کے ساتھ میرے دل کی دھک دھک مجھے جینے کا حوصلہ دے رہی ہے۔"

میں نے کچھ تیزی سے سوال کر دیا۔ "ایک بات میری بھی۔ کیا سچ مچ تم اب شراب پیو گی؟"

وہ ایسے زور سے ہنسی جیسے وہاں اس ہوٹل میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اور اپنا ہاتھ ٹیبل پر زور سے مار کر کہا۔ "ہاں شراب اور صرف شراب"

میرے گال کچھ اتنے تر و تازہ نہیں تھے کہ اس کی اس بات پر اس کے رخساروں جیسی تھوڑی سی سرخی ان پر آجاتی۔ اس نے پھر پُرزور لہجے میں کہا۔

"ہاں صرف شراب۔ اس لیے، اس لیے کہ تم کو معلوم ہے اس نے میرے گھر پر ایک شام گزاری تھی۔ اور مجھ اناڑی ساقن نے اسے چائے پلائی تھی۔ چائے پر چائے پلائی تھی اسے ..... سردی تھی نا ..... چائے تو بس گرم کر دیتی ہے جسم کو، جان کو نہیں۔ لیکن شراب تو اتنی دیر میں دس کام کر جاتی ہے۔ اس شام وہ میرے گھر سے زندہ تو نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا خون ہو ہی جاتا اس دن۔ اس نے کس کس نظر سے دیکھا تھا مجھے اس شام۔ شام کی نظر سے دیکھا تھا، رات کی نظر سے دیکھا تھا۔ میرے

گر پڑی ہے وہاں جہاں ہم بیٹھے ہیں اور میرا سارا وجود بھی دو حصّوں میں کٹ گیا ہے۔
اُف اس وقت میرے سامنے اس کا وہ نازک ہاتھ، کچھ سرخ سرخ، کچھ نیلاہٹ لیا ہوا، میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا جس میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ اس نے بھی میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہاتھ نے مجھے سنبھالا دیا۔ تب اس نے اپنے لہجے کو ایک چیخ بننے سے بچاتے ہوئے ایک سلجھے ہوئے لہجے میں کہا "دیکھو یہ بات بتائے دیتی ہوں، تم شاید اس وقت مجھ سے کچھ نہ کہہ سکو۔ ٹھیک ہے، کل تم میرے پاس آسکتے ہو، مجھ سے مل سکتے ہو، میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔ جانتے ہو، میرے بنگلے کا چوکیدار میرے حکم کا پابند ہے۔ میں اس سے تمہارا نام کہہ دوں گی۔ تم کسی وقت آسکتے ہو۔ ویسے میں ہر رات پتہ نہیں کیوں جاگ کر گزارتی ہوں اور ساری رات شراب پینے میں گزارتی ہوں۔ اس طرح صبح کر لیتی ہوں۔ بار بار یہی خیال آتا ہے کہ تمہارے اس فقیر و گداگر دوست کو اس شام چائے کیوں پلائی تھی میں نے، کاش ..... یہ بھی خیال آتا ہے کہ شاید وہ آجائے اور میں اس بار اسے چائے نہیں، شراب پلا دوں۔ اور وہ ...... وہ ...... بے وجہ یہی خیال ستاتا بھی ہے، پلاتا بھی ہے اور رات بھر جگاتا بھی ہے۔ ضرور آنا، میں تم سے ہر رات مل سکتی ہوں۔ ہاں، ہاں ...... اس شام جب وہ میرے بنگلے سے نکلا تھا وہ دوڑ پڑا تھا، پہاڑی کے ڈھلوانوں پر، اور تیزی سے اتر گیا تھا نیچے۔ پتہ نہیں کس اندھیرے میں۔ کس اندھیرے غار میں وہ اتر پڑا تھا۔ شاید اترتا ہی چلا گیا تھا اس غار کی تہوں میں، ہزار تہوں میں۔ بھلا کس رُخ سے کوئی روشنی پہونچتی ہوگی وہاں۔ لیکن وہ اتر گیا تھا وہاں، منوں ٹنوں مٹی کے نیچے ...."
کلثوم نے مجھے دیکھتے ہوئے ہوٹل کی چھت کی طرف دیکھا۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر زردی ہی زردی پھیل گئی ہے، اس زردی کے ساتھ اس کے چہرے کی اور اس کے شانوں کی ہڈیاں ابھر آئی ہیں۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک ہیں۔ وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہو گئی اور کہا "مجھے بہت جلدی ہے، ضرور آنا۔ ضرور آنا اور ایک ہی بار مجھ پر نظر ڈال کر وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ مجھ میں پتہ نہیں کوئی قوت کیوں نہیں تھی اس وقت۔ پھر بھی میں دو گھڑی میں اس کے پیچھے لپکا، اس کو چھوڑنے کے لیے۔ میں بھی تیزی سے ہوٹل کے باہر آگیا۔ لیکن پتہ نہیں کونسی ہوا اس کو اپنے ساتھ

اُڑا لے گئی تھی۔

سوچا واپس ہوٹل میں چلا جاؤں۔ اور خوب پیوں۔ پیتا رہوں۔ پیتا رہوں۔ شاید فادر آجائیں یا پھر کسی لمحے میرا دل مجھے یقین دلا دے۔ "تم تو زندہ ہو۔" میرے پیر میرے ٹھکانے کی طرف اُٹھ گئے۔

باب (۴۵)

اسُ پر شکوہ چرچ کے علاقے میں بنے میرے چھوٹے سے آشیانے میں، میں اس وقت بند تھا۔ شام سے زیادہ، رات قریب تھی۔ وہاں اس وقت میری نظر ادِھر اُدھر در و دیوار کو تک رہی تھی وہ در و دیوار مجھ سے مخاطب تھے۔ "فیصلہ کرو۔ جلد ہی فیصلہ کرو۔" ولی میڈم کا خط ایک طرف تھا جو زندگی کے ایک نئے انوکھے اور ایک دُلارے تصور کے ساتھ ساری دنیا کی رنگینیوں کی سیر کراتا تھا۔ لذتِ حسن و شراب و شباب کی بہاروں کی سیر کراتا تھا۔ اور دوسری طرف کلثوم تھی، خزاؤں کی ہواؤں کی زد میں، اُڑنے والا ایک برگِ زرد، جو دھیرے دھیرے ایک درد بن رہا تھا، شاید اس یقین کے بہکاؤں میں کہ ایک قابل اعتبار درد کی راہوں سے گزر کر ہی سچ فروغ پاتا ہے۔ اور شاید سچ کا وجود کسی نہ کسی درد ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔

لیکن اگر انسان سچے دل سے، سچے جذبے سے اور سچے ذہن سے مان لیتا ہے کہ زندگی تو ہے ہی ایک لفظ بے معنی تو پھر خود کو ایک لفظ با معنی بنا کر پیش کرنے کی خواہش و تمنا کہاں تک واجب و معتبر بنتی ہے۔ فرزی بھی اپنی آخری شکل میں ایک لفظ بے معنی اور کلثوم بھی لیکن۔ لیکن اتفاقاً ہی سہی، کل سمی بھی اگر ان ہی جیسا ایک درد بن کر سامنے آجائے تو کیا ہوگا۔ تب کیا سوچوں گا۔؟

شاید انسان کی فطرت کی تہوں میں، اس کی بنیادوں میں جکڑے ہوئے کچھ یقین، کچھ عقیدے ہوتے ہوں گے۔ فطرت کی سنگلاخ زمین میں بنائے ہوئے گھروندے، جن کے تحفظ کا دار و مدار صرف اسی ایک جذبے پر ہوتا ہوگا، جو انسانیت کے کچے درد کی پہلی شکل کو سدا پہلی شکل ہی بنائے رکھتا ہوگا۔ اب وہ درد کوئی غم

بنے، دکھ بنے یا کوئی مرض، زندگی کی ایک ایسی قوت اصل ہوتا ہوگا جس کے سامنے زندگی کا لمحہ، آخر اپنے وقت پر آئے یا وقت سے پہلے، بے وقعت بن جاتا ہوگا کہ انسان تو اسی ایک جذبے کی شکل میں انسان ہوتا ہے۔

ویسے لاکھ جذبے ہیں، عقیدے ہیں، قوتیں ہیں جو زندگی کے حسن و رنگ سے میسّر ہونے والی آسائشوں سے، آسانیوں سے اور ان سے ملنے والی سیرابیٔ حیات کی راہوں سے گزرنے کی ترغیب دیتی ہیں، ان کو سچ اور صداقت بنا کر پیش کرنے کے گُر سکھاتی ہیں، لیکن وہی ترغیب ایک سایہ ہوتی ہوگی، جو ساتھ ساتھ چلتی ہوگی اور لمحہ آخر پر اچانک کہہ دیتی ہوگی۔ "تم وہ ہو جس کا مَیں سایہ ہوں۔ مَیں وہ ہوں جس کا تم سایہ ہو۔ دیکھو تم بھی سایہ، مَیں بھی سایہ۔ تم بھی جھوٹ۔ مَیں بھی جھوٹ۔ اب آگے کچھ نہیں۔"

یہ خیال کچھ اس طرح در آیا میرے ذہن میں کہ میں خوفزدہ سا ہو گیا، گھڑی بھر کے لیے۔ لیکن میں اچانک جیسے ایک خواب سے جاگ گیا، جو میں کھلی آنکھوں اور بیدار ذہن کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا ہوں۔ "کیا میں یونہی ایک سائے کی طرح مرنے والا ہوں، جس کا سارا وجود ایک انتہائی زہریلا احساس بن کر میرا نرخرا دبوچ لے گا۔ یا پھر اس احساس جیسے بے شمار سانپوں کے بیچ میں دم توڑ دوں گا جن کا زہر ایسا ہی ہلاہل ہوتا ہوگا۔؟ لگا یہ سب کچھ تو زہریلے سانپوں کا بنایا ہوا ایک تاریک غار ہے، جس میں میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں اچانک اپنی پوری قوت لگا کر اس غار سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا اور میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

غار میں عجیب سیلن تھی۔ تعفن تھا اس زہر کا۔ اس غار میں ایک ایسی تاریکی تھی، گہری، بہت گہری، ایسی گہری جس کے مقابل سورج بھی آجائے تو شاید وہ بھی تاریک لگے۔ میں غار سے باہر تھا۔ سوچ رہا تھا شاید یہی تھا موت کا لامتناہی اندھیرا۔

کھلی ہوا میں، میں نے ایک بھرپور سانس لیا۔ اور دوڑ پڑا اس افق کی سمت جو میری نظروں کے سامنے روشن روشن تھا۔ میں سوچ رہا تھا، وہ سب کچھ جو میں اس غار میں چھوڑ آیا تھا وہ میرے ہی ذہن کا ایک سڑا گلا حصہ تھا، جو اب جھڑ چکا تھا۔ وہ تو صرف ایک بے معنی خوف تھا، ایک پرفریب وہم تھا جو کچھ اچھے، نیک، وفادار، ایماندار، سچّے

نہیں کتنے ہی غیر اصولی، یعنی تھوڑی ہی دیر چمک کر بجھ جانے والی خوبیوں والے انسان کا ایک چھلاوے جیسا تصور تھا۔ کتابی تصور انسان کا۔

اب اس افق کی روشنی میری نظر میں تھی۔ یہ عقل ہے، سوجھ بوجھ ہے زندہ رہنے کی قوت ہے۔ زندگی کا سچا شعور ہے۔ اس کا اصلی روپ ہے، زندگی کا رخِ زیبا ہے۔ عشق و محبت کی عارضی لذتیں اور بے معنی ایثار طلب کرنے والا کوئی گمان نہیں ہے، یہ تو زندگی کی سرشاری، اس کی لذتوں اور اس کے لطف و کرم کا یقین محکم ہے۔

چھوڑو، چھوڑو، وہ سارے کتابی علم کے بہکاوے۔ اچھا کردار بننے کی یہ ناپید ہوجانے والی تمنا۔ چھوڑو یہ ناپائیدار ہمدردیوں کے دکھاوے۔ یہ وفاؤں کے ڈھکوسلے۔ یہ مبہم تصور۔ زندگی کے اہم فیصلوں کے وقت نرم دلی، نیک نفسی، اصول پسندی، کسی فیصلے اور قصد کو اٹل یا مضبوط نہیں بننے دیتی۔ ان کے ساتھ چل کر تو انسان ایک مبہوت کر دینے والی قسم کی طمانیت حاصل کرتا ہے، جس کو وہ ایک بے لذت تہذیب کے تصور کی طرح صرف برداشت کر سکتا ہے اپنے کسی مفاد کی خاطر۔

یہ انسانیت کے جذبے، یہ سچ، یہ ایمانداری بس وہیں تک بھلے جہاں تک وہ ہماری ذات کو کسی مسرت یا منفعت سے محروم نہیں کرتے۔ کتابی علم سے زندگی نہیں بنتی، زندگی بنتی ہے اپنی فطرت کے سکھائے پڑھائے ہوئے علم سے۔ اس کے دیے ہوئے شعور سے۔

چلو، چلو آگے چلو، تم کو نہ فرزی ملے گا نہ کلثوم، لیکن .... لیکن .... فرزی نے ایسا کیوں نہیں سوچا۔ کلثوم نے ایسا کیوں نہیں سوچا۔ وہ دونوں کیوں کسی مری ہوئی آواز کی شکل میں ہم زبان ہوگئے۔؟

اگر آج میں زندگی کی ان جگمگاتی کامرانیوں کی طرف جو میرے سامنے ہیں، جو زندگی کی حسین راہوں پر میری منتظر ہیں، چل پڑوں تو میرے قدم کون روک سکتا ہے؟ میں زندگی کی کتنی ہی کامیابیوں سے اور کامرانیوں سے ہم کنار ہوجاؤں گا، اور ان ساری جگمگاتی راہوں سے ہوتے ہوئے کتنی روشن روشن منزلوں تک پہونچ

جاؤں گا اور شاید سچ مچ ایک بڑا آدمی بن جاؤں گا ۔ تونگری ، خوش حالی ، ناموری اور نیرنگیٔ حیات بھی تو ان راہوں کو آسان بنا دیتی ہیں جو انسانیت کی عظمتوں کے حصول کی سمتوں کو اپنا لیتی ہیں ، ورنہ بلندیِ کردار اور انسانیت سے عشق تو ان صحراؤں کی طرف لے جاتے ہیں جن سے گزرنے والے کے لیے شرط اول ہوتی ہے آبلہ پا ہونا کہ وہاں آبلوں کو خار کی حاجت نہیں ، بلکہ خار کو آبلوں کی حاجت ہوتی ہے ۔" اُف کتنی بے معنی باتیں ہیں ، یہ ساری جذباتی باتیں ۔ گئی نا آخر زندگی کی ساری فکر رائیگاں ۔

میں نے بڑے ہی پُر یقین انداز میں اور پورے ہوش و حواس کے ساتھ فیصلہ کر لیا کہ مجھے کہیں جانا نہیں ہے ، سوائے لندن کے ، میڈم کے پاس ۔ ٹھان لی کہ بہت ہی جلد میڈم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا اور صاف صاف لکھ دوں گا کہ میں کسی بھی لمحے یہاں سے کوچ کر سکتا ہوں ۔

سوچا فادر سے مل کر ان کو بھی اپنا فیصلہ سنانا ضروری ہے ، اچھا لگتا ہے ۔ فادر خوش ہو جائے گا ۔ لیکن پتہ نہیں ۔ پتہ نہیں ، کتنا بوڑھا ہو گیا ہے فادر ۔ ہو سکتا ہے اپنی چمکتی آنکھوں سے کچھ دیر وہ میری طرف دیکھتا رہے گا اور پھر شاید بنا یہ بتائے کہ وہ کچھ دلگیر ہو گیا ہے ، صاف آواز میں کہہ دے گا ۔

" Cheers my boy – cheers " اور اپنا گلاس اٹھا کر سارا گلاس ٹاپ لے گا ۔

کلثوم تو شاید اب روز ایک چراغ کی طرح سرِ شام ہی جل اُٹھے گی اور انتظار کرتی رہے گی ، میرا نہیں ، فرزی کا ، اس یقین کے ساتھ کہ میں نہیں آؤں گا اس کے پاس ۔ ایک نیم سوختہ حُسن ، پھر کسی جذبے کی ایک دھیمی دھیمی آنچ ۔ پھر دبی دبی چنگاریاں پھر راکھ ۔ اُف !

لیکن یہ فرزی ، ہاں فرزی ، تو ایک عجیب احساس بنا ہوا ہے ، بڑا ہی گہرا ، بڑا ہی عمیق ۔ ایک بڑا دکھ ۔ لیکن یہ میرا احساس ہے آج ۔ وقت کب اتنا حسّاس ہوتا ہے ۔ اس کو تو چارہ گر ہونا ہے ، زمانہ بھر جیسے درد و غم کا مداوا ۔ اس کا تو گہرے سے گہرا احساس بھی سکڑتے سکڑتے ایک داغ بن جاتا ہے ، پھر بس ایک یاد ۔ لیکن کب تک ؟

جب انسان کی آنکھیں اپنی روشنی کھونے لگیں تو وہ داغ بھی بہ مشکل نظر آتا ہے۔آدمی کی چھوٹی موٹی مصروفیتیں، چھوٹی موٹی ضرورتیں، سنبھلے سنبھلے چلنے کی کوششیں اس پر کائی بن کر چھا جاتی ہیں اور پھر یاد آنے والا بھی اور یاد کرنے والا بھی نقش بہ دیوار بن جاتے ہیں۔پھر وہ دیوار بھی ڈھ جاتی ہے، وقت کا کھنڈر بن جاتی ہے۔

میں نے طے کرلیا ہے کہ کل شام فادر سے ملوں گا۔جی چاہتا ہے کل ہی ملوں، پتہ نہیں کیسے فادر سے ملنے کی خواہش اتنی شدید ہوگئی ہے۔جیسے اس کا بوڑھا اور ضعیف وجود میرے ذہن و دل کو، میرے اس فیصلے پر کہ میں لندن جارہا ہوں، مجھے کچھ انعام دے گا۔کبھی کبھی اس کی ضعیف، بجھتی آنکھوں میں ایک عجیب سی مسکراہٹ نظر آجاتی ہے، جو تیزی سے اس کے چہرے پر، اس کے ہونٹوں پر روشنی بن کر پھیل جاتی ہے۔وہی شاید اس کا سارا وجود ہے جو سب سے کہتا ہے۔"ہم سب ایک ہیں۔ایک جیسے ہیں، ہم سب نیک ہیں، ہم سب بدکار ہیں۔ہم سب مجرم ہیں۔یہ جرم و گناہ انسان کی ایک ضرورت ہوتے ہیں۔زندگی میں کس کو کس جرم اور کس گناہ کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔"

مجھے پتہ نہیں کیوں یہ محسوس ہونے لگا کہ فادر آج میری ایک ضرورت ہے، دل بہلائی کی شکل میں، تفریح کی شکل میں یا پھر ایک سکون کی شکل میں۔

باب (۴۶)

دوسرے دن شام میں، میں اسی ہوٹل کو چلا گیا جہاں گلڈا کا طلسماتی حسن بنائے عیش و نشاط بن کر زندگی کے ہر رخ کو ایک نکھار دے دیا کرتا تھا۔میں نے فادر سے التجا کرلی تھی کہ آج شام وہ وہیں آجائیں۔وہ ضرور آئیں گے۔آخر فادر بھی تو جانے کس جذبے سے گلڈا کو ہزار نظروں سے دیکھتا ہے۔میں آج پتہ نہیں کس خیال سے بہت سارا پیسہ اپنی جیب میں ٹھونس لایا تھا۔شاید یہ سوچ کر آج فادر جتنا پیئے گا اس کو پلاؤں گا۔خود بھی جی بھر کے پیوں گا۔کچھ ایسی ہی تشنگی سی تھی، کل شام سے۔آج بھی میں اسی کیوبیکل میں بیٹھ گیا جہاں سے گلڈا کا روشن وجود بار بار

نظر کو روشنی بخش دیتا تھا۔ سوچتا تھا کہ اس طرح آخر کیوں اُٹھ جاتی ہے نظر کسی حسینہ کی طرف ۔ بنا کچھ سوچ سمجھے ۔ جیسے فطری اپج، جذبہ اول، جس سے خود فطرت مجبور اور جس پر روک لگانا شاید آسمانوں کے بھی بس میں نہیں ۔ یہ تو ہر ذرہ کائنات میں مچل جانے والی زندگی ہے، اس کا نظام ہے ۔ لیکن ہر طلعت زیبا کا کرم اسی ظلم کی شکل میں ۔ یہ نازک اندام وجود، زر شباب کے تاروں سے بنائے لباس میں عیاں عیاں اور غرور حسن و حیا کے مہین سے خیال جیسی ردا میں اپنے آپ کو محفوظ محفوظ محسوس کرنے کی خوش فہمی لیے ہوئے، پھر جیسے وہ خوش فہمی بھی گوارا نہیں کہ خم ابرو حکم لگاتا ہے کہ فنا ہو جاؤ، یہیں کہ اس فنا کے بعد بقا ہے ۔ جس کسی کے طائع روشن میں مرقوم ہوتے ہیں یہ الفاظ زرّیں، وہ تو وہیں فنا ہو جاتا ہے، زندگی پانے کے لالچ میں ۔ لیکن آخر کتنے ہیں ایسے بیش بہا وجود ہائے حسینان جہاں کہ وہ ایک مرد بد نظر، بد آئین و بد عنوان، ایک ہی اشتیاق سے ایک ہی جذبہ بے اختیار کے ساتھ دیکھتا ہے، ہر ماہ رُخ کو، ہر بدن خوش لحن کو، جو اپنی بے خبری میں کچھ نہ کچھ گنگناتا ہی چلا جاتا ہے ۔ اور یہ دیوانہ اس کے ہر بول کو ایک پیام حیات جان کر ہر ہر لمحہ اپنی جان سے جانے کو تیار ہو جاتا ہے تو پھر یہ خالی خولی، یہ بے اثر روک تھام، یہ تدارک بیجا، یہ سارا بندوبست کیا معنی؟ وہ بھی مانگے ہے تو جان جیسی شئے، جو ایک بار گئی تو پھر عشق کیا اور حسن کیا ....

کچھ ایسے ہی خیالات میں بہا جا رہا تھا میں فادر کے انتظار میں ۔ لیکن فادر نہیں آئے ۔ پھر بیرا آگیا۔ پہلی بار آج اس نے کچھ غیر کاروباری انداز میں بات کی ۔

"کیوں صاب، پہلے تو کبھی آپ کو اتنا چپ نہیں دیکھا تھا، بہت دور سوچتے ہوئے ۔ کچھ پیئیگا نہیں آج؟"

میں مسکرا دیا ۔ پھر بیرے سے کہا ۔ "ہاں، کچھ ایسا بھی ہے ۔ میں تو فادر کے انتظار میں ہوں ۔" وہ مسکرا پڑا ۔ تب میں نے کہا ۔ "ٹھیک ہے، کچھ لے آؤ ۔ آج تمہارے choice پر ۔" وہ کچھ خوش خوش چلا گیا۔

میں نے ایک نظر اس ناولٹی کاؤنٹر پر ڈالی ۔ لگا گلڈا میری طرف دیکھ رہی ہے اور دیر سے دیکھ رہی ہے اور اس کی مسکراہٹ میں ایک واضح پیام ہے کہ میں تم سے

آکر ابھی ملنا چاہتی ہوں ۔ میرا دل زور سے دھڑکا ۔ وہ نیلے نیلے آسمانوں سے اُترنے والی وہ چاند ستاروں کی بستی کے نور و رنگ سے بنی ہوئی گلڈا ۔ کہا تھا نا فادر نے تم بھی مل سکتے ہو گلڈا سے ۔ میں گلڈا کو خوب جانتا ہوں ۔ کہا تھا نا فادر نے ۔ بس گلڈا آجائے یہاں میرے قریب ۔ دل کے کڑھائی میں تپ تپ کر یہ جذبہ اب تو کیمیا اثر بن چکا ہوگا ۔ اتنے دور کے بادلوں میں چمک چمک جانے والی بجلی کی سی ایک تڑپ جانے کن کالی گھٹاؤں کو ساتھ لائے اور برس پڑے ۔ اور پھر کن ساونوں کو ساتھ لائے اور بدل دے اس کِشتِ حیات کی ساری فصلوں کو ۔ میں تو طئے کر لوں گا کہ اب مجھے اور کہیں جانا نہیں ہے ۔ میں تو بس اس ایک وجود، اس ہزار رنگ گل تر کی جلو میں چلا جاؤں گا آسمانوں کی طرف ۔ یہ کیسا شعلہ بھڑک اٹھا میرے اندر ۔ ایک تمنا کا، ایک یقین کا کہ میں نے تو صرف ایک ہی عشق کیا ہے زندگی میں ۔ سچا، مستحکم، لازوال اور وہ ہے گلڈا میں نے اپنے آپ سے سرگوشی کی کہ عشق یہ ہوتا ہے، جس کا صرف آغاز ہی آغاز ہوتا ہے اور کوئی انجام نہیں ہوتا ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ لیکن میں تو اچانک اس عجیب کیفیت سے کچھ ایسے چونک پڑا جیسے میں پھٹ پڑا ہوں اپنے اندر ۔ پھٹ پڑا ہوں ۔

بیرا آگیا ۔ میری طرف دیکھتے ہوئے پھر اسی انداز میں وہ گویا ہوا ۔

"کیوں صاب ۔ آپ کا رنگ کچھ بدلا ہوا ہے آج ۔ آپ کا صورت کچھ .... پریسان ہیں کیا آپ؟ لیجئے، میرے choice کا ڈرنک لایا ہوں ۔ میں بناتا ہوں پہلا پیگ لیجیے ۔"

میں نے اس کی طرف بہت غور سے دیکھا ۔ پھر سوچا فادر ابھی نہیں آئے، یہ گلڈا نے بھی تو کوئی پیام دیا تھا آج ۔ میں نے سامنے رکھی ہوئی شراب ذرا کچھ تیزی سے حلق میں اتار لی ۔ بیرا جا چکا تھا ۔

میں نے سوچا ۔ اتنی ساری شراب ہے سامنے ۔ واہ، وقت بھی کیا چیز ہے کل کی بات ہے کہ میرے ہی نہیں، میرے خیالوں کے قدم بھی کانپ جاتے تھے، اس ہوٹل کی طرف بڑھنے کے لیے ۔ اور آج اس طراری سے بڑھ آتے ہیں اور یہیں جم جاتے ہیں ۔ ٹھہر جاتے ہیں جیسے کسی پتھر کے مجسمے کے پَیر ہوں ۔

ناولٹی کاونٹر کی طرف پھر نظر ڈالی میں نے، وہاں گلڈا نہیں تھی ۔ سیدھے جیسے

گلاس اپنے آپ اٹھ کر ہونٹوں سے لگ گیا۔ اور میں پینے لگا ایک گھونٹ، دو گھونٹ۔ تین گھونٹ۔ آخر فادر کیوں نہیں آیا۔ کیا تنہائی سی تنہائی ہے۔ بار بار یہ ایک ہی سوال ذہن کو ہلکے ہلکے کچوکے لگا رہا تھا۔ آخر فادر کیوں نہیں آیا۔ کیوں نہیں آیا۔؟ میرے پاس جیسے اس واضح سوال کا کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ اس سوال کے ساتھ ہی ذہن میں ایک خلا سا پیدا ہو رہا تھا اور فادر کے نہ آنے کے کچھ سمجھ میں نہ آنے والے اسباب کی جگہ کچھ اندیشے لے رہے تھے اور میرے ذہن کی تلخی میں اضافہ کر رہے تھے۔ کتنی پی لی تھی میں نے۔ تنہائی کا احساس بھی ایک دائرے کی شکل میں میرے اطراف پھیل رہا تھا۔ عجیب عجیب شکل کے احساسات ہیں چھپے ہوئے اس انسانی نظام میں! کس طرح سمجھیں ان کو۔ یہ شراب تو ہے ہی ایک شوخ و طرار، خوش خصلت خاتون، سدا عنفوانِ شباب بنی ہوئی، لیکن اس کی بھی یہ ایک عجیب خصلت ہے، جو کبھی کبھی اس کے چہرے کو بگاڑ دیتی ہے کہ بلاوجہ، بلاسبب، کبھی کبھی یہ ہر بات کے معنی مطلب سمجھانے لگتی ہے، جیسے یہ خیال کیا ہے، یہ خوف کیا ہے، توبہ، یا پھر یہ تنہائی کیا ہے۔ بھلا تنہائی کے بھی کوئی معنی مطلب ہوتے ہیں۔ کوئی ساتھ نہیں ہے تو نہیں ہے ٹھیک ہے آدمی اکیلا ہے۔ اکیلا اکیلا۔ تنہا تنہا، بڑا ہی لرزتا گرجتا خیال آگیا جیسے بے شمار خوف ایک آواز ہو کر کہہ رہے ہیں۔ "نہیں۔ نہیں۔ یہ اکیلا پن، یہ تنہائی ہی تو تمہاری تکمیل نہیں؟ تکمیل!!"

اچانک جانے کیوں میں چیخ پڑا "بیرا۔" کیوبیکل کے شٹرز کچھ کھل کر بند ہوگئے، جیسے ہوا کا ایک جھونکا تھا وہ۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ بیرا بھی آگیا۔ اس نے کہا۔ "آج بہت دیر ہو گئی صاب۔ ہوٹل بند ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے" بل ادا کیا اور چل پڑا۔ ایک بار شٹرز کو اپنے ہاتھوں سے تھام کر کچھ سہارا سا لیا میں نے۔ ویسے آنکھوں میں کچھ زیادہ ہی روشنی محسوس ہو رہی تھی، نشے کی۔ ہوٹل سے جب میں باہر نکل رہا تھا تو ذرا بار بار اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ خیال کہ، اب میں نے لندن جانے کا فیصلہ کر لیا ہے مجھے زیادہ سنبھالا دیتا، میں اپنے آپ کو اپنے آپ سے مطمئن اور مسرور پا رہا تھا۔

ہوٹل کے باہر دور تک پھیلا ہوا ایک لان تھا۔ وہاں وہی ایک بڑا قمقمہ ایک اونچے پول پر لگا ہوا تھا جس کی روشنی مجھے آج کچھ سرخ اور کچھ سیاہ لگ رہی تھی۔ اور وہ دورنگی روشنی دیکھ کر پتہ نہیں کیوں میں کچھ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ "بہت جلد چلا جاؤں گا۔ یہاں سے دور، دورنگی نہیں، ہزار رنگوں کی روشنی میں۔ اچھی اچھی آزاد اور خوش فعلیوں سے معمور زندگی ہوگی۔ کیا دکھ، کیا دکھڑا؟ کیسا جاندار تھا وہ ٹرین والا پروفیسر۔ بڑا آدمی لگتا تھا وہ بھی۔ دور دیشوں میں کیسی بھرپور زندگی گزار کر لوٹ رہا تھا وہ اپنے دیش کو۔ کس دلداری کے ساتھ، اور کیسی چمکتی دمکتی جبینِ نیاز جھکائے جا رہا تھا وہ اپنی بنو کے پاس۔ کیا سرخروی تھی اس دلداری کی۔ اب تو مجھے بھی جانا ہے یہاں سے دور، کتنی دور۔! ان پرانی زمینوں اور پرانے سمندروں کے فاصلوں سے تو اچھا لگتا ہے، آسمانوں کے فاصلوں کا شمار رکھوں۔ کیا خوش رنگ سفر ہوگا، آسمان کی وادیوں کا سفر ہوگا۔

لان پر پھیلی ہوئی ان دورنگی روشنیوں میں، کچھ دور اچانک ایک دورنگا چہرہ نظر آگیا مجھے۔ عجیب سا سیاہ چہرہ، اس پر جلے تانبے کے سے داغ، اور بھک سفید آنکھیں، میں کچھ چونک گیا، اپنے نشے کے معجزے پر۔ تب اس شکل میں ایک حرکت سی ہوئی، اور ایک شخص تیزی سے میری طرف بڑھ آیا۔ میں نے اس پر کچھ غور کرنے کی کوشش کی۔ وہ بہت قریب آگیا۔ کچھ رکے رکے اور کچھ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "صاحب!"

میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔

"صاحب، آپ کس طرح پہچانیں گے، مجھے۔؟"

میری نظروں کے نشے میں کچھ فرق سا محسوس ہوا۔ میں نے کچھ سنبھل کر پوچھا "کون ہو تم۔؟"

"میں ..... میں صاحب، میں وہی، اس بگھی کا کوچوان ہوں جو ایک رات، پچھلے پہر نواب فرخندہ کی ڈیوڑھی سے آپ کو اپنی بگھی میں آپ کے ہاسٹل لایا تھا۔ یاد ہے صاحب۔ آپ کے ایک ساتھی بھی تھے آپ کے ساتھ؟۔"

اچانک میرا سارا نشہ، جیسے اپنے سر کے بل میرے ہی قدموں پر گر پڑا۔ جیسے

میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ نواب فرخندہ کی ڈیوڑھی! بگھی، کوچوان! اور پھر میرا ساتھی۔ میرا ساتھی!! فرزی .... فرزی!! ایسا لگا جیسے وہ نام وہ خیال۔ ایک روپ، ایک یقین، ایک وجود بن کر میرے سینے سے آلگا ہے، مجھ سے لپٹ گیا ہے، مجھے چمٹ گیا ہے اور اب وہ میرے اندر ہے۔ میری نس نس میں، میری رگ رگ۔ اور پھر سرخ، سرخ رنگ بن کر میری آنکھوں میں اتر آیا ہے۔ میں چپ تھا۔ اپنے اندر ہی اندر کہہ رہا تھا۔ "فرزی تو .... فرزی میں!"

میں نے پھر کوچوان پر نظر ڈالی۔ وہ پھر مجھ سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "صاحب، صاحب، پہچانا آپ نے مجھے۔؟ معاف کیجیے میں بہت جلدی میں ہوں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ معاف کیجیے۔ میں .... میں دراصل آپ سے یہ کہنے آیا ہوں۔ یہ کہنے آیا ہوں۔" وہ کچھ رک رک جاتا تھا۔ اس کی آواز بھی صاف نہیں تھی۔ لہجہ اگر نرم نرم اور کچھ اپنائیت لیے ہوئے ہو تو ایسے میں آواز اگر کھردری بھی ہو جائے تو اس کے بیچوں بیچ اس کی ایک دھار سی ہوتی ہے جو اس طرح اترتی ہے سماعت کے راستوں سے کہ لگتا ہے وہ کھردراپن کچھ کرید نہیں رہا ہے، بلکہ ایک نرم نرم سا احساس بن کر دل کی دھڑکنوں میں پھیل رہا ہے، جیسے ایک تعلق ہے انسانیت کے جذبے کی گہرائیوں کا۔ کچھ ایسی ہی آواز میری دھڑکنوں سے قریب لگی۔ اب پوری طرح سنبھلے ہوئے لہجے میں میں نے کہا۔ "میں نے تم کو پہچان لیا ہے۔"

وہ میری طرف کچھ جھک آیا۔ پتہ نہیں کیسے اب اس کی آنکھیں سیاہ لگیں اور سارا چہرہ بھک سفید۔ اس نے جیسے اپنے آپ سے وہ سب کہہ دیا جو وہ مجھ سے کہنے والا تھا۔ ہونٹ تو جیسے اس کے بند ہی تھے۔ لیکن ہلکی سی آواز آئی۔

"صاحب، آپ کو بی بی بلا رہی ہیں ...." یہ کہتے ہوئے جیسے وہ کانپ گیا۔ لیکن میرے سامنے تو اب وہ روشنی تھی، نہ رات، نہ وہ کوچوان۔ "بی بی۔ بی بی!! کون بی بی؟" جیسے میں اکیلا ہوں اور اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ کون؟ کون بی بی!!" ایک کانپتا ہاتھ میرے قریب تھا اور ایک کاغذ کا پرزہ۔ اور میری آنکھوں میں کچھ اندھیرا، سا روشنی کی زد میں، میں نے اپنی بجھی بجھی آنکھوں کی روشنی میں اس کو غور سے دیکھا

زیادہ غور سے دیکھا۔دوسری بار دیکھا۔اور دیکھتا ہی چلا گیا۔اور محسوس کرنے لگا کہ کوئی بڑی ہی تیز نوک دار کیل میرے سینے کے اندر دھنس گئی ہے۔اور اب اچانک میرے سینے سے خون بہنے لگے گا۔میرے دست و پا میں عجیب سی نمی پھوٹنے لگی، اور گھڑی بھر میں، میں جیسے، جیسے سر سے پیر تک سرد ہو چکا ہوں۔لگا میں ایک پتھر ہوں، میرا سر، میرے پیر، میرا سارا وجود پتھر ہے۔اور کچھ بھی نہیں۔نہ کوئی احساس نہ کوئی خیال۔اس کاغذ کے پرزے پر ایک لفظ نظر آیا۔ایک ہی لفظ۔ایک ہی لفظ۔سِمی۔"

اب اس پتھر میں گونج تھی اور وہ گونج اس پتھر کو توڑ رہی تھی۔میں پتھر کے ٹوٹنے کی آواز سن سکتا تھا۔اس پتھر کے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ میں سن رہا تھا۔

"صاحب۔وہ اس بڑی سڑک پار، اس گلی میں ہیں، جو تاریک ہے۔وہ بگھی میں ہیں اور وہ بگھی وہاں گلی کے ایک تاریک گوشے میں ہے۔میں .... میں آپ کو لینے آیا ہوں۔" کوچوان نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیے جیسے وہ جان گیا ہے کہ میں اب وہیں نیچے گرنے والا ہوں اور وہ مجھے سہارا دینے والا ہے۔میرے اندر وہ ایک گونج جاری تھی۔سِمی .... سِمی .... سِمی۔اور پتھر ٹوٹ رہا تھا۔

کوچوان کی وہ کھردری آواز پھر سنائی دی۔"یہ سب سچ ہے صاحب۔آپ چلیے، میرے ساتھ۔میں آپ کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

وہ تو میرا ہاتھ پکڑے مجھے ساتھ لے جا رہا تھا، لیکن میں جیسے اپنے ساتھ وہ ایک بڑا پتھر گھسیٹ لے جا رہا تھا۔بڑی سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز رفتار کار کا ہارن سنائی دیا اور میں چونکا تو اچانک مجھے وہ گلی نظر آ گئی۔میں ٹھہر سا گیا۔سنبھل سا گیا۔اب میں محسوس کرنے لگا میں تو وہاں اکیلا ہوں۔یہ بڑی سڑک، یہ گلی اور وہ نام اس کاغذ کے پرزے پر۔فریب ہیں۔سراب ہیں، میرے نشے کے بنائے ہوئے۔وہاں میرا وجود کتنا اچھا لگا مجھے کہ کبھی کبھی یقین سے زیادہ آسودگی بخشنے والا ایک گمان ہوتا ہے شائبہ ہوتا ہے .... لیکن ...... لیکن وہاں اب میرے سامنے ایک بگھی تھی۔بگھی !!ذہن کے دھندلکوں میں وہ بگھی۔میں اس بگھی کو اب بہت قریب سے دیکھ سکتا تھا، لیکن قریب سے دیکھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت بس ایک خیال و خوف کے قابو میں ایک جذبہ، بے اختیار اور دیوانگی پر مرمٹنے والی اس کی اپچ۔یا پھر نیم ہوش، یا بے

ہوشی جیسا ہوش اور کوئی حس ان ساری کیفیتوں کا پتہ دیتی ہوئی ۔آنکھوں میں کچھ
اندھیرا یا پھر اس تاروں بھرے آسمان کا ایک موہوم سا عکس ۔ایسے عالم میں ایک
کنگن کھنک گیا ۔سریلے انداز میں سنائی دے جانے والی ایک کلائی میرے ہاتھ میں
آگئی ۔کسی ہوا کے جھونکے نے مجھے بگھی کے اندر پہونچا دیا ۔وہ جھونکا خوشبو بن کر
میری سانسوں میں الجھ گیا ۔جیسے یہی تو ہے میری زندگی کی اصلی سانس ۔سمی کے بدن
کی وہی خوشبو ،آج بھی تازہ تازہ ۔پیار کی لذتوں سے پھوٹنے والی خوشبو ۔اور سامنے ،
میری نظروں کے سامنے میری سانسوں میں الجھی ہوئی ۔سمی ۔سمی ۔سمی ۔جیسے
میرے ہونٹوں سے پہلے میری سانسیں دہرانے لگیں یہ نام ۔سمی اسی خوشبو کے لباس
میں ،اسی خوشبو کی شکل میں ۔اسی خوشبو کے رنگوں میں ،روشنی میں ۔جیسے ایک جھکڑ
آیا ۔ایک طوفان اُٹھا اور ایک نظر کے اٹھنے اٹھنے تک ہم دونوں اس طوفان میں گھر
گئے ۔دبی دبی ہچکیاں ،دبی دبی سسکیاں سہاں ایک سیلاب ہے جو رک نہیں پاتا ،
لیکن رکتا بھی ہے ۔اب تو سب کچھ تاخت و تاراج ہونے والا ہے ۔یہ کونسا احساس
درد ہے ،ایک سمندر جو بے ساحل ہے ،یہ کونسا چشمۂ سرور و سرخوشی ہے ،جو اپنی ہی
جولانگاہ پر محوِ حیرت ہے ۔یہ کتنی صدیوں اور کتنے قرنوں کی بیتابیوں اور بے قراریوں کا
جوار بھاٹا ہے ۔دل و جان کی کن پرتوں سے اُبل رہا ہے یہ لاوا ۔نہ کسی خوف کے
سائے نہ اندیشوں کی سیاہیاں ۔یہ کتنا کھلا آسمان ہے ،جس کے تلے زندگی کا سارا
حسن اپنے عروج کو پہونچ رہا ہے ،اپنی منزل تک پہونچ گیا ہے ۔نہ رات ،نہ شام ۔نہ
صبح نہ سحر ،بس ایک کیفیت روشن روشن ،نشے جیسی ۔جگمگاتے خمار جیسی ۔لیکن میں
تو اس وقت اور اس کیفیت ہی کے بے حساب ،بیش بہا آنسوؤں میں بھیگ گیا ہوں
بھیگ رہا ہوں ۔مجھے کیا خیال ،کیا ہوش کہ کتنی بار وہ دو سرخ و گرم ہونٹ کتنی ہی
تمناؤں کا مناؤں کی لذتیں لیے ہوئے ،کتنے ہی جذبوں کی چمک دمک لیے ہوئے ،
لذاتِ آستین و گریباں لیے ہوئے ،میرے بدن پر بے شمار مہریں ثبت کرتے رہے ،
جیسے ہر موئے بدن لمس ہو مہر و وفا کا ،کرب کا ،بے مہری صدق و صداقت کا اور میں
کن بیگانے بیگانے حواس و ہوش کے ساتھ ،کتنے ہی ماہ و سال کی تاب و تپش لیے
ہوئے لب و رخسار کو ،اس جبینِ روشن میں پوشیدہ پوشیدہ سجدوں کی بے قراریوں کو

کتنی راتوں کی شبنم میں بھیگی ہوئی آنکھوں کو، ارمانوں کا گدازلی ہوئی باہنوں کو اپنی دیوانگی کے دامن میں پناہ دیتا رہا۔

بڑی ہی بھاری بھاری سانسوں میں دبی ہوئی ایک سرگوشی سنائی دی، جس میں ان سانسوں میں لسبے ہوئے درد کی مٹھاس تھی۔

"دو گھڑی .... بس دو گھڑی ٹھہرو۔ دو گھڑی کی فرصت۔ ویسے نہیں چاہیے مجھے یہ فرصت بھی۔ لیکن یہ وقت۔ اُف۔! اس نے بالکل ایک یاد آجانے والے انداز میں، میرے سر کے بال پکڑ کر، میرے چہرے کو اٹھایا۔ اس کے آنسوؤں سے چھن کر آنے والی روشنی میری آنکھوں میں تھی۔ میں نے کچھ کہنے کو زبان کھولی تو اس نے میرے ہونٹوں کی بے قراریوں پر اپنے ہاتھوں کی نزاکتیں رکھ دیں۔" نہیں، نہیں، تم نہ کہو، کچھ نہ کہو۔ مجھے دیکھو۔ دیکھو میری یہ ترسی ہوئی زبان، تشنہ تشنہ، اپنے اظہار کے لیے۔ تمہاری تو ہر سانس وہی ہے، ہر نظر وہی ہے۔ تم اسی طرح میرے ہو، اتنے ہی میرے ہو، سارے کے سارے، جیسے تھے۔" وہ جیسے ٹوٹ کر میری آغوش میں گر گئی۔ میں نے اپنی سانسوں میں اس کو سنبھال لیا۔ اس کی بہتی آنکھوں پر اپنے گرم گرم ہونٹ رکھ دیے، اس کی پیشانی کے کئی بوسے لیے۔

"ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ سنو نا میری بات وہ کچھ ٹھہر سی گئی۔ پھر کہنے لگی" دیکھو تم سے دور، ہزاروں دن، ہزاروں راتیں گزار لیں میں نے۔ ایک ایک دن آسمانوں کا سا بوجھ بنا ہوا سینے پر ایک ایک رات ایک مرضِ دوام بنی ہوئی۔ کس طرح اور کب اتاروں ان احساسات کے بوجھ کو اپنے سینے سے۔ یہ تو آسمانوں کو چھوتا ہوا اور زمینوں کے اندر دُور دُور تک دھنسا ہوا ایک پہاڑ ہے۔ کیسے سانس لوں۔؟

"مَیں تو ایک سوکھی ندی تھی، جو ایک بہاؤ بننے کی کوشش میں ایک راہ تلاش کرتی رہی، تپتے ریگزاروں میں۔ چٹانوں سے بنی زمینوں میں۔ آخر دیکھو ایک سوکھی ندی ان جلتی جھلستی زمینوں پر ایڑیاں رگڑتی رگڑتی بن ہی گئی ایک بہاؤ۔ آ ہی گئی، پہونچ ہی گئی۔ مل ہی گئی اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے بحرِ حیات میں، جس کی ایک ایک موج میری تمنا ہے، میرا حکم ہے، میری حکومت ہے۔ کیا فرق ہے اس کی گہرائیوں میں اور آسمانوں کی بلندیوں میں۔

اس شدّتِ جنوں سے لپٹ گئی، چمٹ گئی وہ مجھ سے جیسے اس کا سارا وجود پہاڑوں جیسا ایک یقین ہیکہ اس کی ساری کائنات اب ہر طرح بھری پری ہے، مکمل ہے، کہیں، کہیں، کہیں کوئی کمی نہیں ہے اس میں۔

اس کی ان ساری باتوں کو سن کر، اور اس کی ان ساری کیفیتوں کو دیکھ کر، میں لپنے اندر بار بار بکھر رہا تھا، سمٹ رہا تھا۔ جیسے میں لپنے اندر ہوں بھی اور نہیں بھی۔ ایک بجلی سی چمکی میرے ذہن میں، ایک خیال کہ اس لمحے سے بھی تو زندگی شروع کی جاسکتی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ ایک عجیب و غریب یقین، ایک لاوے کی شکل میں اُبلنے لگا ہے میرے اندر کہ ہاں اگر زندگی کا واقعی کوئی آغاز ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے، میں نے آہستہ سے کہا۔

"میری عقل و ہوش کو تو تم نے تنکوں کے طرح اُڑا دیا۔ لیکن میں اب کیا ہوں، کہاں ہوں، کیسا ہوں، کچھ تو سنو۔ وہ ...."

ایک ایسی مسکراہٹ آگئی اس کے ہونٹوں پر جس میں ایک شوخ پھول کی پنکھڑیوں کی سی نزاکت تھی، جو دراصل کچھ یقینوں اور لمانوں کا اظہار ہوتی ہے، اس نے لپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں سے قریب ترلاتے ہوئے کہا۔

"جسموں اور روحون کی یکجائی جن احساسات کو جگاتی ہے، اس کا اظہار تو ان احساسات کی وقعت کو گھٹا دیتا ہے۔"

میں نے بھی ایک ہلکی سی چھیڑ کے ساتھ کہا۔ "تم نے اتنی ٹیڑھی میڑھی باتیں کہاں سیکھ لیں۔

"انہی ٹیڑھے میڑھے راستوں سے، جن سے گزر کر میں تمہاری تلاش میں یہاں پہونچی ہوں۔ گاؤں سے تمہارے چلے جانے کے بعد بابا ایک خطرناک مرض میں، زمانہ ہوا ختم ہوگئے۔ بڑی امی الگ ہو گئیں۔ چھوٹی امی بھی الگ ہوگئیں۔ میں اپنی امی کے ساتھ شہر آگئی۔ شہر کے حالات نے ہم کو نواب کی ڈیوڑھی تک پہونچا دیا۔ میں نے وہیں زندگی گزاری ہے۔"

اچانک اس نے ایسی کروٹ لی میری آغوش میں کہ اپنا چہرہ میری باہنوں میں چھپالیا۔ وہ ایک جھرنا تھا جو کسی باندھ کے پیچھے رُکا ہوا تھا۔ پھوٹ پڑنے کے لیے راہ

ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ پھوٹ پڑا۔ اس کی کچھ رُک رُک جانے والی سانسوں نے کہا۔" اب یہ میری زندگی کی آخری منزل ہے آگے کچھ نہیں۔"

میں اس سے جو کچھ کہنے والا تھا، وہ میں کہنے لگا تو پتہ نہیں کیوں وہ لہجہ ایک التجا کا انداز بن گیا۔" تم اب ان باہنوں میں بس چکی ہو۔ اور یہ ہماری زندگی کا آغاز ہے۔ میرا ہر جذبہ ، ہر احساس تمہارے جذبہ و احساس سے مِل کر زندگی کا احساس بنے گا۔ تمہاری آنکھوں میں جو زندگی کی روشنی ہے، اس کی بھیک مجھے دے دو۔ ورنہ یہ اندھیروں کے سمندر، جن کے ساحلوں پر میں کھڑا ہوا ہوں، ان کی موجیں آگے بڑھ کر مجھے سمیٹ لیں گی اور میلوں دور تک میں ان سمندروں میں ڈوب جاؤں گا۔ اور زندگی کی اِس زمین کی ایک جھلک بھی دیکھ نہیں پاؤں گا۔

اس نے ایک یقین کی لذتوں کے ساتھ باہنیں پھیلادیں۔ جیسے اب یہ سارا جگ اسی کا ہے۔ یکبارگی اس کے کنگن کے لعل و گہر چمک گئے۔ وہ چمک اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ میری آنکھیں میری زبان بن گئیں۔" اُف اتنا سارا حسن میرے نصیب میں! جیسے ایک ہی نصیب روشن ہوا ہے اس جہان میں۔"

" ایسی کوئی بات نہ کہو۔ کچھ نہ کہو۔" اچانک وہ ایک کرب کے احساس کے ساتھ اُٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس کا لہجہ بدل گیا جیسے یکایک اس نے اپنے سینے میں ایک شدید ٹیس محسوس کی ہے جس کو وہ سہہ نہیں پارہی ہے۔ وہ کہنے لگی، اس ٹیس کے سارے اظہار کے ساتھ۔

" میرا ایک عزم تھا، چٹانوں سے زیادہ مضبوط۔ اور وہ تم تھے۔ ایک ہی عقیدہ تھا میری زندگی کا اور وہ تم تھے۔" اس کا سر جُھک گیا۔ اپنا چہرہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔ میں نے کہا۔" ہاں، یہ میرا ایک یقین تھا۔ اور آج بھی ہے۔"

" نہیں۔" کچھ اونچی آواز میں کہتے ہوئے اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں خون تھا۔ لیکن بہتا ہوا کوئی آنسو نہیں تھا۔ اس نے اسی لہجے میں کہا۔

" ساری کائنات سے میری ایک ضد تھی۔ ایک ضد، کہ چاہے یہ کائنات میری پوری زندگی لوٹ لے۔ مجھے چاہے برباد کردے۔ میں زندہ رہوں گی۔ زندہ رہوں گی۔ اور وہ ضد تم تھے، تم، ایک بار دیکھوں گی تم کو اپنی آنکھوں سے۔ تم کو چھولوں

گی، اپنے ہاتھوں سے، اور اپنے خشک بے رس ہونٹوں سے تم کو اور تمہاری آنکھوں کو چوموں گی جی بھر کے، تم سے ملوں گی اس طرح، خواہ تم سے ملنے کے لیے میرے پاس دو ہی سانسیں باقی کیوں نہ رہیں۔ دیکھو۔ دیکھو، آج میں کتنی کامیاب ہوں۔ سر بلند ہوں۔ کتنی کامیاب کہ آج تمہارے سامنے ہوں۔ تمہاری باہنوں میں ہوں۔ تم سارے کے سارے میری آنکھوں میں ہو۔ میری سانسوں میں ہو۔ اور اب میرے پاس بے شمار سانسیں ہیں، لاکھوں، کروڑوں۔ لیکن تم میری اس کامیابی کو کبھی کبھی کسی صداقت کا نام نہ دینا، میری لگن کی سچائی کا نام نہ دینا۔ یہ تو میری فطرت کی پکار تھی۔ میرے سارے وجود کی تشنگی تھی۔ اُف!!" اچانک ایک اضطرار کی سی کیفیت میں اس نے میرے دونوں ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا سر میرے سینے پر آ گیا۔ پھر آنکھیں کھول کر لمحہ بھر میری آنکھوں میں کچھ ڈھونڈھنے لگی، پھر کہا۔ "میرے پاس تمہارے لیے ایک سوال ہے، صرف ایک سوال، وہ یہ کہ تم کیوں نہیں بدلے۔؟ تم کیوں نہیں بدلے؟" اس کے چہرے کی سرخی جیسے کچھ چمک گئی۔

میں نے کچھ دبی دبی آواز میں اس سے پوچھا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" تم ایسی کوئی بات نہ پوچھو۔ میرا سوال، میرا ایک یقین ہے۔ تم کیوں نہیں بدلے۔؟ سارے زمانے پر اتنا اعتبار کیسے کر لیا تم نے، تم کیوں نہیں بدلے۔؟ کاش تم بدل جاتے۔ کتنا سکون مل جاتا مجھے۔ میری زندگی کا حاصل مجھے مل جاتا۔ کاش تم بدل جاتے۔ میری ہر سانس میری زندگی کی ایک پُرسکون تکمیل لگتی۔ تم تو سچ مچ خوب پڑھ لکھ کر ایک بڑے آدمی بن گئے۔ اور میں اب بھی بہت چھوٹی ہوں۔ حقیر، اے میرے بڑے آدمی۔"

میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "بس ایک بات۔ ایک بات مجھے کہنے دو۔ میرا ایک چھوٹا سا ٹھکانہ ہے، یہاں سے بہت قریب بہت قریب۔ چلو اب ہم وہیں چلے جائیں۔ ہمیشہ کے لیے اب ہم وہیں بس جائیں گے۔

اوّل تو تڑپ کر وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ پھر گھڑی بھر میں اپنی باہنیں میرے گلے میں ڈال کر اس طرح جھول گئی جیسے اب وہ بڑی ہی بے فکر اور مست و مگن ہو گئی ہے

پھر میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بڑی ہی ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے تو یہیں نیند آرہی ہے۔"

میں نے کچھ ایسے جذبات و احساسات کی نرمیوں، گرمیوں میں اسے محفوظ کر لیا کہ مجھ میں بھی ایک ایسا پُرلطف احساس سرائیت کر گیا، جیسے میں بھی یہاں پوری طرح محفوظ ہوں اور باوقار بھی۔ شاید اس ایک لمحہ کے لیے آسمان پر بھی چاند ابھر آیا تھا۔ اس کی ٹوٹی ٹوٹی کرنیں تھیں اس بند پلکوں والے چہرے کے آس پاس۔ اس کو دیکھ کر یہی خیال آیا تھا کہ حسنِ کس قدر بلند مقام ہوتا ہے، اس خیال کے ساتھ ایک یقین بھی ہوا کہ ہاں زندگی ایک سچ ہے، اس منظر کو دیکھ کر پہلی بار میں نے ایک ایسی سانس لی جو شاید زندگی کی اونچائیوں پر چلنے والی ہواؤں کی دَین ہوتی ہے۔

اچانک وہ چونک پڑی۔ جیسے وہ ایک بھیانک خواب سے جاگ پڑی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی ۔ کہنے لگی۔ "اُف کتنی ڈراؤنی شکل تھی وہ! کتنا زہریلا تھا وہ خیال! گھڑی بھر میں جان لے لینے والا۔ اُف!" اسی کانپتی ہوئی آواز میں وہ کہنے لگی۔

"اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ اسی دنیا میں رہیں گے۔ یہیں بس جائیں گے کہیں، کہیں نہیں جائیں گے۔ میں تو اب بس چکی ہوں۔ یہیں ٹھہر گئی ہوں۔ یہاں قیام کر لیا ہے۔ تمہاری بانہوں کی چو دیواری میں۔ کتنی مضبوط فصیل میں محفوظ ہوں میں، تمہاری یہ آغوش، کتنا پُرسکون ہے یہ گھر زندگی کے لطف و کرم سے بھرپور۔ میں تو بس بھی گئی، جی بھی گئی۔"

پھر جیسے یکایک وہ اپنی آنکھوں سے بھینچتے ہوئے مجھ سے اس طرح چمٹ گئی کہ بس اس گھڑی اس زندگی کی تعمیر ہو جائے، اسی گھڑی وہ زندگی پھلنے پھولنے لگ جائے، اسی گھڑی وہ زندگی ایک ایسا یقین بھی بن جائے کہ اب اس آسمان تلے ایک بھی ایسا کوئی احساس ہمارے قریب نہ آئے جس کو برداشت کرنا پڑے ایک درد کی طرح، ایک دکھ کی طرح، مرض کی طرح، ہجر کی طرح جدائی کی طرح، جدائی!! جیسے سچ مچ وہ ایک چیخ بن گئی۔ شدید وحشتوں میں جکڑی ہوئی چیخ!! اس ہلکی روشنی میں۔ اس ہلکے دھندلکے میں۔

میں نے اس کو ایک دیوانگی کی ساری صداقتوں کے ساتھ سمیٹ لیا اپنے سینے

میں۔ جیسے میں نے اس کو اس گھر میں بسالیا ہے، اونچی اونچی فصیلوں میں، محفوظ گھر میں۔ میں نے کہا۔"ہاں چلو، اب میرے اس چھوٹے سے آشیانے کو۔ اب ہم وہیں چلے جائیں گے۔ وہیں رہیں گے۔ اور پھر وہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ بس اب چلو، ہم اب وہیں چلے جائیں گے، چلو۔"

وہ اب بھی وحشت زدہ تھی۔ اسی آواز میں وہ یکلخت بول پڑی۔"نہیں۔ نہیں، آج نہیں، آج نہیں۔ ہاں کل کل ضرور، کل۔" بڑے ہی تھکے ہوئے انداز میں اس نے میرے شانے پر اپنا سر ڈھلکا دیا۔ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔"برا نہ مانو۔ برا نہ مانو۔ آج نہیں کل۔ ہاں کل۔" ایک شدید تڑپ کے ساتھ بے طرح مجھ سے لپٹ گئی اور کہا۔"میرے ان ہونٹوں کو چوم لو۔" وہ ہونٹ انگارے تھے، خوں رنگ پھول اور۔ ان ہونٹوں کے راستے وہ مجھ میں تحلیل ہو رہی تھی، میرے اندر میرا سارا وجود ایک نئی زندگی کے احساس کی شکل میں رگ وپے میں دوڑ رہا تھا۔ وہ ایک درد بھی تھا، دکھ بھی تھا۔ ایک مسرت کی لہر بھی تھا اور ایک یقین کی حرارت بھی تھا، ایک نشاط آگیں زندگی کا یقین۔

اس کے چہرے کی رنگت میں ہلکی ہلکی روشنی کا سا انداز آگیا۔ لہجہ بھی اس کا سلجھا سلجھا سا لگا۔ میرے شانوں پر اس نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ اور کہا۔"دیکھو کل شام تم میرے پاس آجانا۔ میں سارا انتظام کر دوں گی۔ یہی بگھی بھیج دوں گی تمہارے لیے۔ یہی کوچوان ہوگا، کل سرِ شام تم اپنے اسی ہوٹل کو آجانا جہاں تم اس سے آج ملے۔ تم اس کے ساتھ میرے پاس آجانا۔ تم کو وہ میرے پاس پہونچا دے گا۔ پھر میں تمہارے ساتھ ہو جاؤں گی تمہارے ساتھ۔ تم جہاں چاہو ہم چلے جائیں گے۔ ہمیشہ کے لیے۔ اب صبح قریب ہے۔ کوچوان کو بلا لو۔ میں جاؤں گی"۔

"نہیں، نہیں، اب تم کہیں نہیں جاؤ گی۔"

وہ کچھ بے چین سی ہو گئی، ہراساں بھی ہو گئی۔ پھر میرے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی۔ بس اتنا ہی کہا۔"کل شام کے بعد ہم کبھی کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ مجھے اب جانے دو۔ میں اب جا کہاں رہی ہوں۔ میں تو اب بس چکی ہوں۔ زندگی کے اس محفوظ ترین گھر میں۔ تمہارے اندر۔ ہمیشہ کے لیے"۔

ہلکی ہلکی سرد ہوائیں تھیں۔ میں اس دھندلکے میں کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا سمی کی بگھی دھیرے دھیرے دور ہو رہی تھی میری نظروں سے۔ پھر جیسے آگے بڑی سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز رات کی خاموشی میں کچھ دیر گونجتی رہی۔

باب (۴۰)

پتہ نہیں کیسی کیسی بے خبری کی سی کیفیتوں میں دن گزرا۔ ایسا لگتا تھا کہ ذہن اچانک کہیں ٹھہر گیا ہے۔ کہیں کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ نہ میرے اندر نہ باہر۔ وقت تو ایک ہی رفتار سے چلتا ہے، کیا ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ہی چلا جائے۔ تیزی سے وقت سے آگے بھی تو بڑھا جا سکتا ہے بہت آگے، بہت تیزی سے۔ وہ راہیں وہ منزلیں جو ہر لمحہ میرے سامنے زیادہ سے زیادہ روشن ہوتی جا رہی ہیں ان تک مجھے پہونچ جانا ہے شاید اسی لمحے۔ وقت پہونچے نہ پہونچے۔ مجھے پہونچ جانا ہے۔ میرے وہ کچھ ہوش و حواس، جو باقی تھے، میرے پاس تھے، ان کے ساتھ ان تک میں پہونچ سکتا تھا، اور ان ہی کے ساتھ میں وہاں پہونچ گیا۔ اس ہوٹل کے اس لان تک، سرِ شام۔ وہ ایک بڑا قمقمہ جو وہاں ایک اونچے پول پر لگا ہوا تھا، روشن ہو چکا تھا۔ لیکن آج اس کی روشنی دو رنگی نہیں تھی۔ ایک ہی رنگ تھا اس کی روشنی کا۔ بے داغ صاف، شفاف مجھے ہر طرف ہر شئے کچھ زیادہ واضح نظر آ رہی تھی۔ نہ میں نے آج اس ہوٹل میں قدم رکھا تھا نہ گلڈا ہی کا خیال آیا تھا۔ نہ کوئی ایسا خیال جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ بس بار بار ایک ہلکا سا خوف اور جسم و جاں کے ہر گوشے سے پھوٹ پڑنے والی لذتیں، ایک احساس کی تیز دھار بن کر میرے حلق تک آ جاتیں اور ان کے اظہار بننے سے پہلے میں ان کو اپنے حلق میں دبائے رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ کیا لہر تھی وہ! دنیا بھر کی مسرتوں کی، اس جوش و ولولے کی، اس کے یقین کی کہ ڈر ہو جاتا کوئی دیکھ نہ لے، کوئی جان نہ لے ان کیفیتوں کو۔ ہاں صبر، صرف صبر۔ صبر تو صرف ایک شدید اذیت ہوتا ہے، لیکن دو گھڑی اسے سہہ لوں، برداشت کر لوں تو کتنے ہی در کھل جائیں، ہر جہت سے یلغار کرنے والی گلال جیسی زندگی کے۔ رنگ ہی رنگ، ہزار رنگ۔ گل اندام

مسرتوں کے، نغمہ سرا خمار و جنوں کے، ایک دیدہ زیب ہجوم، ایک ہمہ رنگ ہنگامۂ حیات۔ بس دو گھڑی اور، دو گھڑی اور۔ صبر۔ صبر نام ہے ناموس عقل و ہوش کا۔ کسی جذبہ کے وقار کا۔ اس کی صداقت کے اعتبار کا۔ بس صرف دو گھڑی اور صبر۔

وہ لمحہ آہی گیا۔ اس بے داغ روشنی میں، لان کے دوسرے سرے پر مجھے کوچوان جیسی ایک واضح شکل نظر آگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ شکل آج میری طرف بڑھتی، جانے کس رفتار سے یا بس ایک ہی چھلانگ میں، میں اس شکل تک پہونچ گیا۔ لیکن وہاں تو، وہاں تو وہ ایک مجسمہ تھا سیاہ پتھر میں تراشا ہوا۔ اس کی آنکھیں بھی سیاہ تھیں، پتھرائی ہوئیں۔ اس کے سیاہ ہونٹ بند تھے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے سیاہ چہرے پر ایک ہلکی سی چمک تھی جو بدرنگ تھی۔ اتنی بدرنگ شکل!! ۔وہی کوچوان ساکت و جامد۔ میں نے قریب سے دیکھا اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے دو آنسو نظر آئے۔ پتھر کے آنسو۔ لیکن مجھ سے زیادہ شاید پتھر کو ان آنسوؤں کی نمی کا احساس تھا۔ میری نظروں میں مجھے کسی خوف کا سایہ محسوس ہوا۔ اس خوف کے سائے نے دیکھا۔ وہ پتھر نہیں تھا۔ وہ کوچوان تھا۔ وہ پتھر سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔ میں خود جیسے پتھر میں تبدیل ہونے لگا اور پتھریلی آواز میں میں نے اس سے پوچھ لیا۔ "چپ کیوں ہو؟"

اس میں جنبش ہوئی۔ اس کے دونوں ہاتھ میرے سامنے اُٹھ گئے۔ ان ہاتھوں میں ایک خط تھا۔ ایک بند لفافہ۔ جانے کیا سلوک کیا میرے ہاتھوں نے اس لفافے کے ساتھ۔ خط میری پتھرائی ہوئی نظروں کے سامنے تھا۔

"میں تم سے معافی بھی نہیں مانگ سکتی۔ معافی مانگنے کا خیال تو ایسا خنجر لگتا ہے، جو میرے سینے کے اندر دور تک اُتر بھی جائے تو اس کو شاید ایک قطرۂ خون بھی نہیں ملے گا۔ وہاں سارا خون اپنی گرمی کھو چکا ہے، تھم چکا ہے، جم چکا ہے۔ ایک آنسو بھی نہیں ملے گا اس کو کہ جانے کس خشک ترین احساس کی ایک دھار بن چکے ہیں میرے آنسو۔ تم سے مل کر جب کوٹھی کو لوٹی تو کوٹھی میں لگے ایک آئینے میں مجھے میرا چہرہ نظر آگیا۔ اصلی چہرہ۔ کتنا سیاہ تھا وہ چہرہ۔! بھیانک،

خوفناک ۔ اس چہرے کی سیاہی میرے کام آگئی ۔ کتنا آسان ہو گیا ۔
میرا فیصلہ ۔ اس چہرے کی سیاہی سے ہی میں یہ خط لکھ رہی ہوں ۔
ایسے لمحات کے لیے میرے پاس سب کچھ تھا ۔ وہ میرے کام آگیا ۔ اب
سوچو بھی نہیں کہ میں کہاں ہوں ۔ میں جا چکی ہوں ۔ میرے لیے کہیں
کوئی مقام نہیں ہے ، نہ آسمان کی بلندیوں پر نہ زمین کی گہرائیوں
میں ۔ لیکن مجھے میرا مقام مل گیا ۔ زندگی کی آخری منزل ۔ وہ مل گئی تو
زندگی کی تکمیل ہو گئی ۔ میں نے کل کہا تھا نا تم سے کہ ساری
کائنات سے میری ضد تھی ، ایک ضد کہ چاہے یہ کائنات میری پوری
زندگی لوٹ لے ۔ چاہے مجھے برباد کر دے ، میں زندہ رہوں گی ۔ وہ
ضد تم تھے ۔ ایک بار تم کو دیکھوں گی اپنی آنکھوں سے ، تم کو
چھولوں گی اپنے ہاتھوں سے ۔ جی بھر کے تم کو دیکھ لیا ۔ جی بھر کے تم
کو چوم لیا ، جی بھر کے تم کو اپنا لیا ۔ دیکھو آج میں کتنی کامیاب ہوں ۔
سر بلند ۔ دیکھو میری زندگی میں مجھے سب کچھ مل گیا ۔ اب مجھے کس
لیے چاہیے یہ زمین ، یہ آسمان ، یہ کائنات ۔ میں جا چکی ہوں ۔"

خط سے میں نے نظر اٹھائی ۔ وہاں نہ کوئی مجسمہ تھا نہ کوئی پتھر ۔ نہ کوئی روشنی
نہ کوئی ہوٹل ، نہ وہ بڑی سڑک ۔ نہ وہ شہر ۔

میں اچانک دوڑ پڑا ۔ دوڑنے لگا کوٹھی کی طرف ۔ کوٹھی کو پہونچ گیا ۔ لیکن
میں کوٹھی سے بھی گزر گیا ۔ سارے شہر میں دوڑتا رہا ۔ پھر سارے شہر سے بھی گزر گیا
میں دوڑتا رہا ، جانے کس سمت ۔ شاید میں ہر سمت دوڑ رہا تھا ۔ دوڑتا ہی رہا ، خیال آتا
رہا کہ یہیں کہیں ہے ، سمی ، زمین کے اندر ۔ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی زمین کے
نیچے ۔ میں دوڑتا ہی رہا ، اس زمین پر اور اپنے اندر بھی ۔ دوڑتا ہی رہا ۔ آخر زمین کا آخری
سرا آگیا ۔ زمین کا آخری سرا !!

مجھے اس زمین کے آخری سرے پر پہونچے ہوئے تو شاید صدیاں گزر گئیں ،
لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ یہ کہانی ، یہ داستان جو لکھی ہے میں نے وہ کس کی کہانی ہے ؟
وہ کس کی داستان ہے ؟ سوچتا رہا ہوں کہ میں نے کسی بڑے آدمی کی کہانی لکھی ہے ۔

لیکن یہ تو کسی بڑے آدمی کی روداد حیات نہیں لگتی - یہ تو کچھ چھوٹے چھوٹے عام کرداروں کی زندگی کے حالات و واقعات سے بنی ہوئی ایک کہانی ہے ، ایسے کرداروں کی کہانی جن میں سے کسی پر عام معیار کے لحاظ سے ، بڑا آدمی ہونے کا گمان بھی نہیں ہوتا - ہاں اس کہانی کے کچھ کردار ایسے ہیں جن میں کبھی کبھی ، کہیں کہیں ایک بہت ہی ہلکی سی روشنی نظر آجاتی ہے ، جیسے جگنوؤں کی چمک - ان کی وہ چمک ، وہ روشنی کوئی راستہ تو نہیں بتاتی ، لیکن اس کو دیکھ کر راہ سوجھ جاتی ہے ، جب ہم اندھیروں سے گزرتے ہیں .... یہ کوئی ایسے کردار تو نہیں جن کو دنیا جانتی ہے جن کے ناموں سے ساری دنیا کی تاریخ بنتی ہے یا جن کے بلند کردار ساری دنیا کے لیے روشنی کے مینار بنے رہتے ہیں - جن کے نام کی عظمت ، اس زمین کے لیے آسمان بنی رہتی ہے اور جن کا وجود زمین بن کر اس آسمان کی بلندیوں کا سہارا بنا رہتا ہے - یہ بلندیاں تو صرف بلند کرداری کا تصور بنی رہتی ہیں - لیکن بلند کرداری کے لیے شہرت اور ناموری ضروری نہیں ہوتی کہ بلند کرداری خود اپنی جگہ ایک عظمت ہے ، ایک بڑا پن ہے - پھر بھی اگر دنیا ایسے بلند مرتبت کرداروں کو ان کی ناموری اور شہرت کے ساتھ تاریخ ساز اور جہاں ساز شخصیتیں مانتی ہے تو یہ بھی حق و صداقت کی بات ہوتی ہے ، لیکن ان جیسی شخصیتوں کے مقابلے میں ان چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کا کیا مقام ہوتا ہے ، جن کی یہاں وہاں گھڑی بھر کے لیے نظر آجانے والی روشنی بھی ایک سچے اور عظیم جذبے کی صداقت ہوتی ہے - جو ان کے کردار کی سب سے بڑی قوت ہوتی ہے ، جس کے بل پر وہ اپنی زندگی کی نہیں بلکہ صرف اپنے اس جذبے کی عظمت اور صداقت کی حفاظت کرتے ہیں - اس کو زندہ رکھتے ہیں ، ہر قیمت پر اپنی زندگی دے کر بھی - تو پھر ان تاریخ ساز اور جہاں ساز شخصیتوں کے مقابلے میں یہ ایک چھوٹا کردار کیا ہوتا ہے ، جو اپنی زندگی جی بھی گیا اور اپنی موت مر بھی گیا - وہ تو ایک خاموش آگ کی طرح رات بھر جلتا رہا ، اپنے کسی جذبے کی صداقت کے پگھلتے موم کی طرح اور اس کی لو میں جل بھی گیا اور بجھ بھی گیا - نہ آہ کی ، نہ واہ کی ، نہ اپنا کوئی نشان چھوڑنے کی کوشش کی نہ زندہ رہنے کی -

کلثوم نے اپنی آخری ملاقات میں فرزی سے کہا تھا ....

"انسان کی شہرت و ناموری کوئی قوت نہیں ہوتی، یہ تو وہ سہارے ہیں جو نادار و ناداں، بے کس و مجبور انسانوں کے ہجوم کے کمزور شانوں سے ملتے ہیں، ورنہ سچی عظمت یا بلندی تو وہ ہوتی ہے جہاں پہونچنے والا اپنی جگہ اکیلا ہوتا ہے۔ تن تنہا۔ اور زمین کے لمس کو کھو کر، اس بلندی کا درد سہتا رہتا ہے۔ تم مجھے وہاں نظر آئے، اس بلندی پر، یکا و تنہا ...."

فرزی چلا گیا۔ کلثوم چلی گئی۔ سمی چلی گئی۔ محفلِ حیات کی صبح ہوئی تو نہ کسی پروانے کی خاک ملی نہ کسی شمع کے پگھلتے موم کا نشان۔ عظیم سے عظیم انسان کے کردار کی بنیاد بھی اس کے کسی جذبے کی ایک ناقابل تسخیر صداقت ہوتی ہے۔

اب آج جب میں اس داستان کا آخری لفظ لکھ چکا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس لفظ سے آگے میرے لیے کہاں کچھ رہ گیا ہے۔؟ کہاں کچھ ملے گا مجھے اس سے آگے۔؟ ساری زندگی کے امکان تو اس داستان کی حدود میں تھے۔ اب آگے جیسے سامنے ایک معرّا کاغذ ہے جس پر نہ کوئی کہانی لکھی جائے گی، نہ کوئی داستان، نہ کوئی قصّہ۔ جن کو بڑا آدمی بننا تھا، وہ تو بن گئے۔ اب آگے کیا ہے۔؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اب میں اپنے آپ کو اس معرّا کاغذ پر کہاں پاؤں؟ اس ساری داستان میں تو شاید میرے لیے کوئی مقام تھا ہی نہیں۔

اب تو میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اتنی بڑی، وسیع زمین کے نیچے سمی کو چھوڑ کر میں کہاں جا سکتا ہوں۔ اس زمین کے نیچے بھی زندگی ہے اور اوپر بھی۔ بچوں تو کس طرح بچوں اس زندگی سے؟۔